یروشلم

ایک شہر، تین مذاہب

(JERUSALEM: ONE CITY, THREE FAITHS)

مصنفہ: کیرن آرم سٹرانگ

ترجمہ: طاہر منصور فاروقی

فہرست

پیش لفظ

یروشلم، تیس صدیوں کی تاریخ کا امین اور تین توحید پرست مذاہب کے پیروکاروں کی عقیدتوں کا مرکز ہے۔ علمی اور تحقیقی حوالے سے ایک متمول شہر اور تاریخ میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ اردو زبان میں یروشلم کی تاریخ پر کوئی مبسوط اور وقیع کتاب موجود نہیں۔ چند ایک مصنفین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا بھی ہے تو ان کے پیش نظر شہر کی تاریخ کا اسلامی دور رہا۔ کچھ مولفین نے محض صلیبی جنگوں، اسلامی لشکروں کی شام و فلسطین کی فتوحات یا پھر واقعہ معراج النبی ﷺ کے حوالے سے بیت المقدس کا تذکرہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے اس میں شہر کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ یوں یہ قدیم شہر جس طرح ایک بھرپور اور ہمہ گیر تاریخی اور علمی کام کا تقاضا کرتا ہے وہ ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی۔ کیرن آرم سڑانگ نے یروشلم کی انفرادیت اور اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے " One City, Three Faiths " کے عنوان سے جو تحقیقی کام مرتب کیا ہے وہ بلاشبہ تاریخ کے طالب علم کے لیے ذریعہ تسکین ہے۔ اسی کتاب کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

زیر نظر کتاب یروشلم کی سیماب صفت تاریخ کا احوال ہے۔ اس میں کنعانی، یبوسی، یہودی، یونانی، رومی، بازیطنی، عرب، مملوک، عثمانی، برطانوی، فلسطینی اور اسرائیلی ادوار کی داستان بلا کم و کاست بیان کی گئی ہے۔ اس میں کانسی کے دور سے لے کر بیسویں صدی کے آخری عشرے تک کا مکمل روحانی اور طبعی منظر نامہ موجود ہے۔

کیرن آرم سڑانگ نے ایک مورخ کی نظر سے محض شہر کی تاریخ مدون نہیں کی بلکہ اس شہر کے حکمرانوں اور باشندوں کے مذاہب پر ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے بھرپور تبصرہ بھی کیا ہے۔ اگرچہ مصنفہ کی تعلیم و تربیت خالصتاً مذہبی بنیادوں پر ہوئی ہے اور انہوں نے شعور کی دہلیز پر ایک نن کی حیثیت سے قدم رکھا لیکن کتاب کی تدوین کے دوران انہوں نے کسی مرحلہ پر مذہبی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات اور ان کے اثرات کا جائزہ کیرن آرام سڑانگ نے جس گہرائی اور گیرائی سے لیا ہے وہ قابل داد ہے۔ بنیادی طور پر ایک عیسائی اور یورپی ہونے کے باوجود مصنفہ نے اسلامی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی مدح سرائی میں بخل سے کام نہیں لیا۔

کیرن یروشلم پر یہودیوں اور بالخصوص صیہونیوں کے دعویٰ ملکیت کو مسترد کرتی ہیں۔ ان کا کہنا

ہے کہ اگر مسلمان یروشلم کے لیے اجنبی اور حملہ آور ہیں تو یہودی بھی اسی طرح اجنبی اور حملہ آور ہیں۔ وہ آثار قدیمہ کے تحقیقی نتائج اور بائبل کے مندرجات کو بنیاد بنا کر یہودیوں کے دعویٰ کا بطلان کرتی ہیں کہ وہ اس کے بانی وموسس ہیں۔ کیرن کا کہنا ہے کہ یروشلم کی تقدیس تقاضا کرتی ہے کہ اس کے مکینوں کے ساتھ حضرت داؤدؑ اور حضرت عمرؓ کا مثالی اور ارفع طرز عمل اختیار کیا جائے۔

قدیم کرداروں اور مقامات کے نام اردو قالب میں ڈھالتے ہوئے ''بائبل'' کے اردو ایڈیشن مطبوعہ پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور (1968ء) سے مدد لی گئی ہے۔ دوسری زبانوں میں لکھے گئے قدیم کرداروں اور مقامات کے ناموں کو اردو میں لکھتے ہوئے ہمارے مختلف مصنفین اور مترجمین نے اپنے اپنے فہم سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک ہی نام مختلف کتابوں میں مختلف شکلیں رکھتا ہے۔ کسی بھی زبان میں لکھے ہوئے نام کو دوسری زبان میں لکھتے ہوئے تغیر وتبدل کا امکان موجود رہتا ہے۔ بائبل کے اردو ایڈیشن کو اس لیے معتبر اور مستند قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ محض تحریر نہیں۔ اس کے مندرجات صدیوں سے تلاوت ہوتے آ رہے ہیں چنانچہ درست ترین تلفظ کے مطابق بولے اور لکھے جا رہے ہیں۔

طاہر منصور فاروقی

2/43، شاہدرہ ٹاؤن، لاہور

فون: 7914506

مصنفہ کا تعارف

کیرن آرام سٹرانگ نے رومن کیتھولک نن کی حیثیت سے سات سال تک خدمات سرانجام دیں۔ 1968ء میں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے لٹریچر میں گریجوایشن کی۔ لنڈن یونیورسٹی میں ماڈرن لٹریچر کی لیکچرر رہیں۔ پھر ایک پبلک گرلز سکول کے انگلش ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ ہو گئیں۔ 1982ء میں وہ فری لانسر رائٹر اور براڈ کاسٹر بن گئیں۔ ایک طویل عرصہ تک انہوں نے برطانیہ اور پھر امریکہ میں مذہبی امور

کے مبصر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران انہوں نے 1983ء میں مشرق وسطیٰ میں جا کر سینٹ پال کی زندگی اور مذہبی خدمات کے موضوع پر ٹیلی وژن کے لیے دستاویزی فلم بنائی۔ ٹیلی وژن کے لیے ان کے دیگر معروف پروگرام درج ذیل ہیں۔

Varieties of Religious Experience (1984)

Tongues of Fire (1985)

1996ء میں موصوفہ نے بل موئیرز کی ٹیلی وژن سیریز GENESIS میں شرکت کی۔ آج کل وہ لیو بائیک کالج فارسٹڈی آف جیوڈ ازم اینڈ دی ٹریننگ آف ربیز انڈ ٹیچرز'' میں پڑھاتی ہیں۔ وہ مسلم سوشل سائینسز، ایسوسی ایشن کی اعزازی رکن ہیں۔ ان کی درج ذیل تصنیفات اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔

1. TheGospel According to Woman (1987)
2. Through the Narrow Gate (1981)
3. Holy War: The Crusades & Their impact On Todays World. (1991)
4. The english Mystics Of fourteenth Century. (1992)
5. Muhammad: A Biography Of The Prophet. (1992)
6. A History Of God: The 4000- Year Quest of Judaism. Chiristianity & Islam. (1993)
7. Jerusalem : One City three Faiths. (1996)

ابتدائیہ

یروشلم میں دوسرے کسی بھی شہر کے برعکس مجھے تاریخ زمانہ حال کی ایک نمایاں جہت محسوس ہوئی ہے۔شاید ہر متنازعہ علاقے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔لیکن 1983ء میں جب میں یروشلم میں پہلی بار علمی کام کرنے گئی تو اس حقیقت نے مجھے شدت سے متاثر کیا۔ پہلے تو میں شہر کو دیکھ کر اپنے ردِعمل کی شدت پر حیران ہوئی۔ایک ایسی جگہ میں گھومنا پھرنا حیرت انگیز تھا جو بچپن ہی سے میری زندگی کی ایک تصوراتی حقیقت تھی۔ میں نے بادشاہ داؤد اور یسوع مسیح، کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ جب میں نوجوان نن تھی تو مجھے سکھایا گیا کہ صبح کے مراقبہ کا آغاز بائبل کے مناظر کو ذہن میں رکھ کر کیا کروں۔ میرے ذہن میں گتسمنے باغ، کوہ زیتون اور دایا ڈولوروزا کے مناظر اپنے انداز سے سحر کار تھے۔اب جبکہ میں انہی مقامات سے روزانہ گزرنے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ یروشلم کا حقیقی شہر نظر آنے والے شہر سے زیادہ شوریدہ سر اور الجھا ہوا ہے۔مثلاً مجھے یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ یروشلم صرف عیسائیوں کے لیے ہی نہیں، یہودیوں اور مسلمانوں کے لیے بھی مقدس اور اہم ہے۔ جب میں نے خفتانوں میں ملبوس یہودیوں اور اکھڑ اسرائیلی سپاہیوں کو پوری عقیدت کے ساتھ مغربی دیوار کے پتھر چومتے ہوئے دیکھا یا پھر مسلمان خاندانوں کے ہجوم اپنے اجلے ملبوسات میں حرم الشریف کو جمعہ کی نماز کے لیے شہر کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے دیکھے تو مجھے پہلی بار مذہبی تکثیریت کے چیلنج کا اندازہ ہوا۔ یہ لوگ ایک ہی نشان کو بالکل مختلف انداز میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اپنے شہر مقدس کے ساتھ ان لوگوں کی وابستگی کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔لیکن یہ سب ''میرے یروشلم'' سے بالکل غائب تھے۔ ذہن میں موجود بائبل کے مناظر کے قدیم عکس بیسویں صدی کے یروشلم کو براہ راست دیکھتے ہوئے نیا ارتباط مہیا کر رہے تھے۔میری زندگی کے انتہائی یادگار واقعات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یروشلم میری اپنی شناخت کا حصہ بن چکا تھا۔

ایک برطانوی شہری ہونے کے باوجود شہر پر میرا کوئی سیاسی دعویٰ نہیں تھا حالانکہ یروشلم میں میرے نئے ساتھی اور دوست کچھ اسی طرح کے حوالے اور نسبتیں رکھتے تھے۔اس حوالے سے اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے مجھے اپنے اپنے دلائل پیش کئے تو میں ماضی کے واقعات کے گہرے اتصال پر حیران رہ گئی اسرائیل کے قیام یا 1967ء کی چھ روزہ جنگ تک کے واقعات کی تفصیلات مجھے بتائی گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ واقعات بیان کرتے ہوئے اصل زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ پہلے کس نے کیا کیا؟ تشدد پر

پہلے کون اترا؟ صیہونی یا عرب؟ کس نے پہلے فلسطین کی صلاحیتوں کو سمجھا اور ملک کو ترقی دی؟ یروشلم میں پہلے کون رہتا تھا۔ یہودی یا عرب؟ موجودہ پریشان کن صورتحال پر بحث کرتے ہوئے اسرائیلی اور فلسطینی، دونوں ہی جبلی طور پر ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں۔ان کا مناظرہ کانسی کے دور سے شروع ہو کر قرونِ وسطیٰ سے ہوتا ہوا بیسویں صدی میں پہنچتا ہے۔ اور پھر جب اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے انتہائی تفاخر کے ساتھ مجھے ''اپنا گھر'' دکھایا تو وہی تاریخی عمارتیں اور آثارِ قدیمہ جو دونوں کے لیے اہم اور مقدس تھے، متنازعہ بن کر سامنے آئے۔

یروشلم میں پہلی صبح کو میرے اسرائیلی ساتھیوں نے بتایا کہ کس طرح بادشاہ ہیرودیس کے دور میں استعمال کئے گئے پتھروں کو شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ان پتھروں کے کنارے نمایاں طور پر تیز دھار ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ پتھر یروشلم سے یہودیوں کی اس وابستگی کی یاد دلاتے رہتے ہیں جس کا تعلق پہلی صدی قبل مسیح سے ہے، جب اسلام ابھی منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا۔جب ہم پرانے شہر میں سے گزرے تو مجھے بتایا گیا کہ عثمانیوں نے اپنے دورِ اقتدار میں یروشلم کو بری طرح نظر انداز کیا۔انیسویں صدی میں یہ دوبارہ بھرپور زندگی سے اس وقت ہمکنار ہوا جب یہودیوں نے یہاں سرمایہ کاری کی۔اس کے ثبوت میں مجھے سر موز زمونٹے فیورے کی پون چکی اور روتھس چائلڈ خاندان کے سرمایہ سے بنائے گئے ہسپتال دکھائے گئے۔اسرائیلی دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح یروشلم ان کے دور میں فروغ پا رہا ہے، ماضی میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔

میرے فلسطینی دوستوں نے مجھے ایک مختلف یروشلم دکھایا۔انہوں نے مجھے حرم الشریف کی شان وشوکت کے بارے میں بتایا۔اس کے اردگرد مملوکوں کے بنائے ہوئے نفیس اور خوشنما مدرسوں کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ان کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ یروشلم سے مسلمانوں کی عقیدت و وابستگی میں تعمیر ہوا تھا۔وہ مجھے ریجو کے قریب بنی موسیٰ کی یادگار پر لے گئے جسے یروشلم کو عیسائیوں نے تحفظ دینے کے لیئے تعمیر کیا گیا تھا۔ پھر مجھے امویوں کے محلات دکھائے گئے۔جب ہم بیت لحم میں سے گزر رہے تھے تو میرے فلسطینی میزبان نے راکیل کے مقبرہ کے پاس کار روک دی اور پرجوش انداز میں بتایا کہ مسلمانوں نے اس یہودی یادگار کی صدیوں تک نگہداشت کی۔لیکن اس کارِ خیر کا صلہ انہیں انتہائی بھونڈے انداز میں دیا گیا۔

ایک لفظ بار بار دہرایا گیا۔کٹر سیکولر اور اسرائیلیوں اور فلسطینیوں نے بھی اصرار کے ساتھ کہا کہ یروشلم ان کے لیے ''مقدس'' ہے۔فلسطینی تو اس شہر کو کہتے ہی ''القدس'' ہیں۔اسرائیلی یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔ان کا کہنا ہے کہ یروشلم سب سے پہلے یہودیوں کے لیے مقدس شہر ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے کبھی

بھی مکہ اور مدینہ کی طرح اہم نہیں رہا لیکن اس سیاق وسباق میں لفظ ''مقدس'' کے کیا معنی ہیں؟ آخر کس طرح محض ایک شہر، خطا کار انسانوں سے لبریز، اور انتہائی ناپاک سرگرمیوں سے آلودہ شہر۔۔۔مقدس قرار دیا جا رہا ہے؟ آخر کیوں عسکری وہریت کا اعتراف کرنے والے یہودی، مقدس شہر سے پیار کرتے ہیں اور مغربی دیوار کے لیے جذباتی ہو جاتے ہیں؟ آخر کیوں ایک ملحد عرب جب پہلی دفعہ مسجد اقصیٰ کو دیکھتا ہے تو اشکبار ہو جاتا ہے؟ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آخر عیسائیوں کے لیے یہ شہر کیوں مقدس ہے؟ اس شہر نے ''مسیح'' کی موت اور پھر زندہ ہو جانے کے مناظر دیکھے ہیں۔ اس نے عیسائی مذہب کو جنم لیتے ہوئے دیکھا ہے لیکن یہودیت اور اسلام کو تشکیل دینے والے واقعات تو یروشلم سے سینکڑوں میل دور رونما ہوئے تھے۔ ایک نے صحرائے سینا میں جنم لیا اور دوسرے نے ارض حجاز میں۔ اسی طرح سوال یہ ہے کہ یہودیوں کے لیے کوہ صیہون کی بجائے کوہ سینا کیوں ایک مقدس مقام نہیں جہاں خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بخشی اور اسرائیل کے ساتھ عہد کیا۔ ظاہر ہے میں غلط طور پر یہ سمجھ رہی تھی کہ کسی شہر کا تقدس نجات کی تاریخ کے واقعات سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور نجات سے مراد انسانوں کے معاملات میں خدا کی مداخلت کا اساطیری تصور ہے۔ چنانچہ میری جستجو یہ تھی کہ دیکھوں آخر ایک مقدس شہر کیا ہوتا ہے؟ یہی جستجو اس کتاب کی تصنیف کا سبب بنی۔

لفظ ''مقدس'' یروشلم کے لیے آزادی سے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے معنی بذات خود واضح ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہایت پیچیدہ ہیں۔ تینوں توحید پرست مذاہب نے شہر کے لیے اپنی اپنی روایات وضع کر رکھی ہیں جو نمایاں طور پر ایک جیسی ہیں۔ کسی مقدس مقام یا کسی مقدس شہر سے عقیدت ایک آفاقی اور عالمگیر جذبہ وکیفیت ہے۔ مذاہب عالم کے مورخین کہتے ہیں کہ تمام تہذیبوں میں سب سے پہلے جنم لینے والی عقیدت یہی ہے۔ ہر مذہب کے پیروکاروں نے اپنا اپنا مقدس جغرافیہ تشکیل دے رکھا ہے۔ اس کا تعلق دنیا کے سائنسی نقشہ سے نہیں، یہ انسانوں کی داخلی زندگی کی حدود متعین کرتا ہے۔ ارضی شہر، درختوں کے جھنڈ اور پہاڑ ان کی روحانیت کی علامتیں اور نشان بن جاتے ہیں۔ یہ روحانیت ہر جگہ موجود ہوتی ہے اور ایک گہری انسانی ضرورت پوری کرتی ہے چاہے، خدا یا مافوق الفطرت قوت کے بارے میں ہمارا عقیدہ کچھ بھی ہو۔ یروشلم مختلف اسباب کی بنا پر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقدس جغرافیہ کا ایک مرکز ہے۔ اس بات نے ان کے لیے شہر کو معروضی انداز میں دیکھنا مشکل بنا دیا ہے۔ یہ ان کے اپنی ذات اور اس حتمی حقیقت کے تصورات سے پیوست ہو چکا ہے جو خدا کہلاتی ہے اور ہماری دنیاوی زندگی کو معنی اور قدر و قیمت دیتی ہے۔

اس کتاب میں آپ کو تین تصورات ملیں گے جو آپس میں مربوط ہیں۔ پہلا خدا یا مقدس کا تصور

ہے۔مغربی دنیا میں ہم خدا کو ایک تشبیہی اور تجسیمی انداز میں دیکھنے کے عادی ہیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں الوہیت کا تمام تر تصور بے ربط اور نا قابل یقین رہتا ہے۔ چونکہ ''خدا'' کا لفظ بہت سے لوگوں کے لیے غیر معتبر ہو چکا ہے، کیونکہ نا قابل قبول اور مبہم باتیں ''اس کے نام'' پر کی اور تھونپی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کا متبادل اور آسان طریقہ یہ ہے کہ خدا کی بجائے ''مقدس'' (بروزن ۔۔۔اقدس) کی اصطلاح استعمال کی جائے۔ جب لوگ کائنات پر غور کرتے ہیں تو انہیں اس میں ایک بالاتر اور پراسرار قوت کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ اس کا گہرا تعلق اپنی ذات اور دنیا کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اور پھر ان کا یہ احساس اس سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔اس کا اظہار مختلف ناموں سے کیا گیا۔مثلاً خدا، برہما اور نروان وغیرہ لیکن یہ بالاتر اور ماورائے ادراک قوت انسانی زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت رہی ہے۔ ہمارے مذہبی عقائد کچھ بھی ہوں۔مختلف مواقع پر ہمارا تجربہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ جب ہم کوئی مسحور کن موسیقی سنتے ہیں یا خوبصورت نظم پڑھتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اندر سے کسی نے چھولیا ہے اور پھر ہم چند لمحوں کے لیے اپنی ذات سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ ہم اس کیفیت کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔اگر ہمیں یہ کسی نشست میں، کسی چرچ یا صومعہ میں نہ ملے تو پھر کہیں اور ڈھونڈتے ہیں۔انسانوں نے مقدس کو مختلف انداز میں پایا اور محسوس کیا ہے۔ یہ خوف، دہشت، جلال، استعجاب، افراط، امن، تسکین اور آسودگی کی کیفیات بھی پیدا کرتا ہے اور اخلاقی سرگرمیوں پر بھی مجبور کرتا ہے۔ یہ ایک بھرپور اور فزوں تر موجودگی پیش کرتا ہے جس سے ہماری تکمیل ہوتی ہے۔ یہ محض خارج میں ہمیں ایک قوت محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہماری ذات کی گہرائیوں میں پائی جاتی ہے۔لیکن کسی بھی جمالیاتی تجربے کی طرح خدا کے احساس کو بھی مرتب کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے جدید سیکولر معاشرے میں اسے کبھی بھی ترجیح نہیں دی گئی چنانچہ یہ غیر مستعمل صلاحیت کی طرح بے کار ہو چکا ہے۔اس کے برعکس مقدس کو عقل یا حواس سے سمجھنے کی صلاحیت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بہر طور حقیقت یہ ہے کہ خدا کے تصور کے بغیر بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی بے معنی ہے۔

اس کا جزوی سبب یہ ہے کہ انسانوں نے دنیا کو ہمیشہ رنج و محن کا مقام محسوس کیا ہے۔ہم قدرتی آفات کے شکار رہتے ہیں فنا اور ہلاکت سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ظلم اور نا انصافی کمزور انسانوں کو چاٹ جاتی ہے۔ مذہبی جدوجہد عام طور پر اس شعور کے ساتھ شروع ہوتی ہے کہ ''کچھ غلط ہو رہا ہے۔۔۔'' جیسے بدھا نے کہا تھا: ''کائنات میں کجی آ گئی ہے۔۔۔'' انسانی جسم پہ آنے والے طبعی اور موروثی انحطاط کے علاوہ ہم ذاتی غم واندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، جو بظاہر غیر اہم رکاوٹ ہوتے ہیں لیکن ہمیں بری طرح منتشر کر دیتے ہیں۔ پھر ہمیں بے چارگی اور کسمپرسی کے احساس سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس میں موت کا صدمہ،

طلاق، ترک مراسم اور کسی محبوب ترین چیز کا نقصان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کسمپرسی ہمیں اپنی ذات میں بے وجہ اداسی اور ملال کے نتیجہ میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ داخلی بیماری احساس جدائی کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ ہمیں اپنا وجود نامکمل اور ادھورا لگتا ہے۔ ادھورے پن کا احساس ہمیں کہتا ہے کہ زندگی اس لیے نہیں بنائی گئی جس طرح گزر رہی ہے۔ ہم کسی ایسی چیز سے محروم ہیں جو ہماری آسودگی کے لیے ضروری ہے لیکن ہم یہ سب کچھ شعوری سطح پر بیان نہیں کر سکتے۔ احساس جدائی کئی طرح سے ابھرتا ہے۔ یہ ذوالنفسی کے فلاطونی تصور میں بھی موجود ہے جس سے ہم پیدائش کے وقت جدا کر لیے گئے۔ یہ گم گشتہ جنت کے عالمی اسطورہ میں بھی موجود ہے۔ گزشتہ صدیوں میں مرد اور عورتیں اسی دکھ پہ غالب آنے کے لیے مذہب کی طرف راغب ہوئے تھے کیونکہ انہیں خدا سے لو لگانے میں تسکین ملی تھی۔ آج مغرب میں لوگ بعض اوقات تحلیل نفسی کا سہارا لیتے ہیں۔ اس میں ابتدائی جدائی کا یہی احساس انتہائی سائنسی انداز میں کارفرما ہے، جو رحم مادر اور پیدائش کی اذیت سے وابستہ یادوں سے مربوط ہے ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ جدائی کا تصور اور کسی نہ کسی انداز میں ملاپ کی تمنا کسی مقدس مقام سے عقیدت میں بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔

دوسرا تصور جسے ضرور زیر بحث لانا چاہیے وہ دیومالا یا اساطیر کا سوال ہے۔ جب لوگوں نے مقدس کے بارے میں بات کرنا چاہی یا انسانی دکھوں کا ذکر کرنا چاہا تو وہ اسے منطقی انداز میں بیان نہ کر سکے۔ چنانچہ انہیں دیومالا کا سہارا لینا پڑا۔ یہاں تک کہ فرائڈ اور یونگ کو بھی داخلی واقعات بیان کرنے کے لیے قدیم دنیا کی دیومالا یا مذہب کی اساطیر کی مدد لینا پڑی اور پھر انہوں نے اپنی اساطیر وضع کر لیں۔ آج لفظ متھ، دیومالا یا اسطورہ کو ہمارے کلچر میں بے وقعت کر دیا گیا ہے۔ اسے ایسی بات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو حقیقی نہ ہو۔ واقعات کو اس لیے جھٹلا دیا گیا کہ یہ محض ''اساطیر'' ہیں۔ یروشلم کی بحث میں یہ بات بالکل درست ہے۔ فلسطینی دعویٰ کرتے ہیں کہ آثار قدیمہ نے ایسا کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا جو تصدیق کر سکے کہ یہودی ریاست کی بنیاد بادشاہ داؤد نے رکھی تھی۔ اسی طرح معبد سلیمانی کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اسرائیل کی سلطنت کا ذکر کسی ہم عصر تحریر میں نہیں۔ اس کا ذکر صرف بائبل میں ملتا ہے۔ چنانچہ گمان غالب ہے کہ یہ محض ایک اسطورہ یا فرضی داستان ہے۔ اسی طرح اسرائیلی لوگ، پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا یروشلم سے آسمانوں کو معراج مسترد کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی اسطرہ ہے جو القدس کے لیے مسلمانوں کی عقیدت کی بنیاد ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بحث ہمیں اپنے موضوع سے بھٹکا دے گی۔ اساطیر کا مقصد کبھی بھی تاریخی طور پر مصدقہ واقعات کو بیان کرنا نہیں تھا۔ یہ تو محض داخلی اہمیت کو بیان کرنے کی ایک کوشش تھی یا پھر ایسے

حقائق کی طرف توجہ دلانا مقصود تھی جو منطقی انداز میں زیر بحث نہ لائے جاسکتے ہوں۔ دیومالا کو آپ نفسیات کی قدیم شکل کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ذات کی داخلی گہرائیوں کو بیان کرتی ہے جو ابھی تک ہمارے لیے پراسرار اور مسحور کن ہیں۔ چنانچہ مقدس جغرافیہ کی اساطیر داخلی زندگی کی سچائیوں کو بیان کرتی ہیں۔ یہ انسانی دکھوں اور خواہشوں کے مخفی ذرائع کو چھوتی اور انتہائی طاقتور جذبات کو بے لگام کرسکتی ہیں۔ یروشلم کے بارے میں داستانوں کو اس لیے نہیں جھٹلانا چاہیے کہ یہ محض اساطیر ہیں۔ یہ اسی لیے اہم ہیں کہ یہ اساطیر ہیں۔

یروشلم کا موضوع دھماکہ خیز ہے کیونکہ یہ شہر اساطیری درجہ حاصل کر چکا ہے۔ موجودہ تنازعہ کے دونوں فریق اور بین الاقوامی برادری بار بار کہہ چکے ہیں کہ جذباتی قصوں کو ایک طرف رکھ کر حقوق اور اقتدار اعلیٰ کے بارے میں فہمیدہ بحث ہونی چاہیے۔ اگر ایسا ہو سکے تو اس سے عمدہ کوئی اور بات کیا ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اساطیر کی ضرورت سے بے نیاز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں نے ماضی میں بھی کوشش کی ہے کہ اساطیر کو مذہب سے خارج کر دیں۔ مثلاً قدیم اسرائیل کے انبیاء اور مصلحین اپنے مذہب کو مقامی کنعانیوں کی اساطیر سے الگ کرنے پر زور دیتے تھے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ قدیم داستانیں اور کردار ''قبالاہ'' کے تصوف میں پوری طاقت سے پھر نمودار ہوگئے۔ یہ مذہب کی انتہائی معقول اور معتدل شکلوں پر اساطیر کی فتح تھی۔ یروشلم کی تاریخ میں ہم دیکھیں گے کہ جب بھی لوگوں کی زندگیاں مصائب و آلام سے دوچار ہوئی۔ انہوں نے جبلی انداز میں تسکین کے لیے اساطیر سے رجوع کیا۔ بعض اوقات خارجی واقعات کسی قوم کی داخلی حقیقت کے اظہار کے لیے اتنے موزوں تھے کہ انہیں فوراً اساطیری درجہ مل گیا اور پھر انہوں نے زبردست قسم کا اساطیری جوش و جذبہ پیدا کیا۔ اس طرح کے دو واقعات بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ایک چوتھی صدی عیسوی میں مزار مسیح کی دریافت اور دوسرا 1967ء میں یروشلم پہ اسرائیل کا تسلط۔ دونوں واقعات میں متعلقہ قوموں نے سوچا کہ وہ اس طرز فکر کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن واقعات کا رویہ کچھ زیادہ ہی طاقتور ثابت ہوا۔ جو عذاب یہودیوں اور فلسطینیوں پر خود ہماری صدی کے دوران نازل ہوئے ان کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ اساطیر ایک بار پھر آگے آگئیں۔ چنانچہ غلط یا درست طور پر یروشلم کی اساطیر کو ضروری ترجیح دینا پڑے گی۔ صرف اسی طرح ان لوگوں کی خواہشات اور رویہ پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے جو اس انداز کی روحانیت سے متاثر ہوئے ہیں۔

تیسری اصطلاح جسے یروشلم کی تاریخ میں جھانکنے سے پہلے زیر بحث لایا جانا ضروری ہے، وہ علامت پسندی ہے۔ سائنسی رجحان کے ساتھ ہمارا آج کا معاشرہ نشانات، علامات اور تشبیہات کی اصطلاحوں سے رغبت نہیں رکھتا۔ ہم نے ایک منطقی اور استدلالی انداز فکر کو فروغ دے لیا ہے۔ ٹھوس واقعات

کو تصورات کی آنکھ سے دیکھنے کی بجائے ہم اس کی تمام جذبات وابستگیوں کو بے نقاب کر کے واقعات (یا اشیاء) پر براہ راست غور کرتے ہیں۔ اس انداز فکر نے مغرب میں بہت سے لوگوں کے مذہبی تجربے کو تبدیل کر دیا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ تبدیلی سولہویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ اب ہمارا میلان یہ ہے کہ ''۔۔فلاں چیز تو محض ایک علامت ہے اور بنیادی طور پر اس پراسرار حقیقت سے بہت مختلف ہے جو بظاہر یہ پیش کرتی ہے۔'' لیکن قدیم دنیا میں چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز بہر حال یہ نہیں تھا۔ ایک علامت یا نشان کو اس حقیقت میں شامل سمجھا جاتا تھا جس کی طرف یہ اشارہ کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مذہبی نشان میں عبادت گزاروں کو الوہی اقلیم سے مربوط کرنے کی طاقت موجود تھی۔ پوری تاریخ میں خدا یا مقدس سے براہ راست رابطے کا تجربہ شاید چند ایک غیر معمولی انسانوں کے علاوہ کسی کو نہیں ہوا۔ یہ ہمیشہ بالواسطہ انداز میں محسوس کیا گیا۔ چنانچہ الوہیت ان مردوں اور عورتوں میں دیکھنے میں آئی جو خدا کا اوتار یا جسمانی روپ تھے۔ یہ مقدس صحائف، شریعت یا عقیدے میں بھی پائی گئی۔ الوہیت کے قدیم ترین اور اولین نشانات یا علامات، مقام یا شہر تھے۔ لوگوں نے الوہیت کو پہاڑوں، کنجوں، شہروں اور معبدوں میں محسوس کیا۔ جب وہ ان مقامات پہ جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ ایک مختلف جہت میں داخل ہو گئے ہیں جو ان کی اپنی دنیا سے جدا مگر طمانیت بخش ہے۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے یروشلم ایک ایسی ہی جگہ ہے۔

یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو از خود رونما ہو جائے۔ جب کوئی جگہ ایک بار کسی بھی طرح مقدس محسوس ہو جائے اور لوگوں کو خدا سے مربوط کرنے کی صلاحیت کا اظہار کر دے تو پھر متعدد لوگ دوسروں کو اس کی رفعت کے قائل کرنے میں اپنی پوری تخلیقی توانائیاں صرف کر دیتے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ معبدوں، گرجوں اور مسجدوں کا طرز تعمیر علامتی انداز کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا نقشہ اس داخلی سفر کو مرتب کرتا ہے جو ایک زائر کو خدا تک پہنچنے کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ عبادت (کا طریقہ) اور مذہبی رسوم بھی مقدس مقام کے احساس کو شدید کرتی ہیں۔ پروٹسٹنٹ مغرب میں لوگ مذہبی رسومات کے لیے ایک موروثی بدگمانی رکھتے ہیں۔ وہ انہیں ممبو جمبو (افریقہ کی مضحکہ خیز مذہبی رسوم) ہی سمجھتے ہیں لیکن عبادت کے طریقہ کو تھیٹر کی ایک شکل کے طور پر دیکھنا غالباً زیادہ مناسب ہے۔ جو مکمل سیکولر سیاق وسباق میں ماورائیت کا ایک طاقتور تجربہ مہیا کرتی ہے۔ مغرب میں ڈرامہ مذہب ہی سے پھوٹا۔ قدیم یونان کے مقدس تہوار اور قرون وسطیٰ کے یورپ میں ایسٹر کی تقریبات ڈرامے کی بنیادیں ہیں۔ اساطیر بھی یروشلم اور اس کے متعدد متبرک مقامات کے داخلی معنی بیان کرنے کے لیے وضع کی گئیں۔

ان اساطیر میں سے ایک کو امریکی سکالر مرسیا ایلیڈے ''دائمی واپسی کی داستان'' کہتی ہے۔ اس

کا کہنا ہے کہ یہ مفروضہ سبھی مذاہب اور تہذیبوں میں پایا جاتا ہے۔اس عقیدے کے مطابق وہ تمام چیزیں جن سے ہمیں اس دنیا میں واسطہ پڑتا ہے۔ان کا ایک حصہ عالم بالا میں پایا جاتا ہے۔ان سب کی تکمیل ہماری دائمی واپسی پر ہوگی۔اس اسطورہ میں یہ تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہاں زمین پہ ہماری زندگی نامکمل ہے اور عالم بالا میں پائی جانے والی ایک بھرپور اور اطمینان بخش زندگی سے جدا کر لی گئی ہے۔ تمام انسانی سرگرمیاں اور مہارتیں بھی الوہی نقل ہیں۔خدا کے افعال کی نقل کر کے لوگ آسمانی زندگی کے حصہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔خدا کی نقل آج بھی کی جارہی ہے۔لوگ آج بھی سبت کے دن آرام کرتے ہیں۔ چرچ میں بیٹھ کر روٹی کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔یہ کام بظاہران کے لیے بے معنی ہیں لیکن وہ اس لیے کئے جارہے ہیں کہ ان کے عقائد کے مطابق خدا نے ایک بار ایسا کیا تھا۔کسی مقدس مقام پر مذہبی رسوم سرانجام دینا بھی دیوتاؤں کی نقل کرنے کا ایک علامتی انداز اور ان کی بھرپور اور طاقتور طرز زندگی میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔یہی اسطورہ مقدس شہر کے لیے عقیدت میں پائی جاتی ہے۔مقدس شہر کو جنت میں دیوتاؤں کے گھر کی نقل سمجھا جاتا ہے۔معبد ایک مخصوص دیوی کے آسمانی محل کی نقل ہے۔آسمانی طرز تعمیر کی ممکنہ حد تک بھرپور نقل میں بنے ہوئے معبد کو خدا زمین پر اپنا مسکن بنالیتا ہے۔

عقلیت پسند جدیدیت کی روشنی میں اس طرح کی اساطیر مضحکہ خیز دکھائی دیتی ہیں۔لیکن قدیم دور میں ان عقائد کو پہلے پرکھ کر پھر مخصوص مقدس مقام سے وابستہ نہیں کیا جاتا تھا۔یہ تو محض ایک تجربے اور ایک احساس کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہوتے تھے۔مذہب میں ہمیشہ احساس دینی توضیح سے پہلے وارد ہوتا ہے۔لوگوں کو پہلے محسوس ہوا کہ وہ کسی کنج یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر خدا کے قرب سے ہمکنار ہوئے ہیں۔پھر انہوں نے اس جگہ کو مقدس قرار دیا۔بعض اوقات انہیں اس قرب سے سرشار ہونے میں مدد دینے کے لیے فن تعمیر،موسیقی اور عبادت کا خوبصورت امتزاج مہیا کیا گیا۔یہ چیزیں انہیں اپنے وجود سے دور لے جاتیں۔ پھرانہوں نے اس تجربہ کو بیان کرنے کے لیے اساطیر کی شاعرانہ زبان کا سہارا لیا یا مقدس جغرافیہ کے نشانات کی مدد سے یہ کیفیت تلاش کی۔یروشلم ان مقامات میں سے ایک بن گیا جس نے یہودیوں،عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے ''مطلوبہ کام'' کیا کیونکہ یہ انہیں خدا سے ملوانے کا ایک ذریعہ محسوس ہوتا ہے۔

ایک اور تبصرہ بھی ضروری ہے۔مذہب کی رسوم وآداب سے گہری نسبت رکھتی ہیں۔مذہب اور آرٹ دونوں ہی اس ناقص اور المناک دنیا کا ایک حتمی شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔لیکن مذہب،آرٹ سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں ایک اخلاقی جہت پائی جاتی ہے۔مذہب کو شائد ایک اخلاقی حسن کہا جا سکتا ہے۔محض الوہیت یا ماورائیت کا تجربہ ہی کافی نہیں۔اس تجربے کو دوسروں کے لیے ہمارے رویہ میں موجود

ہونا چاہیے۔تمام بڑے مذاہب اصرار کرتے ہیں کہ سچی روحانیت کی آزمائش عملی انسانی ہمدردی ہے۔مہاتما بدھ نے نروان حاصل ہونے کے بعد کہا تھا۔۔۔انسان کو پہاڑوں کی چوٹیاں چھوڑ کر واپس بستیوں اور بازاروں میں آنا چاہیے اور وہاں رہ کر تمام مخلوق کے لیے رحم و مروت پر عمل کرنا چاہیے۔یہی فلسفہ کسی مقدس مقام کے لیے عقیدت میں ہونا چاہیے۔یروشلم سے عقیدت میں ابتدا ہی سے انسانی ہمدردی اور سماجی انصاف کو لازم قرار دے دیا گیا تھا یہ شہر اس وقت تک مقدس و متبرک نہیں ہوسکتا جب تک یہ اپنے کمزور اور غیر محفوظ باشندوں کے لیے انصاف اور رحم و مروت سے متصف نہیں ہو جاتا۔المیہ یہی ہے کہ اس اخلاقی فریضہ کو اکثر و بیشتر نظر انداز کیا گیا ہے۔ کچھ سنگین بداعمالیاں اس وقت رونما ہوئی ہیں جب لوگوں نے شہر کی تقدیس اور تسلط کی خواہش کو انصاف اور انسانی ہمدردی پر ترجیح دی۔

زیر سطح موجود ان تمام لہروں نے یروشلم کی طویل اور ہنگامہ خیز تاریخ میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے۔یہ کتاب یروشلم کے مستقبل کے لیے کوئی ضابطہ متعین کرنے کی غرض سے نہیں لکھی گئی۔یہ محض قیاس و گمان ہوگا۔البتہ اس کتاب کے ذریعے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب یہودی،عیسائی اور مسلمان کہتے ہیں کہ یہ شہر ان کے لیے مقدس ہے تو اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے۔ان تینوں مذاہب کی روایات میں موجود یروشلم کی تقدیس کی کچھ پیچیدگیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ پہلو اسی قدر اہم ہے جس قدر یہ طے کرنا کہ اس شہر میں پہلے کون تھا اور کس کو اس کا حق ملکیت ملنا چاہیے۔لیکن یہ طے کرنا بہت کٹھن ہے کیونکہ۔۔۔یروشلم کی ابتدا گہری تاریکیوں میں مخفی ہے۔

کیرن آرم سٹرانگ

MAP (نقشہ)

پہلا باب

صیہون

یروشلم شہر نے جن وادیوں اور پہاڑیوں میں جنم لیا وہاں سب سے پہلے آباد ہونے والے لوگوں

کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں۔ پرانے شہر کی موجودہ دیواروں کے جنوب میں اوفیل کی پہاڑیاں ہیں۔ کہاں قبروں سے برآمد ہونے والے مٹی کے برتنوں کا تعلق 3200 سال قبل مسیح سے ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں کنعان کے دوسرے علاقوں میں بستیاں شہروں کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ ان میں مجدو، یریحو، عی، لیکس اور بیت شان اپنے دور کے ممتاز شہر بنے۔ اب یہ تمام علاقے جدید اسرائیل میں شامل ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ نے ان مقامات میں معبد، رہائشی عمارتیں، گلیاں، کارخانے اور پانی کی نالیاں دریافت کی ہیں۔ لیکن ابھی تک اس بات کا کوئی حتمی ثبوت دستیاب نہیں کہ یروشلم میں شہری زندگی کی ابتدا اسی دور میں ہوئی تھی۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے عقیدت کا یہ مرکز قدیم کنعان کی مرکزی شاہراہ سے بہت دور تھا۔ دشوار گزار پہاڑی علاقے اور ملک کے مرکز سے کافی دور ہونے کی وجہ سے یہ ایک عرصہ تک بقیہ کنعان سے الگ تھلگ رہا۔ کانسی کے دور کی ترقی ساحلی علاقوں تک محدود تھی جن میں یزریل کی زرخیز وادی شامل تھی۔ یہاں مصریوں نے اپنے تجارتی مراکز قائم کر رکھے تھے۔ کنعان قدرتی وسائل سے مالا مال ایک متمول ملک تھا۔ اس کے باشندے شراب، روغن، شہد اور غلہ پڑوسی ممالک کو برآمد کیا کرتے تھے۔ اس کی جغرافیائی اہمیت بھی بہت زیادہ تھی۔ یہ ایشیا اور افریقہ کا مقام اتصال اور مصر، شام، فونیقیا اور میسوپوٹیمیا کی تہذیبوں کا سنگم تھا۔ اگرچہ اوفیل پہاڑیوں کے چشمے شکاریوں، کسانوں اور عارضی مکینوں کے لیے یقیناً پرکشش تھے اور وہاں سے ملنے والے چقماق اور ٹھیکریوں کا تعلق حجری دور سے ہے لیکن ابتدائی تہذیب وتمدن کے فروغ میں یروشلم کا کوئی کردار سامنے نہیں آتا۔

قدیم دنیا میں تہذیبیں مٹنے سے پہلے ہمیشہ نمایاں درجے پر پہنچتی رہی ہیں۔ کنعان میں بھی یہی کچھ ہوا اور 2300 ق م تک وہاں کوئی شہر اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔ معدوم ہونے کے مختلف اسباب تھے۔ کہیں آب وہوا میں تبدیلی آگئی، کہیں بیرونی حملہ آوروں نے اینٹ سے اینٹ بجادی یا پھر خون ریز خانہ جنگیوں سے تنگ آکر لوگ شہروں سے کوچ کر گئے۔ یہ زمانہ پورے مشرق قریب میں خلفشار اور عدم استحکام کا دور تھا۔ مصر میں پرانی بادشاہت (2613-2160 ق م) کا خاتمہ ہوگیا۔ میسوپوٹیمیا میں اموریوں نے عکادیوں کا تختہ الٹ دیا۔ اموری مغرب کے سامی النسل تھے۔ انہوں نے بابل کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس دوران ایشیائے کوچک کے شہری علاقوں سے لوگ نقل مکانی کر گئے جبکہ فونیقی ساحل پر یوگیرت اور بلوس کے شہر تباہ کر دیئے گئے لیکن کسی بھی وجہ سے شام محفوظ و برقرار رہا۔ اسی طرح کنعان کے قریبی شہر مثلاً مجدو، بیت شان وغیرہ بھی اپنے جنوبی پڑوسیوں کے برعکس زیادہ عرصہ تک اپنا وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہے لیکن تعمیر وتخریب کے ساتھ ساتھ ان سب علاقوں میں ایک ایسے منظم ماحول کی تخلیق کے لیے جدوجہد جاری

رہی جہاں لوگ محفوظ اور بھرپور زندگی بسر کر سکیں۔ نئے شہر اور نئے حکمران خاندان نمودار ہوئے۔ پرانی بستیاں پھر آباد ہوئیں۔ حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال پہلے کنعان کے پرانے شہر پھر سے تعمیر ہو گئے۔

اس دور میں کنعان میں زندگی کیسی تھی؟ ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ملک میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ ہر شہر ایک خود مختار ریاست تھی۔ اس کا اپنا حکمران ہوتا جو مضافات کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا۔ ان کے برعکس میسوپوٹیمیا میں تہذیب نشوونما پا رہی تھی۔ کنعان ایک علاقائی ملک کی طرح پنپتا رہا۔ یہاں نہ تو بڑے پیمانے پر تجارت تھی اور نہ کوئی صنعت۔ آب وہوا اور جغرافیائی تفریق نے مختلف شہروں کو ایک دوسرے سے منقطع اور اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں مدد دی۔ کچھ لوگ بالائی علاقے دشت یہوداہ یا وادی اردن میں آباد تھے۔ یہاں دریا کشتی رانی کے قابل نہیں تھا اور کہیں بہہ نکلنے کی بجائے منتشر ہو کر سوکھ جاتا تھا۔ باہمی رابطے بہت مشکل تھے چنانچہ لوگ ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں زیادہ دور تک سفر نہیں کیا کرتے تھے۔ مرکزی شاہراہ جو مصر کو دمشق سے ملاتی تھی ساحل کے ساتھ ساتھ غزہ سے یافہ تک جاتی اور پھر کوہ کرمل کے اردگرد پائی جانے والی دلدل سے بچنے کے لیے اندرونی علاقوں کو چھوڑتی ہوئی مجدو، وادی یزریل اور بحِ گلیلی کی طرف نکل جاتی۔ یہ علاقے زرخیز اور گنجان آباد تھے چنانچہ بارہویں خاندان کیفراعنہ مصر کو حملہ آور ہونے کی دعوت دیتے رہے۔ انیسویں سے بارہویں صدی قبل مسیح کے دوران مصر نے شام تک اپنا تسلط یا پھر اثر ورسوخ بڑھا لیا۔ کنوان کو مصری اگرچہ ''غلام'' کہتے تھے لیکن اسے کبھی بھی حقیقی معنوں میں اپنا غلام یا محکوم نہ بنا سکے۔ تاہم مصر کا اقتصادی تسلط موجود تھا اور بعض اوقات عسکری مہم جوئی کے نتیجہ میں جزوی طور پر سیاسی تسلط بھی قائم ہو جاتا تھا۔ مثلاً فرعون سیسوسترتس سوم نے مقامی حکمرانوں کی طاقت وخود مختاری کو حدود میں رکھنے اور اطاعت گزاری کا پابند بنانے کے لیے ساحلی شاہراہ پر یلغار کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہ لیا۔ لیکن اس فرعون اور دیگر فراعنہ نے کبھی بھی داخلی کنعان اور دیگر علاقوں میں زیادہ دلچسپی نہ لی چنانچہ مصریوں کی عمومی بالادستی کے باوجود مجدو، حضر اور اکو جیسے شہر قلعہ بند شہری، ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔ انیسویں صدی قبل مسیح کے اختتام پر آباد کار کوہستانی علاقے میں داخل ہو رہے تھے اور پھر وہاں نئے شہر تعمیر ہو گئے۔ انیسویں صدی قبل مسیح کے اختتام پر نئے آباد کار کوہستانی علاقے میں داخل ہو رہے تھے اور پھر وہاں نئے شہر تعمیر ہو گئے۔ سیکم ان قلعہ بند کوہستانی شہروں میں سب سے زیادہ طاقتور ہو گیا۔ اس کا اپنا رقبہ سینتیس ایکڑ سے زیادہ تھا۔ مضافات کا ایک وسیع علاقہ بھی اس کے زیر تسلط رہتا۔ جنوبی پہاڑیوں میں حبرون اور یروشلم بھی ترقی کر گئے۔

یہی وہ وقت ہے جب یروشلم تاریخ میں داخل ہوا۔ 1961ء میں ایک برطانوی ماہر آثار

قدیمہ کیتھلین کینون نے اس دور کی ایک دیوار دریافت کی۔ ساڑھے چھ فٹ موٹی دیوار اوفیل پہاڑیوں کی مشرقی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی گیہون چشمہ تک موجود تھی۔(1) کیتھلین کا کہنا ہے کہ یہ فصیل پہاڑی کے جنوبی کنارے تک اور مغربی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ بھی پائی جاتی تھی۔ یہ شمال کی طرف بعد میں

MAP (نقشہ)

بننے والی ایک فصیل میں غائب ہو جاتی ہے۔ کیتھلین کو دیوار کے ساتھ ساتھ کھدائی میں برتن بھی ملے۔ ان کا تعلق اٹھارویں صدی قبل مسیح ہے۔ شمال میں شہر انتہائی غیر محفوظ تھا چنانچہ بعد میں وہاں صیہون کی شہر پناہ تعمیر کی گئی۔ ممکن ہے اٹھارویں صدی قبل مسیح میں شہر کے شمال میں کوئی قلعہ بھی موجود ہو۔ اوفیل کی مشرقی ڈھلوان میں دیواریں بہت نیچے جا کر بنائی گئی تھیں۔ غالباً جیہون چشمہ کے لیے زیر زمین سرنگ تک رسائی ممکن بنانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔ برطانوی انجینئر چارلس وارن نے یہ سرنگ 1867ء میں دریافت کی۔ یہ شہر کے اندر ایک چٹان سے شروع ہو کر آڑی ترچھی نیچے اترتی اور پھر سیدھے جیہون کے پانی تک پہنچتی جو وہاں ایک اور افقی سرنگ کے ذریعے چشمہ سے آکر ذخیرہ ہو جاتا تھا۔ محاصرے کے دنوں میں سرنگ کے دھانے سے گھڑے اور دیگر برتن لٹکا کر پانی حاصل کیا جاتا ہوگا۔ اسی طرح کے انتظامات مجدو، جزر اور جبعون میں بھی پائے گئے ہیں۔ کیتھلین کا خیال ہے کہ پانی کی سرنگ کانسی کے دور میں زیر استعمال رہتی تھی۔ لیکن زیادہ تر مہارین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس دور کے لوگ اس طرح کی تکنیکی مہارت سے ابھی آشنا نہیں تھے۔ نئی ارضیاتی تحقیق کے مطابق بھی ''وارن کی سرنگ'' (واربز شافٹ) انسانی ہاتھوں کا کارنامہ نہیں بلکہ چونے کی ایک چٹان کے ساتھ پایا جانے والا قدرتی گڑھا تھا جسے یروشلم کے قدیم باسیوں نے ردوبدل کر کے طویل بنالیا ہوگا۔(2)

آباد کار غالباً جیہون کی قربت کو مدنظر رکھ کر اوفیل کی طرف راغب ہوئے تھے۔ اس مقام کی جغرافیائی اہمیت بھی تھی۔ یہ کوہستانی علاقے کی ترائی یعنی دامن کوہ میں واقع اور دشت یہوداہ سے متصل تھا۔ اوفیل کسی بڑی آبادی کی گنجائش نہیں رکھتا تھا۔ شہر کا رقبہ تقریباً نو ایکڑ تھا۔ اس میں تین تیز عمودی ڈھلوانیں رکھنے والی وادیاں باشندوں کو بھرپور تحفظ مہیا کرتی تھیں۔ مشرق میں وادی قدرون، جنوب میں وادی ہنوم اور مغرب میں مرکزی وادی تھی جو اب زیادہ تر گار سے اٹی پڑی ہے۔ اسے یہودی مورخ فلیویس جوزیفس ''ٹائروپوئین ویلی''، یعنی پنیر بنانے والوں کی وادی کہتا ہے(3) اگرچہ یہ شہر کنعان کے اہم شہروں میں شمار

نہیں ہوتا تھا لیکن بہت جلد مصریوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ 1925ء میں لکسور سے ''ٹھیکریاں'' خریدی گئیں۔ انہیں جب دوبارہ جوڑا گیا تو یہ تقریباً 80 طشتریاں اور مرتبان بن گئے جن پر قدیم مصری زبان کے حروف کندہ تھے۔ کندہ شدہ لفظ ان ملکوں، قصبوں اور حکمرانوں کے نام تھے جو مبینہ طور پر مصر کے دشمن تھے۔ ان مرتبانوں کو ایک ساحرانہ رسم میں توڑا گیا ہوگا تاکہ ضدی اور سرکش دشمنوں کو زوال آجائے۔ ٹوٹے ہوئے مرتبانوں کا تعلق سیسوسترس سوم نامی فرعون کے زمانے سے ہے۔ یہ لگ بھگ 1842-1878 ق م بنتا ہے۔ مذکورہ مرتبانوں پر 19 کنعانی قصبوں کے نام کندہ تھے جن میں سے ایک ''روشیلیم'' ہے۔ کسی تاریخی ریکارڈ میں یروشلم شہر کا یہ پہلا ذکر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس شہر کے دو شہزادوں کے نام بھی ان مرتبانوں پر درج ہیں۔ یہ شہزادے یوقرم اور شاشان تھے۔ لعنت اور بددعاؤں کا ذریعہ بنائے گئے کچھ اور مرتبان بھی کھدائی کے دوران برآمد ہوئے ہیں جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک صدی بعد بنائے گئے۔ ان کے ذریعے ایک دفعہ پھر یروشلم کو لعنت کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن اس دفعہ توڑے جانے والے مرتبانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر صرف ایک حکمران ان دنوں قابض تھا۔ دبلے پتلے مرتبانوں کے ٹکڑوں پر درج عبارتوں سے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ اٹھارویں صدی قبل مسیح کے دوران یروشلم، کنعان کے قبائلی معاشرے سے ترقی کر کے ایک ایسی سیاسی وحدت کا حصہ بن چکا تھا جس کی شہری آبادیوں کے حاکم مختلف سردار تھے اور ان پر ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ (4)

لیکن آگے چلنے سے پہلے ہم نام کو زیرغور لاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شامی دیوتا، شیلم، سے نسبت رکھتا ہے۔ یہ دیوتا غروب ہوتے ہوئے سورج یا شام کے ستارے کی علامت تھا۔ کنعان پر سیاسی اثرات تو یقیناً مصر کے تھے لیکن مذہبی اور ثقافتی معاملات میں شام کی تقلید کی جاتی تھی۔ حضر، مجدو اور سیکم میں اس دور کے جو معبد دریافت ہوئے وہ بھی قدیم شان طرز تعمیر کے نمونے ہیں۔ ان کا بنیادی نقشہ شام کے شاہی محل جیسا ہے۔ یہ باور کراتے تھے کہ تمام تر حکمرانی دیوتاؤں کی مرہون منت ہے۔ ان معبدوں میں عوام اور بالخصوص 'بے دین' لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ ہیکل اور قربان گاہ میں مخصوص لوگ جا سکتے تھے۔ بادشاہ کی موجودگی میں کسی کو معبد میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں صرف دیوتا کے بت کی ایک جھلک دیکھنے کی اجازت تھی جو احاطے کی طرف بنے ہوئے ایک طاقچے میں رکھا ہوتا تھا اور ہیکل کے کھلے دروازے میں سے نظر آتا تھا۔ کانسی کے دور کا کوئی معبد یروشلم میں کھدائی کے دوران برآمد نہیں ہوا۔ لیکن شہر کا نام بذات خود اس بات کی شہادت ہے کہ لوگوں میں شامی مذہب مقبول تھا۔ مرتبانوں پر کندہ یروشلم کے شہزادوں (سرداروں) کے نام بھی اس امر کا اشارہ کرتے ہیں کہ شام کے لوگوں کی طرح یروشلم کے

باشندے بھی مغرب کے سامی النسل تھے اور انہی کے عقائد وتصورات پر کاربند تھے۔

''روشلیمم'' کا مطلب غالباً ''شیلم کا تخلیق کردہ'' ہے۔(5) بحر روم اور مشرق قریب کے قدیم باشندے بستیوں اور شہروں کی تعمیر کو مقدس اور عظیم مذہبی کام سمجھتے تھے۔ کوہ اوفیل کا انتخاب ابتدائی آبادکاروں نے وہاں پانی کی دستیابی اور جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے کیا ہوگا لیکن شہر کا نام، اپنی تعمیر کو دیوتاؤں کا حکم قرار دیتا ہے۔ اس زمانے میں تمام شہر مقدس مقامات تھے۔ یہ دراصل دیوتاؤں کے ارضی مسکن ہوتے تھے۔ یہ تصور جدید مغرب میں ہمارے لیے یقیناً انوکھا ہے جہاں شہروں میں خدا کو تیاگ دیا گیا ہے اور مذہب کا عمل دخل روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے لیکن صدیوں پہلے خانہ بدوشی سے تمدن کی طرف آنے والے انسانوں میں مقدس سرزمین کا تصور پایا جاتا تھا۔ اسے وہ جذباتی اور روحانی دنیا میں اپنی شناخت قرار دیتے تھے۔ مرسیا ایلیڈ نے مقدس سرزمین کے مطالعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ مقدس مقام کے احترام نے دنیا بھر میں پائے جانے والے تمام اعتقادات میں سب سے پہلے جنم لیا۔(6) یہ تمام تہذیبوں میں پایا جاتا ہے اور ابتدائی مذہبی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ کہ کچھ مقامات بہت مقدس ہیں اور انسانی رہائش کے لیے اس لیے قابل ترجیح ہیں کہ وہاں روحانی تسکین ملتی ہے نہ تو کسی علمی تحقیق کا نتیجہ تھا اور نہ کائنات کی فطرت میں مابعد الطبیعیاتی تحقیق کا شاخسانہ بلکہ اس احساس تحفظ کا نتیجہ تھا جو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والے انسانوں کو چاردیواری نے بخشا تھا۔ جب ابتدائی مردوں اور عورتوں نے اپنی رہائش کے لیے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو وہ ایسے مقامات کی طرف کھنچے چلے گئے جو بقیہ تمام مقامات سے ہر طرح مختلف تھے۔ یہی تجربہ اپنی دنیا کے بارے میں ان کے تصور کی بنیاد بنا اور پھر انسان کے لاشعور کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اب تک ہماری سائنسی عقلیت پسندی بھی اس قابل نہیں ہوسکی کہ مقدس مقام کے قدیم تصور کو ختم کرسکے۔ جغرافیائی تقدیس کے قدیم نظریات اب بھی یروشلم کی تاریخ کو متاثر کررہے ہیں اور وہ لوگ بھی انہیں اپنائے ہوئے ہیں جو خود کو مذہبی نہیں سمجھتے۔ انسانوں میں تقدس سرزمین کا تصور وقت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص صورت اختیار کرگیا اور ان کے مباحثوں میں کسی شہر کا خصوصی درجہ جیسا کہ ''یروشلم'' کے بارے میں پایا جاتا ہے کچھ بنیادی انسانی ضرورتوں کی بنیاد پر استوار ہے۔(7) یہاں تک کہ وہ لوگ جو کسی روایتی مقدس شہر میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور کسی مافوق الفطرت عقیدے سے وابستہ نہیں وہ بھی کسی نہ کسی مقام کو پسند کرتے ہیں اور اسے برقرار اور بحال رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے مقامات ہمارے لیے مقدس ہیں کیونکہ ان سے ہماری ذات وابستہ ہے۔ ممکن ہے وہ کسی ایسے گہرے تجربے سے متعلق ہوں جس نے ہماری زندگی بدل کر رکھ دی ہو۔ ہمارے ابتدائی بچپن کی یادوں سے ان کا تعلق ہو یا پھر کسی ایسے فرد سے ہو جو ہمیں بہت محبوب یا بہت اہم ہو۔ جب ہم

ایسے کسی مقام پر جاتے ہیں تو دایداپنے اس دور کو یاد کرتے ہیں جو ہم نے وہاں گزارا ہوتا ہے۔ایک ایسا تجربہ جو عارضی طور پر ہمیں قائل کر دیتا ہے کہ ظالمانہ اور پریشان کن فطرت کے درمیان ہماری دنیاوی موجودگی کچھ اور معنی اور کچھ اور قدر و قیمت بھی رکھتی ہے۔لیکن اس بصیرت کا اظہار عقلی اصطلاحوں میں کرنا مشکل ہے۔

قدیم دنیا میں لوگ اپنی مقدس سرزمین کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے تھے کہ دنیا کو دیوتاؤں نے تخلیق کیا ہے چنانچہ یہ غیر جانبدار علاقہ نہیں۔ارضی منظر بنی نوع انسان کے لیے ایک پیغام تھا۔جب وہ کائنات پر غور کرتے تو مردوں اور عورتوں کو اپنی موجودگی کی ایک خاص سطح کا ادراک ہوتا جو ان لغزشوں اور مجبوریوں سے بالاتر تھی جو ان کی اپنی زندگیوں میں انہیں گھیرے رہتی۔یہ ادراک ایک بھرپور اور زیادہ طاقتور جہت کی نمائندگی تھا۔ایک ایسی حقیقت جس سے وہ پہلے مانوس اور آشنا نہیں ہوتے تھے۔مقدس سرزمین سے اپنے تعلق کے اظہار کے لیے وہ اس کا تشخص وضع کر لیتے۔ہر مقدس سرزمین کی نسبت کسی مافوق الفطرت ہستی یا دیوی دیوتا سے ہوتی تھی۔دیویوں اور دیوتاؤں کی ایسی تجسیم کی جاتی جیسے ان کے اپنے جسم تھے۔ چونکہ وہ اس مافوق الفطرت عنصر کو فطرت کی دنیا میں محسوس کرتے تھے چنانچہ دیوتا سورج، ہوا، سمندر، بادل، بارش سے وابستہ تھے۔ان دیوتاؤں کی قوت وجبروت کی کہانیاں بھی وضع کر لی گئی تھیں۔ان کہانیوں کا مقصد محض واقعات بیان کرنا نہیں بلکہ یہ اس پر اسراریت اور ناقابل فہم صورتحال کو بیان کرنا ہتا تھا جن کا تجربہ انہیں اس دنیا میں ہوتا تھا۔کائنات میں پائی جانے والی قوتوں کے مالک ان دیوی دیوتاؤں کا قرب اس نا پائیدار اور غیر یقینی دنیا میں تحفظ کا احساس دیتا تھا چنانچہ لوگ اپنے پسندیدہ اور بہی خواہ دیوی یا دیوتا کے سائے میں رہنا چاہتے تھے۔یہ سایہ ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسے مقامات پر رہنے سے ملتا تھا جس کی نشاندہی خود وہ دیوتا یا ماورائی قوت کیا کرتی تھی۔یہی مذہبی جستجو تھی جس کا ہدف ہمیشہ سے ایک تجربہ رہا ہے نہ کہ پیغام۔۔۔ہم چاہتے ہیں کہ خود کو واقعتاً زندہ محسوس کریں۔اپنے انسان ہونے کی استعداد و صلاحیت کو مکمل کریں۔اس طرح زندہ رہیں کہ کائنات کے گہرے بہاؤ سے ہم آہنگ ہوں۔اس آسودہ تر زندگی کی تلاش۔۔۔طاقتور اور غیر فانی دیوتاؤں کی اساطیر میں یا پھر جدید مذاہب میں موجود رہی ہے۔لوگ چاہتے تھے کہ فانی اور بے معنی دنیاوی تجربے کے بعد ایک ایسی حقیقت کو پائیں جو ان کی انسانی فطرت کی تکمیل کرے۔قدیم دنیا میں یہ سب کچھ مافوق الفطرت عنصر یا خدا سے رابطہ اور تعلق کے بغیر ممکن نہیں تھا۔لوگ سمجھتے تھے کہ اس رابطہ کے بغیر رہنا، زندگی کو بے یار و مددگار بنا دیتا تھا۔(8)

ایلیڈ کا کہنا ہے کہ ازمنہ قدیم کے لوگ صرف ایسی جگہوں پر آباد ہونا چاہتے تھے جہاں ماورائی

قوت نے ایک بار اپنا ظہور کیا ہو اور اس رکاوٹ کو توڑ دیا ہو جو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان حائل ہے۔ شاید شیلم دیوتا نے کوہ اوفیل پہ اپنا آپ ظاہر کیا ہو اور اس سرزمین کو بالخصوص اپنا قرار دیا ہو۔ چنانچہ لوگ اس مقصد اور یقین کے ساتھ وہاں جاتے ہوں گے کہ دیوتا سے رابطہ اس شہر اور اس مقام پر ممکن ہے۔ لیکن ماورائی قوت اس عالم فانی میں واہموں، خیالی پیکروں اور مافوق الفطرت ہستیوں میں ہی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ جو چیز ماحول سے مختلف اور فطری ضابطے کے برعکس ہوتی وہ مذہبی اسرار اور خدا کا مظہر ہوتی تھی۔ ایک چٹان یا وادی جو نہایت خوبصورت یا شاندار ہوتی وہ قدیم انسان کے لیے اس بات کا اشارہ ہوتی تھی کہ یہاں خدا موجود ہے کیونکہ یہ بقیہ ماحول سے مختلف ہے۔ اس کے خدوخال اور ظاہری صورت واضح طور پر کہتے کہ ''یہ کچھ اور چیز ہے۔''(9) نامعلوم، اجنبی یہاں تک کہ مکمل چیزیں بھی قدیم انسان کو مختلف محسوس ہوتی تھیں۔ مثلاً پہاڑ میدانوں کے برعکس اونچے اور سربلند تھے۔ قدیم انسان کے لیے یہ ماورائیت کی علامت تھے۔ ان کی چوٹیوں پر پہنچ کر عبادت گزار محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک ایسے مقام پر آ گئے ہیں جو زمین اور آسمان کے درمیان واقع ہے۔ میسوپوٹیمیا میں معبدوں کے عظیم مینار اس طرح تعمیر کئے جاتے تھے کہ ان میں پہاڑی چوٹیوں کی جھلک دکھائی دے۔ پتھروں کے بنے سات زینے سات آسمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان پر چڑھنے والے زائرین تصور کرتے تھے کہ وہ کائنات میں سے گزر رہے ہیں اور چوٹی پر پہنچ کر وہ اپنے دیوتاؤں سے ملاقات کر سکتے ہیں۔(10) شام زیادہ تر پہاڑی علاقہ ہے۔ چنانچہ مصنوعی پہاڑیاں بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ حقیقی پہاڑ بذات خود مقدس مقامات کا احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ یروشلم کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت ''کوہ زیفون'' کو ملی۔ اسے اب جبل الاقرا کہتے ہیں۔ یہ یوگیرت سے 20 میل دور شمال میں اورونٹس کے دہانے پہ واقع ہے۔ (11) کنعان میں کوہ حرمون، کوہ کرمل اور کوہ تابور بھی مقدس مقامات تھے۔ عبرانی مذہبی گیتوں کے مطابق کوہ صیہون جو کوہ اوفیل کے شمال میں (یروشلم میں) واقع ہے، ایک مقدس مقام تھا۔ اس پہاڑ کے اصل خدوخال اب نہیں دیکھے جا سکتے کیونکہ بادشاہ ہیرودیس نے پہلی صدی قبل مسیح میں یہودیوں کا معبد بنانے کے لیے جو وسیع وعریض پلیٹ فارم بنایا تھا۔ اس میں یہ پہاڑ چھپ گیا ہے۔ اپنی قدرتی حالت میں ممکن ہے کہ کوہ صیہون اپنے اردگرد کے پہاڑوں میں اس طرح سربلند ہو کہ سب میں عظیم ومقدس دکھائی دیتا ہو۔

جب ایک دفعہ کوئی مقام ''مقدس'' محسوس ہو جاتا تو پھر یہ اپنے غیر مقدس ماحول سے پوری طرح مختلف نظر آتا تھا۔ چونکہ خدا نے صیہون پر اپنا ظہور کیا تھا چنانچہ یہ جگہ عقیدتوں کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ زمین کا مرکز بھی قرار دے دی گئی۔ یہ مرکزیت آپ جیومیٹری کے کسی قاعدے کلیے سے ثابت نہیں کر

سکتے۔لیکن یروشلم کے باشندوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔قریب ہی حبرون بھی مقدس مرکز سمجھا جاتا تھا۔ تقدس کی اپنی منطق ہوتی ہے۔اسی طرح اس وقت بھی کوئی مسئلہ نہ پیدا ہوا جب ربیوں یعنی زیور کے عالموں نے دعویٰ کیا کہ کوہ صیہون دنیا میں بلندترین مقام ہے حالانکہ ''پنیر بنانے والوں کی وادی'' جسے اب وادی الوعد کہتے ہیں، کے دوسری طرف مغربی پہاڑی واضح طور پر کوہ صیہون سے اونچی تھی۔دراصل وہ شہر کی طبعی جغرافیائی بلندی کی بات نہیں کررہے تھے بلکہ روحانی نقشے میں اس کی فرعت اور عظمت ومرتبت کی بات کر رہے تھے۔کسی بھی اور مقدس پہاڑ کی طرح جہاں ماورائی قوت نے اپنا ظہور کیا ہو، کوہ صیہون بھی نہایت متبرک سمجھا جاتا تھا۔یہاں پہنچ کر لوگ اپنے آپ کو آسمان یا عالم بہشت کے قریب محسوس کرتے تھے۔اسی وجہ سے یہ ان کی دنیا کا ''مرکز'' تھا۔یہ ان مقامات میں سے ایک تھا جہاں خدا سے رابطہ ممکن تھا۔اس خدا سے جس نے ان کی زندگیوں کو حقیقی اور بامقصد سمت دی تھی۔

ابتدائی معاشروں میں لوگ صرف وہاں بستیاں بساتے تھے جہاں اس طرح کا رابطہ ممکن ہوتا تھا۔لیکن خانہ بدوش چونکہ مسلسل سفر میں رہتے تھے اس لیے وہ ماورائی قوت سے رابطے کا ذریعہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ایلیڈ نے لکھا ہے کہ آسٹریلیا کا آچلپا قبیلہ اس وقت خوف ودہشت کا شکار ہو گیا جب ان کا وہ مقدس لٹھ ٹوٹ گیا جسے وہ اپنے ساتھ لیے پھرتے تھے۔آچلپا کے نزدیک یہ لٹھ ان کے اور مقدس قوت کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔جونہی وہ لٹھ ٹوٹا وہ دہشت زدہ ہو کر لیٹ گئے اور مرنے کا انتظار کرنے لگے۔(12) ہم دراصل معنی طلب مخلوق ہیں جب ہم اپنی سمت اور جہت گنا بیٹھتے ہیں تو پھر سمجھ نہیں پاتے کہ کس طرح زندگی گزاریں یا اپنے آپ کو اس دنیا میں کہاں رکھیں؟ یہی وجہ ہے کہ قدیم دنیا میں شہر معبدوں اور مزاروں کے گرد تعمیر کیے جاتے تھے۔انہیں خدا کی موجودگی کا مقام اور اس سے رابطہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔یہ مقدس مقامات لوگوں کے لیے ٹھوس حقیقت تھے اور ان کے منتشر وجود کو مکمل کرتے تھے۔خدائی قوت کا تجربہ خوف اور دوسری جبلی کیفیات میں ہوتا تھا۔جرمن تاریخ دان روڈلف اوٹو اپنی کلاسیک کتاب ''دی آئیڈیا آف دی ہولی'' میں کہتا ہے کہ ماورائی قوت یا روح القدس کو انسان نے خوف ودہشت کے نتیجہ میں قبول کیا لیکن یہ تصور مسحور کردینے والا بھی تھا اور ناقابل مزاحمت کشش رکھتا تھا کیونکہ یہ کچھ ایسی چیز تھی جو بہرحال انسانوں کی ضرورت تھی۔اپنے آپ کو اس طاقتور حقیقت سے وابستہ کر کے ہی انہیں یقین ہوتا تھا کہ ان کے معاشرے زندہ رہ سکیں گے۔تہذیبیں فانی تھیں۔شہر کم وبیش راتوں رات صفحہ ہستی سے مٹ جایا کرتے تھے جیسا کہ کانسی کے دور میں فلسطین میں ہوتا رہا ہے۔چنانچہ وہ اس وقت تک صبر واستقامت کا مظاہرہ نہیں کرسکتے تھے جب تک دیوتاؤں کی انتہائی طاقتور اور موثر پشت پناہی کا یقین نہ ہوتا اور یہ تعلق ان سے کسی نہ

کسی درجہ پر قائم کر کے ہی حاصل ہوتا تھا۔

بعض اوقات بالا تر قوت کی تلاش اور کسی مقدس کا عقیدہ اپنی گم گشتہ جنت کی یادوں سے وابستہ ہوتا تھا۔تقریباً ہر قوم اور ثقافت میں ایک ایسے سنہری دور کا مفروضہ پایا جاتا ہے جب دیوتاؤں کے ساتھ رابطہ آسان اور قریبی تھا اور جب بالاتر قوت کہیں اور دراز بھٹ پڑنے والی قوت محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ روز مرہ زندگی کی ایک حقیقت تھی۔ بنی نوع انسان کے بے پناہ قوتیں حاصل تھیں،تب کوئی بیماری نہ تھی۔موت نہ تھی،کوئی خلفشار نہ تھا۔چنانچہ لوگ اسی جنت میں واپس جانے کی تمنا کرتے تھے جہاں رحمتیں برکتیں اور لطف و انبساط تھا۔لوگ سمجھتے تھے کہ زندگی اس طرح کی ہونی چاہیے جیسا کہ ان کی گم گشتہ جنت میں تھی۔ (13) آج ہم کسی ارضی جنت یا باغ عدن پر یقین نہیں رکھتے لیکن ایسی زندگی کی خواہش ضرور کرتے ہیں جو موجودہ ناقص زندگی سے مختلف اور بہتر ہو،یعنی ارضی جنت میں بسر ہونے والی مثالی زندگی جیسی ہو۔ایک جبلی یقین ہر جگہ موجود ہے کہ زندگی کا مقصد بہر حال یہ نہیں جیسا کہ موجودہ صورت میں پایا جاتا ہے۔ہم اس بات کے متمنہ ہیں جو ہونی چاہیے لیکن موجود نہیں۔ہم زمینی زندگی کی عبوری نوعیت پر نوحہ کناں ہیں اور موت پر غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ہم ایک ایسی دنیا کے تصور سے مسحور ہیں جس میں مکمل ہم آہنگی ہو، جہاں ہم اپنے ماحول سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہوں۔ہمیں اپنے ماحول سے نبرد آزما نہ ہونا پڑے۔ جہاں ماحول اور فطرت ہمیں زیر نہ کر سکے۔ دراصل ہم مکمل ترین تعلق کے خواہشمند ہیں۔ایسی دنیا کی آرزو، ایسی جنت کی تلاش میں ہیں جو ہماری رسائی میں نہیں۔ جو پھر نہ حاصل ہونے کے لیے گم ہو چکی ہے۔اس کی خواہش آج ہمارے گیتوں میں جھلکتی ہے۔ہماری کہانیوں میں شامل ہے۔سیاستدانوں اور فلاسفروں کے یوٹو پیائی تصورات میں موجود ہے۔

نفسیات دان یادوں کی اس بارات کو علیحدگی کے اس درد سے منسوب کرتے ہیں جو ہم پیدائش کے قوت محسوس کرتے ہیں۔ جب ہم شکم مادر سے ہمیشہ کے لیے نکال دیئے جاتے ہیں۔ مذہبی عناصر اسے جنت سے نکالے جانے کے واقعہ سے منسوب کرتے ہیں جو انسانوں کے اجتماعی شعور کے کسی گوشے میں مسلسل موجود ہے۔آج بہت سے لوگ جنت کے سکون کو آرٹ، منشیات اور جنس میں تلاش کرتے ہیں۔ قدیم معاشروں میں لوگ اسے ایسی جگہ پر رہ کر حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ان کے ایمان وعقیدہ کے مطابق گم گشتہ تکمیل پھر سے میسر آ سکتی تھی۔

یروشلم میں اٹھارویں صدی قبل مسیح میں جس طرح کی مذہبی زندگی پائی جاتی تھی آج ہمیں اس کا کوئی براہ راست علم نہیں۔آثار قدیمہ میں ملنے والے مرتبانوں پر یروشلم کے کندہ تذکرہ کے بعد کا کچھ عرصہ

تاریکی میں گم ہے۔ یہ عرصہ کنعان میں خوشحالی کا زمانہ تھا۔ سترھویں صدی قبل مسیح میں فراعنہ مصر اپنے داخلی مسائل میں اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ انہیں غلام (کنعان) کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ یہ غلام آسودہ ہو گیا۔ مصر کی جانب سے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں تھی۔ مقامی انتشار موجود نہیں تھا چنانچہ مقامی ثقافت اور سیاست خوب پھلی پھولی۔ کنعان کے کچھ شہر مکمل شہری ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔ کھدائی کے دوران مجدو، حضر اور سیکم کے مقامات سے اس زمانے کی عمارتیں، فرنیچر، برتن اور زیورات برآمد ہوئے ہیں لیکن یروشلم سے سترھویں سے پندرھویں صدی قبل مسیح کے برتن یا کوئی اور آثار نہیں مل سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان برسوں کے دوران شہر کا وجود ہی نہیں تھا۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ چودھویں صدی قبل مسیح سے پہلے یہ مقام دوبارہ آباد ہو سکا تھا یا نہیں۔ تاہم اس زمانہ میں مصر نے کنعان میں پھر سے اپنی بالادستی قائم کر لی تھی اب فراعنہ مصر اناطولیہ میں نئی حطی سلطنت اور بالائی میسوپوٹیمیا میں حوریوں کی متانی سلطنت سے نبرد آزما تھے۔ انکے لیے ضروری تھا کہ کنعان کا درمیانی ملک موثر طریقے سے ان کے تسلط میں رہے۔ 1486 قبل مسیح میں فرعون تھت مس سوم نے کنعانیوں اور شامی حکمرانوں کی ایک بغاوت مجدو میں کچلی اور غلام کنعان کو پوری طرح اپنی عملداری میں لے لیا۔ ملک کو چار انتظامی صوبوں میں تقسیم کیا گیا۔ شہری ریاستوں کے حکمران فرعون کے منصب دار بن گئے وہ ذاتی حلف کے تحت فرعون کے وفادار اور باج گزار بنے۔ وہ ہر سال ایک خطیر رقم باج گزاری میں دینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن اس کے جواب میں انہیں جس قدر مدد اور اعنت کی ضرورت تھی، فرعون اس کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے باوجود یہ منصب دار اب بھی بھرپور داخلی خودمختاری رکھتے تھے۔ مصر کے پاس پورے کنعان کو قابو میں رکھنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ادھر مقامی حکمران اپنی فوج بنا سکتے تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف تصادم میں کود پڑتے تھے۔ دوسری ریاستوں کے علاقے چھین کر اپنی قلمرو کو وسیع کر لیتے تھے۔ چنانچہ دوسری بڑی طاقتوں نے اب کنعان کی طرف حریصانہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ متانی ریاست کے حوریوں نے پندرھویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں ہی اپنے آپ کو مستحکم کر لیا تھا۔ ان لوگوں کو بائبل میں حوری یا حوی کہا گیا۔ مقامی لوگوں کے برعکس یہ لوگ آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ فاتحین کی صورت میں نہیں آئے تھے لیکن انہوں نے اس طرح اپنے گہرے اثرات مرتب کئے کہ مصریوں نے کنعان کو حوریوں کی سرزمین کہنا شروع کر دیا۔ حوریوں نے کنعان کی شہری ریاستوں میں طاقتور مناصب حاصل کر لیے تھے۔ وہ مقامی لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتے اور انہیں اپنی عکادی زبان سکھا دی۔ چنانچہ یہ زبان سرکار دربار کی زبان بن گئی اور خط منجی میں لکھی جانے لگی۔

حوریوں کا اثر ورسوخ یروشلم میں بھی موجود تھا۔(14) چودھویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کنعان کی ایک طاقتور ریاست بن چکا تھا۔تاہم یہ ریاست، مجدو اور حصر سے کچھ کمتر اہمیت رکھتی تھی۔اس کا علاقہ اب سیکم اور جذر تک پھیل چکا تھا۔اس کا حکمران لبیدی ہپا تھا۔ یہ نام حوریوں میں رائج تھا۔اس دور کے یروشلم کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ وہ تختیاں ہیں جن پر خط منجی میں عبارتیں کندہ ہیں۔ یہ تختیاں طل امرنا کے مقام سے 1887ء میں برآمد ہوئیں۔قرین قیاس یہ ہے کہ یہ تختیاں فرعون آمن ہوتپ سوم (1349-1386 ق م) اور اس کے بیٹے آخن آتن 1334-1350 ق م) کی سرکاری دستاویز تھیں۔ یہ دستاویز کنعان کے مقامی حکمرانوں کے 350 خطوط پر مشتمل ہیں جو انہوں نے اپنے حاکم اعلیٰ، فرعون مصر کو لکھے تھے۔ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں پورا ملک خلفشار میں مبتلا تھا۔تمام شہری ریاستیں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں۔مثلاً سیکم کا حکمران لیب آئیوسفا کی کے ساتھ توسیع پسندی کی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔اس نے اپنی قلمرو کو شمال میں بحر گلیلی تک اور مغرب میں غزہ تک وسیع کرلیا تھا۔ان مکتوبات میں مقامی حکمرانوں نے داخلی دشمنوں کی شورشوں کی بھی شکایات بھی درج کی تھیں اور فرعون سے مدد کی درخواست کی تھی لیکن فرعون کنعان کے خلفشار سے ناخوش نہیں تھا کیونکہ یہ خلفشار مصری بالادستی کے خلاف کنعانی ریاستوں کے اتحاد میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

MAP (نقشہ)

طل امرنا سے ملنے والے مکتوبات میں سے چھ مکتوب یروشلم کے حکمران ایبدی ہپا کی طرف سے تحریر کردہ ہیں۔ یہ حکمران کنعانی ریاستوں کے زیادہ کامیاب حکمرانوں میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔وہ فرعون کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار مبالغہ آرائی کے ساتھ کرتے ہوئے اپنے دشمن کے خلاف مدد کی درخواست کرتا ہے۔ یہ مدد اسے کبھی نہ مل سکی۔ چنانچہ سیکم کے خلاف اس کی مزاحمت دم توڑ گئی اور حلیفوں سے محروم ہونے کے بعد وہ سرنگوں ہوگیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یروشلم شہر میں بھی شورشیں بپا ہوتی ہیں۔لیکن ایبدی ہپا نہیں چاہتا کہ مصری سپاہی یروشلم میں براہ راست بھیجے جائیں۔کیونکہ اس سے پہلے ناتجربہ کار اور کم تعداد مصری سپاہیوں نے اس کے محل میں زبردستی داخل ہوکر اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ وہ فرعون سے درخواست کرتا ہے کہ براہ راست یروشلم میں سپاہی بھیجنے کی بجائے جزر، لیکس اور اسقلون میں کمک بھیجی جائے۔۔۔''اگر مصر سے مدد نہ آئی تو یروشلم کی سرزمین یقینی طور پر دشمنوں کے قبضہ میں چلی جائے گی۔''

(15)

ایبدی ہیپا کے پاس یقینی طور پر کوئی فوج نہیں تھی اور پھر اس دور میں یہ کوہستانی ملک تیزی سے غیر عسکری علاقہ بن رہا تھا۔(16) خانہ جنگی اور شورشوں سے تنگ آ کر لوگ نقل مکانی کر رہے تھے۔مثلاً قلعہ بند شہر شیلوع بے آباد ہو چکا تھا۔ بالائی مقامات کی 80 فیصد بستیاں تیرھویں صدی قبل مسیح کے دوران غائب ہو گئی تھیں۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ خلفشار کے اسی دور میں وہ لوگ یروشلم میں آباد ہو چکے تھے جنہیں بائبل یبوسی کہتی ہے۔ دوسرے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ یبوسی جوحویوں کے بہت قریب تھے،حطیوں کے زوال تک ملک میں داخل نہیں ہوئے تھے۔حطیوں کی مملکت 1200 ق م میں موجودہ ترکی کے شمالی علاقہ میں پائی جاتی تھی۔(17) چنانچہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ یبوسی حطیوں کے زوال کے بعد وہاں آئے۔آثار قدیمہ کے شواہد ابھی تک اس امر کی نشاندہی نہیں کرتے کہ کانسی کے دور (1200-1550 ق م) کے اواخر تک یروشلم کے باشندوں میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔عموماً سمجھا جاتا ہے کہ یبوسی خاندان، اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے اور شہر کے باسیوں سے الگ تھلگ ایک گڑھی میں رہتے تھے۔(18) چنانچہ قوی امکان یہی ہے کہ ان یبوسیوں نے اوفیل پر پرانی قلعہ بندیوں کی مرمت کر کے انہیں پھر سے مستحکم کیا ہو۔انہوں نے ہی پہاڑ کی چوٹی اور دیوار کے درمیان مشرقی ڈھلوان پر ایک نئی بستی آباد کی۔ کیتھلین نے پتھروں سے بھرے چبوترے بھی دریافت کئے ہیں۔اس کا کہنا ہے کہ انہی چبوتروں کی بدولت عمودی ڈھلانوں پر مشتمل یہ علاقہ رہائش کے قابل ہوا تھا۔ چنانچہ دم گھونٹنے والے تنگ و تاریک مکانوں اور تیز ڈھلوانی گلیوں کی جگہ بہت تعمیرات وجود میں آئیں۔کیتھلین کا دعویٰ ہے کہ اس کام میں طویل عرصہ لگا۔ یہ کام چودھویں صدی ق م کے وسط میں شروع ہوا لیکن تیرھویں صدی ق م کے اوائل تک مکمل نہ ہو سکا تھا۔کچھ دیواریں تو 33 فٹ تھیں اور پھر تعمیر کے کام میں قدرتی آفات بھی مزاحم ہوتی رہیں۔ان میں زلزلے اور زمینی کٹاؤ شامل رہے۔(19) یہ نئی تعمیرات رہائشہ سہولیات کے ساتھ ساتھ شہر کے دفاع کے کام بھی آتی تھیں۔کیتھلین کا خیال ہے کہ یہ وہی ملّو ہے جس کا ذکر بائبل میں ہے۔(20) چونکہ یہوداہ کے کچھ آخری بادشاہوں نے ملو کی مرمت کو ضروری قرار دیا تھا، چنانچہ یہ عسکری نوعیت ہی رکھتے ہوں گے۔اوفیل کی چوٹی پر یہ شہر کے قلعے کا حصہ بھی ہوں گے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ ''صیہون'' سے مراد پورا یروشلم شہر نہیں بلکہ یہ نام اس قلعے کا یہ ہے جو شہر کو غیر محفوظ سمت سے تحفظ مہیا کرتا تھا۔

طل امرنا دور میں یروشلم، شیلم یعنی اپنے بانی دیوتا کا وفادر دکھائی دیتا ہے۔ایبدی ہیپا فرعون کے نام اپنے مکتوبات میں یروشلم کی ریاست کے دارالحکومت کا ذکر کرتا ہے جس کا نام بیت شلمانی (شیلم کا گھر) ہے(21) لیکن بائبل کے علما کا کہنا ہے کہ حوری، شہر میں ایک نیا دیوتا لے آئے جو طوفان کا دیوتا۔بعل

۔۔۔تھا۔شام کے ساحل پر واقع یوگیرت (زگرت) کے لوگ اسی دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ (22)
ہمیں مذہب بعل کے پجاریوں اور عقیدت مندوں کے رسوم و رواج کی تفصیلات ان تختیوں سے ملتی ہیں جو 1928ء میں راس شمرہ (قدیم زگورت) سے برآمد ہوئیں۔

بعل کے بارے میں بھی کچھ باتوں کا تذکرہ ہو جائے کیونکہ اس نے یروشلم کی روحانیت پر گہرے اثرات مرتب کیئے۔بعل ایک طاقتور دیوتا تھا لیکن شام کے دیوی دیوتاؤں کا سردار نہیں تھا۔اس کا باپ ایل تھا جس کا تذکرہ بائبل میں بھی موجود ہے۔'ایل' دنیا کو زرخیزی مہیا کرنے والے دو عظیم دریاؤں کے سنگم پر ایک پہاڑ پر خیمے کے معبد میں رہتا تھا۔تمام دیوتا یہاں ہر سال مجلس شوریٰ میں شرکت کرتے اور کائنات کے قوانین وضع کرتے ۔ایل، قانون ، ضابطے اور زرخیزی کا سرچشمہ تھا جس کے بغیر کوئی انسانی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے بڑے دیوتاؤں کی طرح ایل کو بھی فراموش کر دیا گیا۔اس کی جگہ لوگوں نے اس کے طاقتور بیٹے بعل کی عبادت شروع کر دی۔بعل بادلوں پر سوار ہو کر آسمان سے بجلی کے کوندے پھینکتا تا کہ بارش ہو اور جھلسی ہوئی زمین پھر سے سرسبز ہو جائے۔

بعل کو زمین کی زرخیزی اور ثمر باری کے لیے موت سے لڑنا پڑا تھا۔موت اور فنا کا دیوتا یم تھا۔ مشرق قریب میں زندگی کو بعض اوقات انتشار، تاریکی اور ہلاکت کی قوتوں کے خلاف مایوس کن جنگ سے واسطہ پڑتا تھا۔تمدن، تہذیب اور تخلیق کا حصول بڑی بڑی رکاوٹوں اور مصائب پر قابو پا کر ہی ممکن ہوتا تھا۔ پروہت، لوگوں کو داستانیں سناتے تھے کہ کس طرح تخلیق کائنات کے وقت خیر اور شر کے دیوتاؤں کے درمیان خوفناک تصادم ہوئے جن کے نتیجہ میں تاریکی میں سے روشنی اور انتشار میں سے ترتیب نے جنم لیا۔ عظیم دیوتاؤں نے کس طرح کائنات کے بے ہنگم اور بے لگام عناصر کو منظّم اور پابند بنایا۔بابل میں پجاری نوجوان جنگجو دیوتا مروک کی اس جنگ کی یاد مناتے جس میں اس نے سمندر کے عفریت تیامت کو قتل کیا۔ اس کے جسم کو چیر کر دو ٹکڑے کیا اور دنیا تخلیق کی۔اسی طرح کی داستانیں بعل سے بھی منسوب تھیں۔بعل کی دیو مالا کے مطابق اس نے سات سروں والے سمندری عفریت لوتان سے جنگ کی۔عبرانی میں اسے لیویا تن کہتے ہیں۔دنیا کی سبھی ثقافتوں میں ڈریگن، عفریت اور شیطان برائی اور تباہی کی علامت کے طور پر موجود ہے۔لوتان کو قتل کر کے بعل نے انتشار و افتراق کو روک دیا اور پھر زندگی۔۔انسانوں اور دیوتاؤں کی زندگی نے جنم لیا۔بعل کی داستان فنا، تباہی اور ابدی ہلاکت کے خوف کا ذکر کرتی ہے جو ابتدائی تہذیب کے دنوں میں خاص طور پر انسانوں کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔

اسی طرح کی خوف و دہشت کی فضا بعل کی دوسری داستانوں میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ان

میں بھی سمندر اور صحرا کے عفریت پائے جاتے ہیں۔شکست و ریخت کی یہ دونوں فطری قوتیں مشرق قریب کے قدیم شہروں کی بقا کے لیے ہمیشہ خطرہ بنی رہتی تھیں۔سمندر ہر اس چیز کی نمائندگی کرتا تھا جو متمدن دنیا میں نہیں تھی اور وہ اس سے خوفزدہ رہتی تھی۔سمندر بیکراں تھا۔اس کی کوئی شکل نہیں تھی یہ کھلا، وسیع، ہولناک اور غرق کر دینے والا تھا۔اسی طرح بنجر اور بے آب و گیاہ صحرا پھیل کر زرخیز زمینوں کو ہڑپ کر لیا کرتا تھا۔انسان اس سے بھی خوف زدہ رہتا تھا۔صرف سرسبز اور زرخیز زمین ہی انسانی رہائش کے قابل تھی چنانچہ صحرا موت اور ہلاکت کی نمائندگی کرتا تھا۔زگورت میں بیان کی جانے والی داستانوں میں سے ایک اس خوفناک جنگ پر مبنی ہے جو بعل نے یم اور مات عفریت تھا۔مات موت و ہلاکت کی علامت تھا۔یہ پیٹو قسم کا عفریت ہر چیز ہڑپ کر جاتا تھا لیکن بھوکا رہتا۔اسے انسانی گوشت اور خون بہت مرغوب تھا۔بعل ان دونوں دشمنوں پر طویل جدوجہد کے بعد غالب آیا۔مات کے ساتھ جنگ بالخصوص بہت خوفناک تھی۔اس میں بعل، مات کی پر اسرار دنیا ''پاتال'' کا قیدی ہو جاتا ہے۔بعل کی اسیری کے دوران زمین خشک سالی کی شکار ہو کر ریگستان میں تبدیل ہو جاتی ہے اور زندگی ناپید ہو جاتی ہے۔انجام کار بعل کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کی کامیابی نامکمل رہتی ہے۔یم اور مات دونوں زندہ رہتے ہیں۔۔۔ان کی موجودگی دنیا میں ابتری و انتشار اور ہلاکت و فلاکت کا دائمی خطرہ ہے۔اس خطرے کو ٹالنے کے لیے دیوتاؤں کے ساتھ انسانوں کو بھی ایک نا ختم ہونے والی جنگ میں حصہ لینا پڑا اور پھر بالآخر بعل کو حتمی کامیابی مل گئی۔

اپنی فتح کی یادگار ایک عالی شان محل تعمیر کرنے کے لیے بعل نے اپنے باپ ایل سے اجازت طلب کی۔اس طرح کی باتیں قدیم دیو مالا میں کثرت سے ملتی ہیں۔مثلاً جب مروک نے دنیا تخلیق کی تو دیوتاؤں اور انسانوں نے مل کر زمین کے مرکز پر بابل شہر تعمیر کیا۔باب عیلانی (دیوتاؤں کا دروازہ) دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ کا مقام تھا۔یہاں ہر سال دیوی دیوتا اکٹھے ہوتے کیونکہ یہ انسانوں کی دنیا میں ان کا ارضی مسکن تھا۔انسانوں کو بھی یقین تھا کہ ان کے دیوتا یہاں آتے ہیں اور یہاں ان سے رابطہ ہو سکتا ہے۔شہر کے وسط میں مروک کا عظیم معبد ایساغ ایلا تعمیر کیا گیا تھا۔یہ شہر میں اس کا گھر تھا۔وہ یہاں رہتا اور خدائی احکامات نافذ کرتا لیکن یہ احکامات اس کے نائب یعنی بادشاہ کے ذریعے نافذ کئے جاتے تھے۔مروک کا معبد اور شہر دیوتاؤں کے آسمانی نقشے کے مطابق تعمیر کیا گیا تھا۔یہ انتشار اور افتراق کے خلاف انسانوں اور دیوتاؤں کی عظیم فتح کی یاد دلاتا تھا۔

MAP (نقشہ)

مشرق قریب میں زرخیزی اور ثمر باری کو ہمیشہ ہی صحراؤں کی دست برد سے
خطرہ رہا ہے چنانچہ مسلسل جدوجہد اس خطے کی ثقافت کا ناگزیر جزو ہے۔

اسی طرح بعل بھی کسی محل کے بغیر دیوتاؤں پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ کوہ زیفون پر سونے اور سنگ جورد سے بنے محل میں مقیم ہو گیا تو ''سب سے بڑا دیوتا'' بن گیا۔ اب وہ دیوتاؤں اور انسانوں کا اکلوتا حاکم تھا۔ اس کا دعویٰ تھا:

میں وہ ہوں جو دیوتاؤں پر حکومت کرتا ہے
اور دیوتا اور انسان سب میرے تابع ہیں
میں زمین کی سب چیزوں پر حاوی ہوں۔(23)

اپنے معبد میں بعل اور اس کی بیوی اناث اپنی عظیم فتوحات کا جشن مناتے جنہوں نے دنیا کو تباہی سے بچا لیا۔۔۔ بعل کے کارنامے مذہبی گیتوں کا حصہ تھے۔

کیا میں نے یم کو فنا نہیں کیا جو ایل کو بہت پیارا تھا؟
کیا میں نے ڈریگن کو گرفتار کر کے مغلوب نہیں کیا؟
میں نے اڑتے ہوئے اژدر کو تباہ کیا
جو اپنے سات سروں کے ساتھ ہیبت پھیلا رہا تھا(24)

زگورت کے لوگ جو زیفون پر بعل کی رہائش گاہ سے محض بیس میل دور رہتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ وہ بعل کے علاقے میں رہتے ہیں چنانچہ اس کی جدوجہد میں شریک اور فتوحات میں حصہ دار ہیں۔ زگورت کے مذہبی گیتوں میں بعل، زیفون کو مقدس مقام، میری میراث کا پہاڑ، چنیدہ مقام اور کوہسار فتح'' جیسے نام دیتا ہے وہ اسے ''حسین بلندی'' اور ''پوری دنیا کی مسرت'' کہتا ہے۔(25) چونکہ بعل وہاں رہتا تھا چنانچہ اس نے زیفون کو امن، زرخیزی اور ہم آہنگی کی جنت ارضی بنا دیا۔ ایسا عظیم مقام جہاں سے اس نے

جنگ کو ختم کر دیتا تھا۔ وہ زمین کی گہرائیوں سے امن کو روئے زمین پر لاتا تھا۔ امن کو کھیتوں اور کھلیانوں میں فروغ دے کر زرخیزی اور ثمر باری کا ذریعہ بناتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یروشلم کو شہرِ امن کہا جاتا ہے۔ اپنے علاقے میں امن اور زرخیزی کو یقینی بنانے کے لئے لوگوں نے زیفون میں بعل کے محل جیسا ایک محل زگورت میں تعمیر کر لیا۔(26) یہ محل زیفون کی مکمل ترین نقل تھا۔ ایک ایک اینٹ اور پتھر اسی ترتیب سے رکھا گیا۔ جیسا زیفون کے محل کا نقشہ تقاضہ کرتا تھا اس طرح بعل کو اپنے پسندیدہ مسکن میں مستقل طور پر رہنے اور زگورت کے لوگوں پر برکتیں نازل کرنے کے لئے آمادہ کیا گیا۔ بعل کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اب زگورت جنت بن جائے گا اور ایک ایسی زندگی کا ظہور ہوگا جو خطروں کے درمیان محفوظ و مامون رہے گی۔

زگورت کے معبد میں بعل کی موجودگی نے وہاں انسانی زندگی ممکن اور آسان بنادی۔ جب لوگ معبد میں داخل ہوتے تو وہ محسوس کرتے کہ زندگی کی ایک نئی جہت میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب وہ زندگی کے فطری اور الوہی آہنگ کا حصہ بن گئے ہیں جو عام حالات میں ان سے دور رہتا ہے۔ معبد میں ان کی سماعت ایک نئے تجربے میں داخل ہو جاتی۔

پتھروں کی سرگوشیاں اور دیودار کی آوازیں
آسمان کی زمین کے ساتھ گفتگو
پاتال کا ستاروں سے کلام۔
۔۔۔۔۔بجلی کے کوندے جو آسمان میں موجود نہیں
لفظ جو انسان نہیں سمجھتے
ان کی سماعت سے ٹکراتے(27)

قدیم دنیا میں معبد ایسی جگہ تھے جہاں سماعت ہی نہیں بصارت بھی حیرت انگیز تجربے سے گزرتی۔ لوگوں کو مختلف انداز میں اپنا مستقبل نظر آتا۔ وہ مستقبل میں جھانکنا سیکھ لیتے۔ وہ تصوراتی طور پر وہاں پہنچ جاتے جہاں زندگی کی نادیدہ چیزیں ان پر عیاں ہو جاتیں۔ معبد کی پراسرار عمارت اور عبادت کا طریقہ ان تخلیقی کوششوں کا حصہ تھا جو ہستی کا تصور زیادہ بھرپور اور گہرے انداز میں مہیا کرتی تھیں۔ اور یہ سب کچھ انہیں عمل انگیز بناتا۔ انہیں اعتماد، عزم اور قوت عمل عطا کرتا تھا۔ اساطیری داستانوں میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ غیبی طاقتیں ہر مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیتیں۔ کنعانی عقیدے اور معاشرے میں

بعل کو وہی حیثیت حاصل تھی جو میسو پوٹیمیا میں مروک کو حاصل تھی۔ اپنی مذہبی رسوم کی تقریبات میں کو زیفون پر بعل کی تخت نشینی اور اس کی جنگوں کی تمثیل مقدس ڈراموں کی صورت میں پیش کی جاتی۔ بعل کا سالانہ تہوار موسم بہار کی آمد پر منایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ نیا سال شروع ہو جاتا۔ تخت نشینی کی سالانہ تقریب نے زگورت کو بعل کی دائمی میراث کا حصہ بنا دیا تھا۔ ایک ایسی میراث جو امن اور فروانی کی جنت تھی۔ (28)

سالانہ تہوار کے مقدس ڈرامے کا مرکزی کردار بادشاہ ہوتا تھا۔ اسے تخت نشین کیا جاتا۔ اس کا سر فتح کے تیل سے چپڑا ہوا، مشعلوں کی روشنی میں جگمگاتا۔ مشرق قریب کے دیگر بادشاہوں کی طرح زگورت کے بادشاہ کو بھی خدا کا نائب سمجھا جاتا تھا اور اس کے فرائض بہت واضح اور متعین ہوتے۔ ان دنوں ابھی مشرق قریب کے لوگوں میں مذہب کے حوالے سے بڑی بڑی توقعات اور امیدیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ نجات سے مراد غیر فانی ہونا نہیں تھا۔ یہ خدائی صفت تھی اور صرف دیوتاؤں میں پائی جاتی تھی۔ مذہب کے حوالے سے لوگوں کا کام محض یہ تھا کہ زمین پر ایک نفیس اور منظّم زندگی برقرار رکھنے اور دشمن قوتوں کو دور رکھنے کے لئے دیوتاؤں کی مدد کریں۔ بادشاہ کے ضروری فرائض کا ایک حصہ جنگ کرنا تھا۔ شہر کے دشمنوں میں انتشار اور افتراق کی قوتوں کو بھی شامل سمجھا جاتا تھا کیونکہ ارضی وسماوی آفات کی طرح یہ بھی تباہ کن عوامل تھیں لیکن جنگ بہر حال لوگوں کے تحفظ کے لئے شروع کی جاتی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے وقت مشرق قریب کے بادشاہوں کو حلف اٹھانا ہوتا تھا کہ وہ اپنے شہر کے دیوتا کا معبد تعمیر کریں گے اور اسے درست حالت میں رکھنے کے لئے ہمہ وقت توجہ دیں گے۔ اس طرح شہر کی زندگی کا رابطہ آسمانی دنیا سے برقرار رہتا تھا۔ بادشاہ کے دیگر فرائض میں شہر میں آب رسانی کے لئے نہریں تعمیر کرنا اور شہر کو محفوظ بنانے کے لئے قلعہ بندی کرنا شامل تھا۔ کوئی بستی اس وقت تک شہر کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی تھی جب تک دشمنوں سے تحفظ کے لئے اس کے گرد فصیلیں نہ ہوں۔ بابل کے گل گامش کی رزمیہ داستان میں اروک کے لوگوں کو نصیحت کی جاتی تھی کہ وہ شہر کی فصیلوں کی مضبوطی اور ہنرمندی کی تعریف کریں۔

شہر پناہ کی دیوار پر نظر ڈالو
اس کی کگر تانبے کی طرح جھلکتی ہے
اروک کی دیوار پر چڑھو اور چنائی کو جانچو
کیا یہ چنائی پکی اینٹوں سے نہیں ہوئی
کیا سات عارفوں نے اس کی بنیاد نہیں رکھی؟ (29)

بادشاہ گل گامش نے انسانی زندگی کو اعلیٰ تر بنانے کی کوشش کی۔اس نے شہر کو چھوڑ دیا اور دائمی زندگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔وہ اپنی جستجو میں ناکام رہا لیکن شاعر ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ شہر کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہا۔اس نے اروک میں مستقل رہائش رکھ لی۔یہی ایک ایسا مقام تھا جو اس کے لئے موزوں تھا۔

لیکن مشرق قریب کے کسی بادشاہ کو ایک اور فریضہ بھی ادا کرنا ہوتا تھا۔یہ فریضہ قوانین کا نفاذ تھا۔ان قوانین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ آسمانی ہدایات ہیں جو خدا نے براہ راست بادشاہ پر وحی کی صورت میں نازل کی ہیں۔ایک مشہور منقش پتھر پر بابل کے بادشاہ حمورابی کو دکھایا گیا ہے کہ وہ دیوتا شامیش کے سامنے کھڑا اس سے قوانین کی لوح وصول کر رہا ہے۔اپنے قوانین میں حمورابی نے دعویٰ کیا تھا کہ دیوتاؤں نے اس کا تقرر خاص مقصد کے لیے کیا ہے۔

زمین پر انصاف کا بول بالا کرنے کے لئے
شیطان اور برائی کو تباہ کرنے کے لئے
اور اس لئے کہ طاقتور کمزور کو نہ دبا سکے(30)

شہر کو محفوظ و مامون رکھنے کے لئے بادشاہ کا فرض تھا کہ اسے نہ صرف طبعی شکست و ریخت سے بچائے بلکہ اس میں سماجی امن بھی برقرار رکھے۔دشمنوں سے تحفظ کے لئے قلعہ بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی جب تک شہریوں کو استحصال،غربت اور عدم اطمینان سے نہ بچایا جائے۔چنانچہ بادشاہ اپنے عوام کا گڈریا تھا۔حمورابی اپنے ضابطہ قوانین کے دیباچہ میں کہتا ہے:

میں نے اپنے لوگوں کو سازگار ماحول مہیا کیا۔
میں نے انہیں کسی کی دہشت و بربریت کے حوالے نہیں کیا۔
چنانچہ میں ان کا مہربان گڈریا بن گیا
جس کا عصائے شاہی راست بازی ہے
میرا شفیق سایہ سارے شہر پر پھیلا ہوا ہے
میں نے اپنی آغوش میں عکاد اور سومیر کے لوگوں کو لے لیا

وہ میری حفاظت میں خوب پھلے پھولے
میں نے امن کے ساتھ ان پر حکومت کی
میں نے اپنی طاقت سے انہیں تحفظ دیا۔(31)

زگورت میں بھی بادشاہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ بیواؤں اور یتیموں پہ توجہ دے۔(32)
شہر میں عدل وانصاف یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کو بھی یقینی بنانا ہوتا تھا کہ قحط اور خشک سالی نہ آئے اور زمین زرخیز وشاداب رہے۔ دونوں باتیں آسمانی بادشاہت کے لئے ضروری تھیں۔ ایک شہر اس وقت تک پرامن اور محفوظ نہیں ہوسکتا جب تک شہریوں کی فلاح و بہبود کو اولین ترجیح نہ دی جائے۔(32) پورے مشرق قریب میں سماجی انصاف کا یہ نصب العین آسمانی بادشاہت اور مقدس شہر کا بنیادی تصور تھا۔لوگ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ تہذیب کے ثمرات سے مراعات یافتہ اشرافیہ تو آسانی سے فیض یاب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس کی اجارہ داری قائم نہیں ہونی چاہیے۔عدم اطمینان کے شکار کسان کسی بھی وقت نظام تلپٹ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کے امن و مان کو یقینی بنانے کے لئے سماجی انصاف کی جدو جہد کو سر فہرست رکھا جاتا تھا۔

زگورت کی تاریخ میں انصاف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شہر کے ساٹھ ہزار باشندے جن میں سے زیادہ تر محل کے دست نگر تھے۔مضافات کے محض 25 ہزار کسانوں کی اعانت کے محتاج تھے۔ یہ شہر غریبوں کی محنت اور خون پسینے سے تعمیر ہوا تھا۔اس کا شعور بعل کی جنگوں کی داستانوں میں منعکس ہوتا ہے۔تخلیق اور ترتیب دوسروں کی محکومی پر منحصر ہوتی تھی۔ چنانچہ بلآخر نظام ناکام ہوگیا۔تیرھویں صدی قبل مسیح میں معیشت منہدم ہوگئی۔ گاؤں خالی ہو گئے اور شہری ریاستیں اناطولیہ اور جزائر سے آنے والے''سمندری لوگوں'' کے حملوں کی تاب نہ لاسکیں۔ چنانچہ سماجی مساوات کی جدوجہد محض مذہبی فریضہ نہیں معاشی و معاشرتی ضرورت بھی تھی۔ مقدس شہر کی صحت مند زندگی کے لئے اس کی موجودگی ناگزیر تھی۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یروشلم کی تاریخ میں استبدادی حکومتوں نے بعض اوقات اپنے زوال کے بیج خود بوئے تھے۔

کانسی کے دور میں یروشلم کی مذہبی زندگی کے بارے میں ہم براہ راست کوئی علم نہیں رکھتے۔ ماہرین آثار قدیمہ کو نہ تو یبوسی معبدوں کا کوئی سراغ ملا ہے اور نہ ہی ایسی تختیاں ملی ہیں جو کوہ صیہون سے تعلق رکھنے والے مذہب کے بارے میں کسی تحریر یا تذکرے سے تعلق رکھتی ہوں۔ البتہ زگورت سے ملنے والے

کتبوں کے مندرجات اور ان عبرانی بھجنوں میں مماثلت پائی جاتی ہے جو بنی اسرائیل کوہ صیہون پہ عبادت کے دوران گاتے تھے۔ زگورت کی مناجاتوں میں شامل بہت سے جملے ان عبرانی بھجنوں میں بھی نظر آتے ہیں جو کوہ صیہون پر خدا کی تخت نشینی کے سالانہ تہوار کے موقع پر اسرائیلی عبادت گزار گایا کرتے تھے۔ وہ تخلیق کے وقت لیویا تان اور ڈریگن سے جنگ میں اپنے خدا کی کامیابی کے گیت گاتے تھے۔ کوہ صیہون بھی شہر امن کہلاتا تھا۔ اسے مقدس پہاڑ اور خدا کی دائمی میراث بھی کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات صیہون کو زیفون بھی کہا جاتا تھا۔ عبرانی بائبل میں کچھ مقامات پر اسے زیفون ہی کہا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حوری بھی بعل اور اس کے معبد کی داستانیں زیفون پر سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ علما نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یروشلم میں بعل کا مذہب وہی لائے تھے اور اسی مذہب نے بعد میں مقدس شہر کا زگورتی تصور پیش کیا جو کوہ صیہون پر اسرائیلی عقائد میں شامل ہو گیا۔(34)

MAP (نقشہ)

شہری تہذیب چونکہ دیہی زندگی مرہون منت رہی ہے چنانچہ قدیم
مشرق قریب میں مقدس شہر کا نصب العین سماجی انصاف ہوتا تھا۔

مشرق قریب کے قدیم باشندے تحفظ کے متلاشی رہتے تھے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یروشلم اپنی جغرافیائی حیثیت میں اس قابل تھا کہ لوگوں کو وہ تحفظ مہیا کر سکے جس کی انہیں تمنا رہتی تھی۔ یروشلم تیرھویں صدی قبل مسیح کا خلفشار جھیل گیا جب کہ کنعان کے بہت سے کوہستانی شہر ویران ہو گئے۔ بائبل بتاتی ہے کہ صیہون پر یبوسیوں کی شہر پناہ ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ لیکن بارھویں صدی قبل مسیح میں نئے خطرے اور نئے دشمن ابھر آئے۔ کنعان پر مصر کی گرفت ایک بار پھر کمزور ہو گئی۔ حطی سلطنت تباہ ہو گئی جب کہ میسوپوٹیمیا کو طاعون اور قحط نے برباد کر دیا۔ تہذیبوں کی کامیابیاں ایک بار پھر ناقص اور کمزور ثابت ہوئیں۔ کسی نئی جنت کی تلاش میں وسیع پیمانے پر ہجرتیں ہوئیں جب عظیم قوتیں منتشر ہوئیں تو ان کی جگہ لینے کے لئے نئی ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک فلستی ریاست تھی جو کنعان کے جنوبی ساحل پر ابھری۔ ممکن ہے فلستی ان ''سمندری لوگوں'' میں سے ہوں جنہوں نے مصر پر حملہ کیا لیکن ہزیمت اٹھانے کے بعد فرعون کے غلام بننے پر مجبور ہوئے۔ ممکن ہے رعمسیس سوم نے اپنی جگہ فلستیوں کو کنعان پر حکمرانی کرنے کے لئے وہاں

آباد کیا ہو۔ نئے علاقے میں انہوں نے مقامی مذہب اپنا لیا اور پانچ شہروں میں خود کو منظم کر لیا۔ یہ شہری ریاستیں اسقلون، اشدود، عقران، جات اور غزہ تھے۔ جب مصر زیادہ کمزور ہو گیا تو فلستیوں نے خودمختاری حاصل کر لی اور پھر بتدریج کنعان کے غیر رسمی حکمران بن گئے۔ گیارھویں صدی قبل مسیح میں کنعانیوں کو ایک نئے مقامی قوت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوہستانی علاقے میں ایک نئے ریاست وجود میں آ رہی تھی جو کنعان کی سابقہ ریاستوں میں بڑی اور ان سے مختلف تھی۔ اور پھر یبوسی صیہون ایک جارح طاقت کے نرغے میں آ گیا۔ یہ نئے طاقت اسرائیل کی بادشاہت تھی جس نے صیہون کی قسمت کو ہمیشہ کے لئے بدل دیا۔

==========

حوالہ جات

=====

1. Kathleen Kenyon, digging Up Jerusalem (London, 1974), P. 78.

2 ۔ نیویارک ٹائمز۔ 8 ستمبر 1994ء۔

3 ۔ انگریزی میں ٹروپوئین کا ترجمہ ''پنیر بنانے والے'' کیا گیا ہے۔ جوزیفس کے دور میں وادی کا نام غالباً بگڑ چکا تھا۔

4. Benjamin Mazar, The Mountain of the Lord (New Yourk,

1975), pp. 45-46, Gosta W. Ahistrom, The History of Ancient Palestine (Minneapolis, 1993), pp.

5. Mazar, Mountain of the Lord, p. 11.
6. Mircea Eliade, The Sacred and the Profane, trans.
7. Ibid., passim. Also Mircea Eliade, Pateerns in Comparative Religion, trans. Rosemary Sheed (London, 1959), pp. 1-37, 367-88; Mircea Eliade, Images and Symbols: Studies in Religious Symbolism, trans.Philip Mairet (Princeton,1991), pp. 37-56.
8. Eliade, Sacred and the Profane, pp. 50-54, 64.
9. Eliade, Patterns in Comparative Religion, p. 19.
10. Ibid., pp. 99-101; R E Clements, God and Temple (Oxford, 1965), pp. 2-6; Richard J. Clifford, The Cosmic Mountain in Canaan and the Old Testament (Cambridge, Mass., 1972), pp. 4-10.
11. Clifford, Cosmic Mountain, p. 4.
12. Eliade, Scred and the Profane, p. 33.
13. Eliade, Patterns in comparative Religion, pp. 382-85.
14. Ahistrom, History of Ancient Palestine, pp. 248-50.
15. J. B. Ritchard, ed., Ancient Near Eastern Texts Relating to the Old Testament (Princeton, 1959), pp. 483-90.
16. Ahistrom, History of Ancient Palestine, pp. 279-81.
17. Ronald de Vaux, The Early History of Palestine, 2 vols., trans. David Smith (London, 1979), 1:6-7.
18. H. J. Franken, "Jerusalem in the Bronze Age:

3000-1000 BC." In K. J. Asali, ed., Jerusalem in History (New york 1990), p. 39.

19. Kenyon, Digging Up Jerusalem, P. 95.
20. Ibid., p. 100.
21. Pritchard, Ancient Near Eastern Texts, p. 483.
22. Clifford, Cosmic Mountain, pp. 57-59.
23. John C. L. Gibson, Canaanite Myths and Legends (Edinburgh, 1978), p. 66.
24. Ibid., p. 50.
25. Clifford, cosmic Mountain, pp. 57-68; cf. Psalm 47.
26. Ibid., p. 68.
27. Ibid., p. 77.
28. Ibid., p. 72.
29. Epic of Gilgamesh 1: 15-18. See also Jonathan Z. Smith, "Wisdom's Place," in John J. Collins and Michael Fishbane, eds., Death, Ecstasy and Other Worldly Journeys (Albany, 1995), pp. 3-13.
30. Pritchard, Ancient Near Eastern Texts, p. 164.
31. Ibid., p. 178.
32. Gibson, Canaanite Myths, pp. 102-7.
33. John Gray, "Sacral kingship in Ugarit," Ugaritica 6 (19969), pp. 295-98.
34. Clifford, Cosmic Mountain, passim.; Clements, God and Temple, p. 47; Ben C. Ollenburger, Zion, the city of the Great king: A Theological Symbol of the Jerusalem Cult

(Sheffield, 1987), pp. 14-16; Margaret Barker, The Gate of Heaven: The History and Symbolism of the Temple in Jerusalem (London, 1991), p. 64; Hans-Joachim Kraus, Worship in Israel: A Cultic History of the Old Testament (Oxford, 1966),pp. 201-4.

================

بنی اسرائیل

=======

اسرائیلی کون تھے؟ بائبل کا کہنا ہے کہ یہ لوگ میسوپوٹیمیا سے آئے۔ کچھ عرصہ کے لئے کنعان میں آباد ہوئے لیکن 1750 قبل مسیح کے قریب قحط سے پریشان ہو کر ان کے بارہ قبیلے مصر کو ہجرت کر گئے۔ مصر میں آکر وہ خوب پھلے پھولے اور خوشحال ہو گئے لیکن پھر ان پر زوال آ گیا۔ یہاں تک کہ وہ مصریوں کے غلام بن گئے۔ 1250 قبل مسیح میں (حضرت) موسیٰ انہیں مصر سے نکال لائے۔ لیکن اب ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ چنانچہ صحرائے سینا میں خانہ بدوشی اور بیابان نوردی پر مجبور ہو گئے۔ انہیں اپنے خدا، یہواہ کی طرف کنعان کی سرسبز و شاداب ارض موعودہ کو جانا تھا لیکن (حضرت) موسیٰ کی زندگی میں وہ

ارض موعودہ میں داخل ہونے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ (حضرت) موسیٰ کی وفات کے بعد ان کے جانشین، جوشوا (یشوع) کی قیادت میں اسرائیلیوں نے یورش کی اور خداوند کے نام اور تلوار کے زور پر کنعان کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ واقعہ 1200 قبل مسیح کے اردگرد ظہور پذیر ہوا۔ بائبل کا کہنا ہے کہ اس موقع پر زبردست کشت و خون ہوا۔ یشوع نے پہاڑوں، وادیوں، چشموں اور چراگاہوں پر قبضہ کرلیا۔ سب بادشاہوں کو مطیع کیا اور مزاحمت کرنے والے کسی آدمی کو زندہ نہ چھوڑا۔ (1) کنعان کے تمام علاقے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں تقسیم کردیئے گئے۔ لیکن یہوداہ اور بنیامین کو ملنے والے علاقوں کے درمیان ایک شہر اسرائیلیوں کے قبضہ میں نہ آسکا۔ یہ شہر یروشلم تھا اور وہاں یبوسیوں کی حکومت تھی۔ یہوداہ کے بیٹے ان یبوسیوں کو زیر نہ کرسکے اور پھر ان کے ساتھ مل جل کر رہنے لگے۔ (2) کچھ عرصہ بعد یروشلم اسرائیلیوں کا مذہبی مقام بن گیا لیکن ابتدا میں یہ دشمن علاقہ تھا اور بائبل میں پہلی بار اس کا ذکر غیر مبہم انداز میں دشمن شہر کے طور پر ہوتا ہے۔

جدید تحقیق نے ماہرین کو بائبل کے اس تذکرے پر تشکیک میں مبتلا کردیا ہے کہ اسرائیلیوں نے یشوع کی قیادت میں کنعان کو تاراج کرکے رکھ دیا اور کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ ماہرین آثار قدیمہ کو کنعان کے قدیم مقامات سے تباہی کے کچھ شواہد ملے ہیں لیکن ان کا تعلق وثوق کے ساتھ اسرائیل کے حملے سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کوہستانی علاقے میں کسی بیرونی حملے کے آثار نہیں ملتے جو اسرائیلیوں کا محبوب وطن قرار پایا۔ (3) بائبل کے علما بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یشوع کی تسخیر مکمل نہیں تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ نہ تو کنعان کی شہری ریاستوں کو مغلوب کرسکا اور نہ فلستیوں پر کوئی کاری ضرب لگا سکا۔ (4) کتاب یشوع کے ابتدائی بارہ ابواب کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر کارروائی اس چھوٹے سے علاقے میں ہوئی جو بعد میں بنیامین قبیلے کو ملا۔ (5) بائبل سے بھی ہمیں یہی تاثر ملتا ہے کہ یشوع کی تسخیر کوئی بہت بڑا واقعہ نہیں تھا جس نے پورے علاقے کو متاثر کیا۔ لیکن آج بھی ایسے محققین موجود ہیں، خصوصاً امریکہ اور اسرائیل میں جو اس بات کے قائل ہیں کہ بنی اسرائیل نے یلغار کرکے پورے کنعان پر قبضہ کرلیا۔ لیکن جدید تحقیق ثابت کرتی ہے کہ کنعان پر باہر سے آکر اچانک ٹوٹ پڑنے کی بات درست نہیں بلکہ بنی اسرائیل پرامن طریقے سے اور بتدریج کنعانی معاشرے میں نمودار ہوئے۔

یہ حقیقت مسلم ہے کہ تیرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں اسرائیلی، کنعان میں موجود تھے۔ فرعون مرنے پتاح کی کامیاب مہم (1207 ق م) کے یادگاری تصویری اور تحریری تختوں میں فتوحات کے تذکرہ کے ساتھ اسرائیل کا ذکر بھی پہلی مرتبہ تاریخ میں سامنے آتا ہے۔

''اسرائیل بانجھ ہے۔اس کا تخم موجود نہیں''

لیکن یہ اس دور کا اکلوتا تذکرہ ہے جو بائبل سے باہر کہیں ہمیں ملتا ہے۔البتہ ماہرین کا خیال ہے کہ چودھویں صدی قبل مسیح کی مختلف لوحوں اور کندہ عبارتوں میں جن ''ھابیرو'' یا ''آپیرو'' کا تذکرہ ملتا ہے وہ یشوع کے ہبریو (عبرانی) قبائل کے باپ دادا تھے۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ھابیرو۔۔کوئی نسلی گروہ نہیں بلکہ کنعانی معاشرے کا ایک ایسا طبقہ تھے جنہیں اچھوت قرار دے دیا گیا تھا۔شہری ریاستوں سے خارج کر دیئے جانے کے بعد وہ کرائے کے سپاہی بن گئے۔بعض اوقات وہ قزاقی اور رہزنی پر اتر آتے۔ (6) یقیناً انہیں کنعان میں شر پسند قوت سمجھا جاتا تھا۔ایبدی ہپا خود بھی ھابیرو لوگوں کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا تھا۔اسرائیلیوں کو سب سے پہلے بیرو یا ہبریو اس وقت کہا گیا جب وہ مصر میں ایک غیر مقامی گروہ تھے۔ لیکن پورے علاقے میں صرف وہی ''ھابیرو'' نہیں تھے۔

آج مہرین 'اسرائیل' کی پیدائش کو کنعان کے بالائی خطے میں آباد کاروں کی ایک نئی لہر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ نے یروشلم کے شمالی کوہستانی علاقے میں ایک سو کے قریب ایسے دیہات کے کھنڈر دریافت کئے ہیں جن کا زمانہ 1200 قبل مسیح ہے۔تیرھویں صدی قبل مسیح تک اس بنجر علاقے میں انسانی رہائش ممکن نہیں تھی لیکن بارھویں صدی قبل مسیح میں تکنیکی ترقی نے ایسا ممکن کر دکھایا۔یہاں آباد ہونے والوں نے بھیڑ بکریاں اور بیل پال کر اپنی بقا کو ممکن بنالیا۔کھنڈرات سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آباد کار کہیں باہر سے آئے تھے۔ان دیہات کا ثقافتی انداز ،تعمیراتی سامان اور تکنیک وہی ہے جو ساحلی میدانی علاقوں کے کھنڈرات میں ملتا ہے۔چنانچہ ماہریں آثار قدیمہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ آباد کار یقیناً مقامی کنعانی ہی تھے۔(7) چونکہ یہ دور خلفشار اور شہری ریاستوں کے درمیان تصادم کا تھا چنانچہ کچھ لوگوں نے بہتر سمجھا ہوگا کہ پہاڑوں پہ جا کر رہنا شروع کر دیں۔اگرچہ وہاں زندگی بہت مشکل تھی لیکن جنگ وجدل سے محفوظ اور انحطاط زدہ شہروں کی خصوصیت بن چکا تھا۔پہاڑوں پہ آباد ہونے والے کچھ لوگ ''ھابیرو'' اور بقیہ خانہ بدوش ہوں گے۔ جو بدامنی کے دور میں اپنا طرز حیات تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ اجڑنے والے کنعانی شہروں سے ہونے والی یہ ہجرت اسرائیل کا نقطہ آغاز بن گئی ہوگی۔یقیناً یہی بات ہوگی کیونکہ گیارھویں صدی قبل مسیح میں اسرائیل کی سلطنت اسی علاقے میں نمودار ہوئی تھی۔اور اگر یہ مفروضہ واقعی درست ہے تو پھر اسرائیلی، مقامی کنعانی ہی تھے جو پہاڑوں پر جا آباد ہوئے اور پھر اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ایک اور بات بھی ناگزیر محسوس ہوتی ہے کہ ان کا ٹکراؤ دوسرے شہروں سے رہا ہوگا۔انہی جھڑپوں کی کہانیوں نے یشوع اور قضاۃ (بائبل) کی داستانوں کی بنیاد رکھی ہوگی۔

اگر یہ اسرائیلی واقعی کنعانی تھے تو پھر بائبل اس قدر اصرار کے ساتھ کیوں کہتی ہے کہ یہ باہر سے آئے تھے اور آخر کیوں اسرائیلیوں کی ''غیر مقامی'' شناخت ان کے مذہبی عقائد کا حصہ ہے۔ بائبل کی ابتدائی پانچ کتابوں میں اسرائیلیوں کی طرف سے مادر وطن کی تلاش یا ارض موعودہ کی جستجو کا قصہ غالب حقیقت رکھتا ہے یہ تصور بھی غلط ہے کہ خروج کی تمام تر داستان من گھڑت ہے۔ کچھ ھابیرو مقبیناً فرعون کی بیگار سے بھاگ نکلے اور بعد میں پہاڑی علاقوں میں آباد ہونے والے کنعانیوں میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ خود بائبل بھی اشارہ کرتی ہے کہ اسرائیل کے تمام لوگوں نے خروج میں حصہ نہیں لیا تھا(8) لیکن بعد میں مصر سے آنے والوں کا مذہب اور ان کی اساطیر اسرائیل کے نظریہ پر غالب آ گئے۔ مصر کی غلامی سے نجات اور خدائے یہواہ کے خصوصی تحفظ کے تصور نے کنعانیوں کو متاثر کیا ہوگا کیونکہ وہ خود بھی ظالم حکمرانوں کے جبر و استبداد سے جان بچا کر پہاڑوں پر آئے تھے۔ اب وہ جوش و خروش کے ساتھ نئے نظام (کے تجربے) کا حصہ بن رہے تھے۔

کنعان میں ایک بڑی طاقت بننے تک اسرائیلیوں نے اپنی تاریخ لکھنا شروع نہیں کی تھی۔ علما روایتی طور پہ خمسہ موسیٰ (عہد نامہ عتیق کی ابتدائی پانچ کتابوں) کے چار ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ اولین دو مولفین کو J اور E کے نام دیئے جاتے ہیں۔ J سے مراد وہ مولف ہے جس نے خدا کا نام یہواہ (Jehovah) لکھا جب کہ E نے ایلوہیم (Elohim) لکھا۔ ممکن ہے یہ کتابیں دسویں صدی قبل مسیح میں لکھی گئی ہوں تاہم یہ بعد میں یعنی آٹھویں صدی قبل مسیح میں سامنے آئیں۔ عہد نامہ عتیق کی بقیہ کتابیں کتب مشکوک یا اسفار محرفہ اور پادریانہ دستور کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں میں تواریخ، یشوع، قضاۃ، سموئیل اور سلاطین شامل ہیں۔ ان کے مولفین کو '' D '' یعنی The Deuteronomist اور '' P '' یعنی Priestly Writer کہا جاتا ہے۔ P اور D دونوں ہی چھٹی صدی قبل مسیح میں اسرائیلیوں کی بابل کو جلاوطنی کے دوران اور بعد میں فعال رہے۔ جدید تحقیق نے کچھ علما کو تشکیک میں مبتلا کر دیا ہے اور اب سمجھا جا رہا ہے کہ (حضرت) موسیٰ کی پانچوں کتابوں کا مصنف ایک ہی ہے اور یہ چھٹی صدی قبل مسیح میں تحریر کی گئیں۔ ان P اور D کے نکتہ نظر پر ہم چوتھے باب میں بحث کریں گے۔ انہوں نے زیادہ تر سابقہ ماخذوں سے کام لیا لیکن اپنے مذہبی نکتہ نظر کو آگے بڑھایا۔ غالباً چوتھی صدی قبل مسیح کے دوران کرانیکلز (عہد نامہ قدیم کے دو باب) لکھے گئے۔ لیکن مصنف نے اپنے ذرائع کو بھرپور انداز میں استعمال کیا ہے۔ یوں کوئی بھی مصنف ہمارے آج کے معیار کے مطابق تاریخ کو معروضی انداز میں مرتب نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے صرف یہ دکھانے پر اکتفا کیا کہ ان کے اپنے دور کے لوگ ماضی کو کس نظر سے دیکھ

رہے تھے۔

بزرگان اسرائیل، (حضرت) اسحاق اور (حضرت) یعقوب کی کہانیوں کے حوالے سے تو یہ بات بالکل درست ہے کہ یہ بیان کئے جانے کے وقت (اور مقصد) کے ایک ہزار سال بعد لکھی گئیں۔ ہمارے خیال میں یہ تاریخی کہانیاں نہیں بلکہ سوانح اور قصص و روایات ہیں۔ بائبل کے مصنفین کنعان میں انیسویں اور اٹھارویں صدی قبل مسیح کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مثلاً وہ ملک میں مصر کے زبردست اثرات کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ بہرطور بزرگان اسرائیل کی کہانیاں اس لئے اہم ہیں کہ ان کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اسرائیلی کس طرح اپنے الگ وجود اور شناخت کو واضح شکل دینے کی ابتدا کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس دور میں ہو رہا تھا۔ جب J اور E مصروف تحریر تھے۔ اس وقت اسرائیلیوں کا ایمان تھا کہ وہ سب ایک مشترکہ باپ حضرت یعقوب کی اولاد ہیں۔ (حضرت) یعقوب کو نیا نام ''اسرائیل'' دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں ''۔۔۔ وہ جو خدا کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔'' یہ نام خدا کے ساتھ اس کے خصوصی تعلق کی علامت تھا۔ اسرائیل (حضرت یعقوب) کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک قبیلے کا جدامجد بنا۔ یوں اسرائیل کے بارہ قبیلے سامنے آئے۔ پھر اسرائیلی (حضرت) یعقوب کے جدامجد (حضرت) ابراہیم کی طرف دیکھتے ہیں۔ انہیں خدا نے ایک نئی قوم کی تشکیل کے لئے منتخب کیا۔ اسرائیلیوں کا پختہ عقیدہ تھا کہ (حضرت) ابراہیم کنعانی نہیں تھے۔ چنانچہ وہ ان کا نسلی تعلق میسوپوٹیمیا میں تلاش کرتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ 1850 قبل مسیح کے قریب فاران میں خدا (حضرت) ابراہیم پر ظاہر ہوا اور ان سے کہا کہ ''۔۔۔ اپنا ملک، اپنا خاندان اور اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر اس سرزمین کی طرف چلو جو میں تمہیں دکھاؤں گا۔ اور یہ سرزمین کنعان تھی۔۔۔'' (9) لیکن کنعان میں وہ مہاجر کی حیثیت سے ہی رہے۔ انہوں نے وہاں اس وقت تک کوئی زمین نہ خریدی جب تک ان کو بیوی کی تدفین کا مرحلہ درپیش نہ آیا۔ تب انہوں نے حبرون میں میکفیلا کے غار میں زمین کا ایک ٹکڑا خریدا۔

بزرگان اسرائیل کی داستانوں میں سب سے اہم بات مادر وطن کی تلاش ہے۔ (حضرت) ابراہیم علیہ السلام، (حضرت) اسحاق علیہ السلام اور (حضرت) یعقوب علیہ السلام کنعان میں اپنی اجنبی حیثیت پر خاصے حساس پائے جاتے ہیں۔ (10) جب (حضرت) ابراہیمؑ کی آمد کا ذکر ہوتا ہے تو J پڑھنے والوں کو یاد دلاتا ہے کہ ''اس وقت کنعانی اپنی سرزمین پر تھے'' (11) یہ ایک انتہائی اہم نکتہ ہے۔ یروشلم اور ارض مقدس کی تاریخ میں یہودی عیسائی اور مسلمان سبھی اس سرزمین پر اپنی آمد کے وقت دوسروں کو قابض دیکھتے ہیں۔ ان سب کو اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ شہر اور سرزمین ان سے پہلے دوسروں کے

لئے مقدس تھی۔ اب ان کے عہد کا استحکام اس طرز عمل پر منحصر ہوگا جو وہ اپنے پیش روؤں کے ساتھ روا رکھیں گے۔

کنعان میں دوسرے لوگوں کے غلبہ کے بعد منتخب قوم کا تسلط کچھ اسی طرح کی بات ہے کہ خدا پہلے بیٹے کی بجائے دوسرے بیٹے کا انتخاب کرتا ہے۔ (حضرت) ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے ایک (حضرت) اسماعیلؑ جوان کی لونڈی حاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ دوسرے اور چھوٹے بیٹے کا نام (حضرت) اسحاقؑ تھا جو ان کی معمر اور بانجھ بیوی سارہ سے تولد ہوئے۔ خدا نے کہا کہ (حضرت) اسماعیل بھی ایک عظیم قوم کا باپ ہوگا لیکن (حضرت) ابراہیمؑ کا نام (حضرت) اسحاقؑ کی اولاد کے ذریعے ہی آگے چلے گا۔

خدا کے حکم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو کنعان کے مشرق میں ایک صحرا میں چھوڑ آتے ہیں۔ یہاں انکی حفاظت خدا نہ کرتا تو وہ یقیناً ہلاک ہو جاتے۔ لیکن اس مرحلہ پر بائبل کے مصنفین نے ان میں مزید دلچسپی نہیں لی۔ ہم اس کتاب کے گیارھویں باب میں دیکھیں گے کہ صدیوں بعد ایک قوم یروشلم میں داخل ہوتی ہے جو اپنے آپ کو (حضرت) اسماعیل کی اولاد کہتی ہے۔ لیکن ابھی ہم حضرت اسحاق کا ذکر کر رہے ہیں۔ خدا نے پہلے بیٹے کے ہوتے ہوئے دوسرے بیٹے کا انتخاب کیا۔ یہ سلسلہ آگے چلتا ہے اور دوسری نسل میں بھی خدا نے دوسرے بیٹے کو ترجیح دی۔ (حضرت) اسحاقؑ کی بیوی ربیکا نے محسوس کیا کہ اس کے رحم میں جڑواں بچے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ خدا نے اسے بتایا کہ اس کے پیٹ میں دو قومیں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ جب جڑواں بچے پیدا ہوئے تو دوسرا بچہ اپنے بھائی کی ایڑی پکڑے ہوئے دنیا میں آیا۔ چنانچہ اسے یعقوب یعنی ایڑی پکڑنے والا یا دوسرے کی جگہ لینے والا کہا گیا۔ (12) جب یہ جڑواں بچے بالغ ہوئے تو بائبل کے مطابق (حضرت) یعقوبؑ اپنے بوڑھے باپ (حضرت) اسحاقؑ سے چالاکی کے ساتھ برکت لینے میں کامیاب ہوگئے۔ اس پر اصولاً بڑے بھائی یسیعاہ کا حق تھا۔ اور پھر یسیعاہ کو مشرقی میدانوں کی طرف رخصت کر دیا گیا۔ اس مرحلہ پر بھی J اور E مسترد شدہ پرانی رشتہ داری کا دوبارہ کوئی ذکر نہیں کرتے۔ (حضرت) اسماعیل اور (حضرت) حاجرہ کی داستان میں ایک حقیقی درد و گداز اور رقت انگیزی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح پڑھنے والا یسیعاہ کی ابتری پر بھی اس کے لئے ایک ہمدردی محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ جب J اور E عہد نامہ عتیق مرتب کر رہے تھے تو اسرائیلیوں کے سامنے ارض موعودہ پر قبضے کے لئے جنگ جویانہ وطن پرستی تصور تھا۔ حالانکہ اپنی سرزمین پر ایک قوم کی حیثیت سے ان کا استحکام دوسرے لوگوں کے لئے تکلیف دہ اور اخلاقی اعتبار سے پریشان کن تھا۔

یشوع کے علاوہ کسی میں جنگ وجدل کا جذبہ نظر نہیں آتا۔ یشوع نے خدا کے حکم پر کنعان کے

مقامی لوگوں کی تمام قربان گاہیں اور مذہبی نشانات مٹا دیئے۔ بعد میں عشوع، اسرائیلیوں کا ہیرو بن گیا۔ J اور E دونوں ہی دکھاتے ہیں کہ اسرائیل کے بزرگ کنعانیوں کے لئے رواداری کا رویہ رکھتے ہیں اور انکی مذہبی رسومات کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اسرائیلی بزرگوں نے کنعان میں نہ تو اپنے خدا کے احکامات نافض کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی انہوں نے مقامی لوگوں کی قربان گاہوں کو پامال کیا۔ خود (حضرت) ابراہیم، ایل کی عبادت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جو مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق سب سے بڑا دیوتا تھا۔ بعد میں (حضرت) موسیٰ کے خدا یہواہ میں ایل کو مدغم کر دیا۔ خدا جلتی ہوئی جھاڑی میں سے (حضرت) موسیٰ کو خود بتاتا ہے کہ ''۔۔۔ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب پر میں ایل شدئی (خدائے قادر مطلق) کے طور پہ ظاہر ہوا لیکن اپنے یہواہ نام کے ان پر ظاہر نہ ہو۔'' (خروج۔3:6)۔(13) اس دوران کنعان کی سرزمین کو اپنا تقدس بزرگان بنی اسرائیل پر منکشف کرنا پڑا جو پرانے مقامات پر اس بات کے انتظار میں تھے کہ ایل ان پر ظاہر ہو۔

چنانچہ (حضرت) یعقوب بیت ایل کے تقدس سے بے خبر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسی جگہ پر پتھر کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتے ہیں جو بظاہر عام سی تھی۔ لیکن یہ جگہ ایک ماقوم (مقدس مقام) تھی۔ اس رات (حضرت) یعقوب نے خواب میں دیکھا کہ ان کے پہلو میں زمین پر ایک سیڑھی ایستادہ ہے جو آسمان کو چھو رہی ہے۔ یہ ایک کلاسیک رویا تھی جو ہمیں میسو پوٹیمیا کے زگورتوں کی یاد دلاتی ہے۔ سیڑھی کی چوٹی پر (حضرت) ابراہیم کا خدا تھا جس نے (حضرت) یعقوب کو اپنے تحفظ اور مدد کا یقین دلایا۔ بیدار ہونے پر (حضرت) یعقوب خوف سے لرز گئے۔ انہوں نے حیرت اور تعجب سے سوچا۔۔ خدا سچ مچ اس مقام پر موجود ہے اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔۔۔'' اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی جب ایک عام سا قطعہ اراضی ایک ایسا روحانی مقام ثابت ہوا جس نے انسانوں کو الوہی دنیا سے رابطہ مہیا کر دیا۔ ''کتنی پُر جلال ہے یہ جگہ۔۔۔ یہ خدا کے گھر (بیت ایل) سے کم درجہ کا مقام نہیں ہوسکتا۔ یہ جنت کا دروازہ ہے۔'' (14) یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے (حضرت) یعقوب نے اس پتھر کو سیدھا کھڑا کر کے نصب کر دیا جس پر وہ لیٹے ہوئے تھے اور پھر اس پر تیل کا ایک جرعہ انڈیل دیا تاکہ یہ اردگرد کے پتھروں سے الگ اور ممتاز پہچانا جائے۔

اسرائیلیوں کی بعد کی نسلوں نے کنعان کے ان ایستادہ پتھروں کی شدید مذمت کی جو الوہیت یا تقدس کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ J اور E کو (حضرت) یعقوبؑ کے اس متبرک کام میں کوئی برائی یا ناپسندیدہ بات نظر نہیں آتی۔ جب یہ دونوں مصنفین لکھ رہے تھے تو ان دنوں غالبًا اسرائیلی توحید پرست نہیں تھے۔ اگرچہ یہواہ، حضرت موسیٰ کا خدا، ان کا خدا تھا اور بنی اسرائیل کے دانشمندوں کا خیال تھا کہ صرف

اسی کی عبادت کرنا چاہئے لیکن انبیاء اور مورخین کی تحریریں بتاتی ہیں کہ اسرائیلی دوسرے خداؤں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ وہ خدا یا دیوتا جو کنعانیوں کے عقائد کے مطابق ایک عرصہ سے ملک کی زرخیزی کو یقینی بنائے ہوئے تھے اور اس کے مقدس مقامات (باموتھ) پر مل بھی سکتے تھے، انہیں بہت سے اسرائیلیوں کے لئے نظر انداز کرنا یقیناً مشکل سی بات تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ 588 قبل مسیح میں بنوکدنفر کے ہاتھوں تباہی تک یروشلم میں دوسرے خداؤں کی بھی عبادت ہوئی تھی اور اسرائیلی بھی اس عبادت میں شریک ہوتے تھے۔ وہ ایل کی بیوی اور زرخیزی کی دیوی عشیرہ کی پرستش ایل کے معبد میں جا کر کرتے تھے اور بعل دیوتا کی زرخیزی کی رسومات میں بھی حصہ لیتے تھے۔ 597 سے 539 ق م تک بابل میں جلا وطنی کے بعد اسرائیلیوں نے بالآخر فیصلہ کیا کہ یہواہ کو اکلوتا قرار دیا جائے اور کسی دوسرے خدا کی عبادت نہ کی جائے۔ اس کے بعد وہ واقعی ہر قسم کی پاگان (بت) پرستی کے سخت دشمن بن گئے۔ لیکن اولین بائبل نگاروں یعنی J اور E نے اپنے آبا و اجداد کے مذہب کو سامنے رکھتے ہوئے (حضرت) یعقوبؑ کے اس اقدام میں کوئی بری بات محسوس نہ کی کہ انھوں نے بت پرستوں کے ایک مقام پر خدا کو دیکھا اور رویت کے مقام کو نشان زد کر دیا۔

اسرائیلی بزرگانِ دین کے متعدد مذہبی اقدامات جن کا تذکرہ خاص طور پہ J نے کیا ہے وہ بعد کی اسرائیلی نسلوں کے لئے مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً خدا کو انسانی روپ میں پیش کرنا یہودیوں کے ایمان و ایقان کے منافی ہے۔ یہ خدا کی شان میں گستاخی و کفر اور توہینِ ربوبیت ہے۔ لیکن J اسے (حضرت) ابراہیم کے روبرو ایک انسان ہی کے روپ میں لاتا ہے یہ واقعہ یوں ہے۔

> ''(حضرت) ابراہیم حبرون کے قریب مرے میں اپنے خیمہ کے باہر بیٹھے ہیں۔ ان کے پاس تین اجنبی آتے ہیں۔ مخصوص مشرقی انداز میں (حضرت) ابراہیم انہیں بیٹھنے کو کہتے ہیں اور خود ان کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں۔ پھر یہ چاروں آدمی مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران انکشاف ہوتا ہے۔ کہ تین اجنبیوں میں سے ایک خدا اور دوسرے دونوں اس کے فرشتے ہیں۔'' (15)

یہودیوں کو یہ قصہ بہت پسند ہے۔ عیسائیوں کے لئے بھی بہت اہم ہے کہ وہ اسے خدا کی طرف سے تثلیث کا اظہار سمجھتے ہیں۔ مرے کے قصہ کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ واحدنیت۔۔۔ ایک خدا کے تصور کی تائید کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے ایک اہم نکتہ یہ سامنے آیا کہ خدا صرف مقدس مقامات پر ہی ظہور

نہیں کرتا بلکہ انسانی روپ میں اور کہیں بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ واقعہ انسان دوستی کی تلقین کرتا تھا۔ لوگوں کو بتایا گیا کہ انسان کی عزت وتوقیر کی جائے۔ ہم سے جو بھی مرد اور عورت ملے چاہے وہ اجنبی ہو، اس کو احترام دیا جائے کیونکہ انسان خدائی اسرار کے مجسمے ہو سکتے ہیں۔ اسی بات کے پیش نظر (حضرت) ابراہیم تینوں اجنبیوں کی پذیرائی کے لئے بے تاب ہو کر اٹھے اور ان کے آرام و آسائش اور خورونوش کا اہتمام کیا۔ یہ مہربانی خدائی ملاقات کا ذریعہ بن گئی۔

سماجی انصاف اور غریبوں اور کمزوروں پہ توجہ دینا مشرق قریب کے نظریہ تقدیس کا ناگزیر حصہ رہا ہے۔ امن کے مقدس شہر میں سماجی انصاف ایک لازمہ تھا۔ اسرائیلی روایات میں انسانیت کے لئے ابتدا ہی سے ایک گہری تفہیم ملتی ہے۔ ہم اسے (حضرت) ابراہیمؑ اور خدا کے درمیان تعلق، خدا کے حضور خود سپردگی اور منشائے ایزدی کی اس خوفناک داستان میں دیکھ سکتے ہیں جس میں خدا نے (حضرت) ابراہیم کو حکم دیا کہ "۔۔۔ اپنے بیٹے، اپنے اکلوتے بیٹے، جسے تم بہت پیار کرتے ہو، اسے لو اور موریاہ کی سرزمین میں اس کی قربانی دو۔۔۔" (16) (پیدائش 2:22) چونکہ (حضرت) ابراہیم اپنا بڑا بیٹا اسماعیل کھو چکے تھے چنانچہ اب اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ ابراہیم کو ایک عظیم قوم کا باپ بنانے کا خدا کا وعدہ ختم ہو رہا ہے۔ اس صورت حال میں ایمان اور ایفائے عہد الجھن میں پڑ سکتے تھے لیکن (حضرت) ابراہیمؑ خدا کے حکم کی تعمیل پر تیار ہو گئے اور (حضرت) اسحاق کو اس پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جس کے بارے میں خدا نے حکم دیا تھا۔ لیکن جب (حضرت) ابراہیم حضرت اسحاق کے سینے میں چھری اتارنے کے قریب تھے کہ ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ اس نے (حضرت) ابراہیمؑ کو بیٹا قربان کرنے سے روک دیا اور کہا کہ آپ اپنے بیٹے کے بدلے ایک مینڈھے کو قربان کر دیں جو قریب ہی جھاڑیوں میں سینگ پھنسائے کھڑا ہے۔ اس قصہ میں یروشلم کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن چوتھی صدی قبل مسیح میں "موریاہ کی سرزمین" کوہ صیہون سے متصل بتائی جاتی ہے۔ (17) کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کا معبد اسی جگہ پر تعمیر ہوا جہاں (حضرت) ابراہیمؑ کو (حضرت) اسحاقؑ کی قربانی کا پابند بنایا گیا تھا۔ مسلمانوں کا گنبد صخرہ بھی (حضرت) ابراہیمؑ کی اپنے بیٹے کی قربانی کی یاد دلاتا تھا۔ اس قصہ میں ایک اور پیغام بھی تھا۔ یہواہ نے یہ بات سمجھا دی کہ اس کو پیش کی جانے والی قربانیوں میں اب انسانی قربانی نہ شامل کی جائے بلکہ اس کے بدلے کسی جانور کو قربان کر دیا جائے۔ لیکن یہ ممانعت قدیم دنیا میں ہمہ گیر نہیں تھی۔ جانوروں کی قربانی قدیم مذاہب میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ آج ہم اسے بھی مکروہ سمجھتے ہیں لیکن یہ کسی طور بھی جانوروں کے لئے کسی تنفر کا اظہار نہیں تھی۔ مویشی تو قدیم انسانوں کا اثاثہ ہوتے تھے۔ اپنا اثاثہ قربان کرنا خدا کی خوشنودی اور قرب کے حصول کا ذریعہ تھا۔ آج قربانی کو اس تکلیف دہ

مفروضے سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسانی زندگی کا انحصار دوسری مخلوق کو ہلاک کرنے پر رہا ہے۔اس کا ایک لاشعوری تعلق مروک اور بعل کی لڑائیوں پر مشتمل دیو مالا سے بھی ہے۔ابتدائی انسانی زندگی کی بقا جانوروں کے شکار اور پودوں سے وابستہ تھی۔ چنانچہ بعد میں ایک پیچیدہ نفسیاتی طرز عمل مرتب ہوا جس میں احساس جرم، احساس تشکر اور ایک احترام کے ملے جلے جذبات ان جانوروں کے لئے شامل تھے جو خود قربان ہو کر انسانی زندگی کو بقا مہیا کرتے تھے۔یہی ملے جلے جذبات ماقبل تاریخ غاروں میں مصوری کے محرک بنے ہوں گے،لیکن آج ہم نے خود کو اس احساس سے دور کر لیا ہے کہ ہم قصاب کی دکان سے جو صاف ستھرا گوشت خریدتے ہیں وہ ان انواع کا ہے جنھوں نے ہماری خاطر اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ یروشلم میں جانوروں کی قربانی کی رسم اس وقت جاری ہوئی جب انسانوں کو بتایا گیا کہ انسانیت کی تقدیس تقاضا کرتی ہے کہ ایک انسان کو کسی دوسرے کے لئے کسی بھی قیمت پر قربان نہیں کیا جا سکتا چاہے مقصد ومنشا انتہائی اعلیٰ وارفع ہو۔

اپنی کڑی آزمائش کے بعد (حضرت) ابراہیمؑ نے اس مقام کو جہاں (حضرت) اسحاقؑ کی قربانی دی جانی تھی، جو نام دیا، اس کے معنی ہیں ''یہواہ دیکھتا ہے'' لیکن E نے بائبل میں اسے مقامی مقولے کے حوالے سے ''یہواہ یری'' لکھا چنانچہ آج تک یہ کہاوت ہے کہ 'خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا'۔(پیدائش 14:22)(18) مقدس پہاڑ پر، زمین اور آسمان کے درمیان لوگ محسوس کرتے تھے کہ دیوتا انہیں دیکھ سکتے ہیں اور وہ دیوتاؤں کو دیکھ سکتے ہیں۔اس طرح کے مقام دراصل بصارت اور بصیرت کا امتزاج ہوتے تھے۔ یہاں لوگ ایک مختلف انداز میں دیکھنا سیکھتے تھے۔وہ اپنے تصور کی آنکھ کھول کر دنیاوی ماحول سے دور اس ابدی اسرار کو دیکھ سکتے تھے جو کائنات کے قلب میں پایا جاتا تھا۔یروشلم میں کوہ صیہون بنی اسرائیل کے لئے بصارت وبصیرت کا ایک ایسا ہی مقام تھا۔لیکن ان کی ابتدائی تاریخ میں یہ اکلوتا مقدس مقام نہیں تھا۔

جن حالات وواقعات میں بنی اسرائیل نے ایک قوم کی حیثیت سے اپنی روح کو دیکھا، ان میں یروشلم کا کوئی کردار نہیں۔ جب یشوع اور قضاۃ کی کتابیں لکھی گئیں تو اسرائیلوں کے نزدیک یہ شہر بنیادی طور پر ایک اجنبی مقام تھا، ایک ایسا شہر جہاں یبوسیوں کا غلبہ تھا۔ بزرگان بنی اسرائیل اردگرد کے شہروں مثلاً بیت ایل، حبرون، سیکم اور بیئر سبع سے وابستہ تھے لیکن اپنے سفروں کے دوران یروشلم کو کوئی اہمیت دیتے ہوئے نظر نہیں آتے۔البتہ ایک موقع پر (حضرت) ابراہیمؑ شیلم کے بادشاہ اور پروہت ملک صدق سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ ملاقات (حضرت) ابراہیمؑ کی ایک عسکری مہم سے واپسی پر ہوتی ہے۔ملک صدق انہیں

روٹی اور شراب پیش کرتا ہے اور یروشلم کے دیوتا ایل علیون کے نام پر برکت دیتا ہے (19) یہودی روایات سالم یا شیلم کو یروشلم کے طور پر شناخت کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ مذکورہ ملاقات کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ عین راجل (موجودہ بیئر ایوب) کے مقام پر ہوئی۔ (20) یہ وادی حنوم اور درون کا سنگم ہے۔ عین راجل بلا شبہ قدیم یروشلم میں ایک مذہبی مقام تھا اور اسے بادشاہوں کی رسم تاجپوشی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ (21) مقامی روایات کے مطابق ملک صدق یروشلم کا بانی تھا اور اس شہر کے بادشاہوں کو ملک صدق کی اولاد سمجھا جاتا تھا۔ (22) عبرانی مناجاتوں میں یہوداہ کے داؤدی بادشاہوں کو تاج پوشی کے وقت بتایا جاتا تھا کہ۔۔۔ "تم ملک صدق کے قبیلے کے کاہن ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو۔" چنانچہ انہیں وراثت میں یہ قدیم خطاب اور اس کے علاوہ کوہ صیہون پر یبوسی رسومات سر انجام دینے کا اختیار ملتا۔ (23) ملک صدق سے (حضرت) ابراہیمؑ کی ملاقات کا قصہ ممکن ہے شہر کو (حضرت) داؤدؑ کی طرف سے فتح کرنے کے موقع پر بیان کیا گیا ہو، تاکہ اس کے خطاب کا جواز مہیا کیا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (حضرت) داؤدؑ کے اجداد یروشلم کے بانی کی عزت کرتے تھے اور اس سے عزت کرواتے تھے۔ (24) لیکن اس قصہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ (حضرت) ابراہیمؑ شہر کے باشندوں کی میزبانی کا جواب دیتے ہیں اور ملک صدق کو اپنے مال غنیمت کا عشر باج گزاری کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن اسی موقع پر ایک اجنبی دیوتا کی برکت قبول کرتے ہیں۔ اس طرح یہ واقعہ بزرگان بنی اسرائیل کی طرف سے پرانے باشندوں کے لئے احترام اور ان کے رسول کے لئے احترام کی عکاسی کرتا ہے۔

ملک صدق کا دیوتا ایل علیون۔۔ سب سے بڑا خدا کہلاتا تھا۔ یہ خطاب بعد میں یہواہ کو دیا گیا جب وہ یروشلم کا سب سے بڑا خدا بن گیا۔ ایل علیون، کوہ زیفون کے بعل دیوتا کے خطابات میں سے بھی ایک تھا۔ (25) قدیم دنیا کے دیوتا اکثر اوقات ایک دوسرے میں مدغم ہو جایا کرتے تھے۔ اسے دھوکہ دہی یا مصلحت کوشی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ویسے بھی دیوتا اس طرح کی الگ الگ اور ٹھوس ہستیاں نہیں تھے جن کی شخصیات ایک دوسرے کے لئے ناقابل قبول رہتی ہوں۔ دراصل وہ سب ماورائی حقیقت اور تقسیس کی علامتیں تھے۔ چنانچہ جب لوگ کسی نئی جگہ پر آتے تو وہ اپنے دیوتاؤں کو مقامی دیوتاؤں میں مدغم کر دیتے۔ نئے دیوتا اپنے پیشروؤں کی کچھ خوبیوں اور فرائض کے مالک بن جاتے۔ مثلاً اسرائیلیوں کے عقائد کے مطابق (حضرت) موسیٰ کا خدا، یہواہ اور حضرت ابراہیم کا خدا، ایل شدئی ایک ہو گئے تھے۔ اسی طرح جب اسرائیلی یروشلم میں داخل ہوئے تو یہواہ کو بعل ایل علیون میں مدغم کر دیا گیا جس کی عبادت یقینی طور پر کوہ صیہون پر ہوتی تھی۔

یروشلم کا ذکر مصر سے اسرائیلیوں کے خروج کی داستانوں میں کہیں نہیں ملتا۔ حالانکہ خروج اسرائیلیوں کی ارض موعودہ کی طرف پیش رفت کا پہلا مرحلہ ہے۔لیکن خروج کے واقعات کا ذکر جس انداز میں درج ہے اس نے انہیں دیو مالائی بنا دیا ہے۔ یہ جدید مورخ کو کسی طرح مطمئن نہیں کرتا، بنیادی طور پر یہ نجات اور مراجعت وطن کی کہانی ہے جس نے یہودیوں کو ان کی طویل اور المناک تاریخ کے تاریک ترین لمحوں میں زندہ رکھا۔خروج کا قصہ ان عیسائیوں کو بھی حوصلہ دیتا ہے جو جبر و استبداد اور نا انصافی کے خلاف جد و جہد میں مصروف ہیں، لیکن یروشلم اس کہانی میں کہیں سنائی نہیں دیتا۔کوہ صیہون پر آ کر خروج کی روایات اسرائیلیوں کی روحانیت میں زیادہ اہمیت اختیار کر گئیں۔اس سے ملتے جلتے واقعات مشرق قریب کی تخلیق و تصادم کی دیو مالا میں بھی پائے جاتے ہیں۔لیکن صرف اتنے فرق کے ساتھ یہ تخلیق کائنات کے وقت جنم لیتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے بلکہ انسانوں کی دنیا میں نظر آتے ہیں اور پھر جو کچھ وجود میں آتا ہے وہ کائنات نہیں بلکہ ایک قوم ہوتی ہے۔(26) بعل اور مردک کی داستانیں ایک شہر اور ایک معبد کی تعمیر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔اسی طرح خروج کی داستان بھی مادر وطن کی تسخیر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔اس عرصہ میں بنی اسرائیل انتشار و افتراق کی حالت سے نکل کر خدا کی قسم کردہ حقیقت میں داخل ہو جاتے ہیں۔مردک نے سمندری عفریت کی نعش کو پھاڑ کر دنیا تخلیق کی تھی، خروج میں یہواہ بحر قلزم کو پھاڑ کر اپنے لوگوں کو فرار کا راستہ مہیا کرتا ہے تا کہ تعاقب میں آنے والی فرعون کی فوج سے بچ نکلیں۔مردک نے عفریتوں کو فنا کیا تھا، یہواہ نے مصریوں کو غرق کر دیا، جس طرح نئی مخلوق ہمیشہ دوسروں کی تباہی کے نتیجہ میں اپنی بقا حاصل کرتی ہے اسی طرح یروشلم کی تاریخ میں بھی بعد میں یہی کچھ دیکھنے میں آتا ہے۔۔انجام کار بنی اسرائیل سمندر کے منقسم پانی میں سے گزر کر آزادی اور سلامتی میں پہنچ گئے۔مصری غرقاب ہو گئے۔غرقابی ہمیشہ ابتدائی پانیوں کی طرف واپسی کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ابتدائی پانی۔۔۔بنیادی عنصر۔۔۔ماضی کا خاتمہ۔۔۔اور ایک نئی پیدائش۔۔۔(27) یوں پانی غرق کرنے کے علاوہ بحال کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔بحر قلزم سے گزر کر اسرائیلی اپنے خدا، یہواہ کی ایک نئی تخلیق بن گئے۔

اگلے مرحلے میں بنی اسرائیل، مقدس کوہ سینائی کی طرف سفر کرتے ہیں۔(حضرت) موسیٰ علیہ السلام اپنے خدا سے ملنے کے لئے چوٹی پر چڑھتے ہیں اور یہواہ بپھرے ہوئے طوفان کی چنگھاڑوں اور آتش فشاں کی گھن گرج میں وہاں اترتا ہے۔ بقیہ لوگ فاصلے پر رہتے ہیں کیونکہ ناشناس لوگوں کے لئے خدا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔کم از کم یہودی روایات میں تو یہی ہے کہ خدا سے رابطہ صرف اور صرف ہدایت یافتہ اشرافیہ ہی کر سکتی ہے۔کوہ سینا پر یہواہ بنی اسرائیل کو ایک معاہدہ کے تحت باقاعدہ اپنی قوم بنا لیتا ہے۔اس

معاہدہ کی مہر کے طور پر (حضرت) موسیٰؑ کو توریت عطا کی جاتی ہے جس میں دس فرامین درج تھے۔ لیکن یروشلم سے بابل کو جلاوطنی تک توریت اسرائیلیوں کی مذہبی زندگی کی اساس نہ بن سکی۔

ارض موعودہ میں داخل ہونے کی اجازت ملنے سے پہلے بنی اسرائیل کو صحرا میں چالیس سال کی ایک آزمائش سے گزرنا پڑا۔ لیکن یہ کسی بھی طرح روحانی تربیت کا ذریعہ نہ بنی اور بنی اسرائیل نے اس دوران کسی صبر واستقلال اور استقامت کا مظاہرہ نہ کیا۔ بائبل صاف طور پر بتاتی ہے کہ ان برسوں میں لوگ مسلسل یہواہ کے خلاف شکوہ کناں رہے۔ یہاں تک کہ بغاوت پر اتر آئے۔ انہیں اس آسان زندگی کی خواہش تھی جو وہ مصر میں گزار چکے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صحرا کا شامی دیوتا مات بلا کا بھوکا تھا۔ وہ پاتال، موت اور تیرگی کا بھی دیوتا تھا۔ چنانچہ صحرا ایک مہیب علاقہ تھا کیونکہ یہ بھٹکا دیتا تھا اور عفریت بن جاتا تھا۔ عفریت سب کچھ ہڑپ کر جاتا ہے۔ اسرائیلی تصورات میں یہ مکمل ویرانی کا مقام رہا۔ (28) چنانچہ خروج کے دوران پیش آنے والی بیابان نوردی اسرائیلیوں کی یادوں کا مقدس حصہ نہ بن سکی جیسا کہ کچھ علمائے بائبل سمجھتے ہیں۔ انبیاء اور بائبل کے مصنفین اس کا ذکر کر کے کہتے تھے: ''خدا نے ہولناک بیابان میں اسرائیل کو اپنی قوم بنایا۔'' (29) یہ صحرا جس سے بنی اسرائیل کا واسطہ پڑا یقیناً بے آب وگیاہ تھا۔ انسانی رہائش سے بالکل خالی اور کسی ذی روح سے ناآشنا۔ یہ مسلسل پھیلتا ہوا مضافات کی بستیوں اور آبادیوں کو چاٹ جاتا تھا۔ اسرائیلیوں نے اپنی بیابان نوردی کے دوران ایک شہر کی تباہی دیکھی جو صحرا کی دست برد سے وجود سے عدم میں چلا گیا۔ (30) وہاں ایک بار پھر سب کچھ خالی تھا۔ اب وہ اساطیری جانوروں کا مسکن تھا۔ بنی اسرائیل چالیس سال تک ویرانیوں میں بھٹکتے رہے۔ چالیس سال تک۔۔۔ ایک ایسا جملہ تھا جو کسی طویل ترین اور تکلیف دہ عرصہ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ چالیس سال تک اسرائیلیوں کو اس عفریتی سلطنت میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ (31) اور یوں اس سے پہلے کہ ان کا خدا انہیں اپنے گھر واپس لاتا۔۔۔ وہ علامتی انداز میں فنا کی وادی میں اتر گئے۔

خدا نے اس بیابان میں اپنی قوم کو بالکل ہی نہیں چھوڑ دیا تھا۔ دوسری خانہ بدوش قوموں کی طرح بنی اسرائیل کے پاس بھی خدا سے رابطہ کا ایک ذریعہ اور خدا کی موجودگی کی ایک علامت موجود تھی، اس نے انہیں زندہ رکھا۔ جس طرح قدیم آسٹریلوی لوگ ایک مقدس لٹھ اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے تھے، اسی طرح اسرائیلی بھی اپنے ساتھ ''تابوت یہواہ'' اٹھائے پھرتے تھے۔ تابوت یہواہ ایک صندوق تھا جس میں خدا کے ساتھ معاہدے کی الواح یعنی فرامین عشرہ تھے یہ خزینہ تبرکات یروشلم میں آنے کے بعد اسرائیلیوں کے لئے زبردست اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

MAP (نقشہ)

بنی اسرائیل کے خروج کی یاد میں آج بھی یہودی مغربی کنارے کے بیابان میں توریت کی تلاوت کرتے ہیں۔ان کا ایمان ہے کہ اس طرح وہ خدا سے ایک پسندیدہ قوم کی حیثیت سے رابطہ بحال کر لیں گے۔

بائبل میں ''تابوت یہواہ' کا زیادہ تر تذکرہ بعد کے ذرائع سے شامل ہوا ہے چنانچہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس کی اصل شکل وصورت کیا تھی۔ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک نفیس قسم کا صندوق تھا اس کے پہلوؤں پر فرشتوں کی دو طلائی مورتیاں تھیں۔ باہر کی طرف پھیلے ہوئے ان کے پر یہواہ کے تخت کی پشت بناتے تھے۔(32) ہم جانتے ہیں کہ خالی تخت خدا کی مسند کی علامت کے طور پر مختلف اقوام میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ خدا کو اس کے عبادت گزاروں کی طرف سے ایک دعوت ہوتی تھی کہ وہ آئے اور اپنے عبادت گزاروں کے درمیان بیٹھے۔ یہودیوں میں خالی تخت خدا کی مسند کے طور پر ہمیشہ کے لئے ایک ٹھوس علامت بن چکا تھا۔ چنانچہ صحرانوردی کے دوران یہ تخت یہواہ کی موجودگی کی ایک بدیہی علامت تھا جسے ایک گشتی معبد یعنی شامیانے کے معبد میں رکھا جاتا تھا۔عہد نامے کے اس صندوق کو جو یہواہ کا تخت بھی تھا، لاوی قبیلہ کے ارکان اٹھائے رکھتے تھے۔انہیں (حضرت) موسیٰؑ کے بھائی (حضرت) ہارونؑ نے کاہن مقرر کیا تھا۔خود ہارون کاہن اعلی تھے۔ بنی اسرائیل کے لئے یہ صندوق ایک عسکری پالادیم (محافظ) تھا۔ کیونکہ اس کی خدائی قوت، جو انتہائی مہلک ہوسکتی تھی، اسرائیلیوں کو ان کے دشمنوں سے محفوظ رکھتی تھی۔ J ہمیں بتاتا ہے کہ دن چڑھنے پر اسرائیلی جب اپنا سفر شروع کرتے تو یہواہ کی موجودگی کا مظہر ایک بادل تابوت پر چھا جاتا اور (حضرت) موسیٰ کہتے۔۔۔''اٹھ اے خداوند تیرے دشمن پراگندہ ہو جائیں اور جو تجھ سے کینہ رکھتے ہیں وہ تیرے آگے سے بھاگ جائیں۔۔۔'' جب شام ہوتی اور اسرائیلی اپنے خیمے گاڑ دیتے تو حضرت موسیٰ کی آواز بلند ہوتی۔۔۔''اے خداوند۔۔۔ ہزاروں ہزار اسرائیلیوں میں لوٹ کر آجا۔۔۔'' (33) (گنتی 10:36-35)۔۔۔تابوت یہواہ، اسرائیلیوں کو تحفظ کے ایک غلاف میں ملفوف رکھتا اور صحرا کی تاریکی اور بیابانی کو ان کے لئے سکونت کے قابل بنائے رکھتا۔ کیونکہ اس کی موجودگی اسرائیلیوں کو خدا سے مربوط ہونے کا احساس بخشتی رہتی تھی۔

کنعان میں اسرائیلیوں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ہم بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ P کا کہنا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ کوہستانی علاقے میں آباد ہو گئے تو انہوں نے سیلا میں تابوت یہواہ کے لئے ایک مظلہ تیار کیا۔ P کا خیال ہے کہ یہواہ نے کوہ سینا پر (حضرت) موسیٰ کو اس مظلہ (شامیانہ) کی تعمیر کے لئے نہایت واضح قسم کی ہدایات دی تھیں۔ اگر یہ تابوت واقعی ابتدا میں ایک خیمہ میں رکھا گیا تھا جیسا کہ خروج کی داستان میں بتایا گیا ہے تو پھر یہ ایل دیوتا ہی کی تقلید تھی جو خیمہ کے معبد میں رہتا تھا اور قوانین کا ماخذ و منبع تھا۔ وہ جب ایل سباوت (رب الافواج) کی حیثیت سے نمودار ہوا تو طلائی فرشتوں والے تخت پر ہی بیٹھا تھا۔ سموئیل کی کتاب میں لکھا ہے کہ تابوت یہواہ کی سیلا کے ایک روائتی معبد میں رکھا گیا (34) لیکن قرئن بتاتے ہیں کہ اسرائیلی متعدد دوسرے معبدوں میں بھی عبادت کے لئے جاتے تھے۔ یہ معبد دان، بیت ایل، مصفاہ، عفاح اور جبعون میں تھے۔ علاوہ ازیں معبدوں سے باہر ہونے والی عبادتوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ متعدد اسرائیلی یہواہ کے ساتھ ساتھ دوسرے خداؤں کی عبادت اس لئے کرتے تھے کہ یہواہ ابھی تک نووارد دیوتا تھا اور کنعان میں اچھی طرح مقبول نہیں ہوا تھا۔ اسے ابھی تک سنائی، فاران اور شعیر کے جنوبی علاقوں کا خدا سمجھا جاتا تھا۔ جہاں لوگ سمجھتے تھے کہ جب ان کی قوم مشکل میں مبتلا ہوئی تو وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر بادلوں پر سوار ہوا اور اپنی قوم کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔(35)

اسرائیلیوں نے اپنا طریقہ عبادت بھی کچھ ایسا وضع کر لیا تھا جس میں کوہ سینا پر (حضرت) موسیٰ سے خدا کی ملاقات کے وقت کا ماحول اور کیفیت پیدا کی جاتی تھی مثلاً نرسنگھے بجا کر گرج اور کڑک پیدا کرنا۔ لوبان سلگا کر اس کے دھوئیں کے بادل بنانا جو پہاڑ کی چوٹی پر چھا گئے تھے۔ یہی عناصر بعد میں یروشلم کی مذہبی رسوم میں داخل ہو گئے۔ مذہبی تقریب کا یہ ماحول کوہ سینا پر یہواہ کے ظہور کے وقت بننے والے ماحول کی پوری پوری نقالی تھا۔ اس طرح عبادت گزاروں میں خدا کی موجودگی کا احساس پیدا کیا جاتا تھا(36) یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مشرق قریب کے دیگر دیوتاؤں کے برعکس یہواہ پہلا دیوتا تھا جسے متحرک دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ وہ کسی ایک معبد یا مقام سے وابستہ اور صرف اسی تک محدود نہیں تھا۔ اسرائیلی ابھی تک مصریوں سے اپنی نجات کی یاد مناتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ موسم بہار کا جشن اس آخری ضیافت کی یاد میں تبدیل ہو گیا جو مصر میں اسرائیلیوں کو نصیب ہوئی تھی۔ تب موت کا فرشتہ انہیں تو نظر انداز کر گیا لیکن جاتے ہوئے مصریوں کے پہلوٹھی کے بیٹوں کی روحیں قبض کرتا چلا گیا۔ چنانچہ خاندانی ضیافت کی اس تقریب کو عید گزراں کہتے ہیں۔

1030 قبل مسیح کے قریب شمالی کوہستانی ملک کے لوگوں میں اخوت اور یک جہتی کی ایک لہر اٹھی۔ وہ اپنے آپ کو مشترکہ اجداد کی اولاد اور ممتاز قوم سمجھتے تھے۔ تب تک ان پر ''منصفین'' (قاضیوں) یا سرداروں کی حکومت رہی تھی۔ لیکن پھر ان میں دوسری قوموں کی طرح مرکزی بادشاہت قائم کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ بائبل کے آخری منصف ''سموئیل'' اس خیال کا مخالف تھا۔ اس نے اپنی قوم کو بادشاہت میں پائی جانے والی سفا کی اور جبر واستبداد کے بارے میں متنبہ کیا۔ (37) لوگوں کو بتایا کہ ایک بادشاہ کے ہاتھوں رعایا کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اسرائیل کی بادشاہت کا تصور ان کے لئے انتہائی سحر انگیز تھا۔ ویسے بھی وقت کے ساتھ ساتھ اب یہ فطری اور ناگزیر ہو چکا تھا۔ (38) اشور، میسوپوٹیمیا اور مصر کی عظیم طاقتیں گہنا رہی تھیں۔ ان کا خلا پورا کرنے کے لئے چھوٹی ریاستیں مستحکم ہو رہی تھیں۔ ان میں عمون، ادوم اور مواب سرفہرست تھیں۔ اسرائیلیوں نے خود کو جارح مریضوں میں گھرا ہوا پایا۔ یہ جارح قوتیں کنعان کے

MAP (نقشہ)

کوہستانی علاقوں پر جھپٹنے کو تیار رہتی تھیں۔ عمونی اور موابی تو ان کے مشرقی علاقوں میں گھس آئے تھے۔ فلستیوں نے مغرب سے یورش کر دی تھی۔ ایک موقعہ پر تو فلستیوں نے سیلا شہر پر قبضہ کر کے اسے زمین بوس کر دیا تھا۔ وہ ''تابوت یہواہ'' کو جنگی ٹرافی کے طور پر اٹھا لے گئے۔ لیکن اس پالا دیم کی ہلاکت آفرینی سے خوف زدہ ہو کر وہ اسے واپس رکھ گئے۔ اب یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ تابوت یہواہ کو کسی عام معبد یا مندر میں مزید تحفظ میسر نہیں چنانچہ اسرائیلیوں نے اس ہیبت ناک تقدس کو اپنی سرزمین کے سرحدی علاقے قیرط جیرم کے ایک رہائشی مکان میں رکھ دیا۔ (39) علاقے میں موجود سیاسی افراتفری نے اسرائیلیوں کو بالآخر قائل کر دیا کہ انہیں کسی طاقتور بادشاہ کی قیادت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سموئیل نے طویل تذبذب کے بعد فیصلہ کیا کہ قبیلہ بنیامین کے ساؤل کو اسرائیل کا پہلا بادشاہ بنا دیا جائے۔ سموئیل نے اسے بپتسمہ دے دیا۔

ساؤل نے کنعان کے کسی بھی سابق بادشاہ کے برعکس بہت بڑے علاقے پر حکمرانی کی۔ اس نے تمام تر مرکزی کوہستانی علاقے، اردن کے دونوں طرف کے علاقے اور یروشلم کی شہری ریاست کے شمالی علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ یروشلم پر ابھی تک یبوسیوں کی حکمرانی تھی۔ بائبل میں ساؤل ایک المناک کردار ہے جسے اس کے خدا نے چھوڑ دیا۔ اس نے مذہبی معاملات میں اپنی طرف سے نئی باتیں شامل

کرنے کی گستاخی کی تھی۔ وہ معذور کر دینے والے مایوسی کے دوروں کا شکار ہو گیا اور بے بسی کے ساتھ اپنی طاقت زائل ہونے کا تماشہ دیکھتا رہا۔لیکن اس کے انجام سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ساؤل نے اسی شہر کو اپنا دارالحکومت بنا کر بتدریج اپنے مفتوحہ علاقوں کو وسعت دی۔ کوہستانی علاقوں کے لوگ رضا کارانہ طور پر اس کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ بیس سال تک وہ اپنی بادشاہت کو دشمنوں سے بچائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ لیکن پھر ساؤل اور اس کے بیٹے جوناتھن کو فلستیوں نے کوہ جلبوعہ کی لڑائی میں 1010 ق م میں قتل کر دیا۔ ساؤل کی موت کے بعد بائبل کے کئی گیتوں میں اس کی مدح سرائی کی گئی۔

ساؤل اور جوناتھن ہر دل عزیز اور خوبصورت تھے
زندگی اور موت دونوں میں کوئی انہیں الگ نہ کر سکا
وہ عقاب سے زیادہ تیز
اور شیروں سے زیادہ طاقتور تھے(40)

یہ مرثیہ اس کے کسی وفادار پیروکار نے نہیں بلکہ ایک باغی نے کہا تھا۔ جو اس کے دربار سے فرار ہو گیا تھا۔ ساؤل کی سلطنت میں داؤد ایک مراعات یافتہ جنگجو تھا۔ وہ جوناتھن کا گہرا دوست بن گیا تھا۔ ساؤل نے اپنی بیٹی میکل کی شادی اس سے کر دی تھی۔ صرف وہی ایک شخص تھا جو ساؤل کی پریشانیوں میں اس کے لئے راحت واطمینان کا ذریعہ بنتا تھا۔ داؤد کے گیت ساؤل کو تسکین دیتے۔ لیکن بائبل کے مورخین کا کہنا ہے کہ ساؤل، داؤد کی مقبولیت اور وقار کو برداشت نہ کر سکا اور اس سے حسد کرنے لگا۔ چنانچہ داؤد کو اپنی جان بچانے کے لئے فرار ہونا پڑا پہلے تو وہ یروشلم کی ویران جنوبی پہاڑیوں میں ''ھابیرو'' کی حیثیت سے جنگجوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ رہا پھر وہ فلستیوں سے مل گیا جو اسرائیلیوں کے جانی دشمن تھے۔ جب داؤد نے ساؤل کی موت کی خبر سنی تو وہ صقلاج میں اپنے قبیلے یہوداہ کے ساتھ مقیم تھا۔(41) یہ قصبہ اسے اس کے نئے آقا گاتھ کے بادشاہ آکیش نے جاگیر کے طور پر دے دیا تھا۔ اس کا آقا گاتھ کا بادشاہ آکیش تھا۔ بائبل میں داؤد کا کردار متضاد قسم کی صفات کا حامل ہے۔ وہ شاعر، موسیقار، جنگجو، باغی، سازشی، زانی اور دہشت گرد دکھایا گیا ہے۔ ابتدا میں وہ بائبل میں مجسم خیر نظر نہیں آتا، لیکن بعد میں اسے اسرائیل کے مثالی بادشاہ کی حیثیت سے قابل احترام قرار دیا جاتا ہے۔ ساؤل کی موت کے بعد اس کا بیٹا اشبال (بائبل میں اس کا نام اشبوست لکھا ہے) اسرائیل کی شمالی ریاست کا حکمران بنا۔ اس دوران داؤد نے جنوبی ریاست

(یہوداہ) کے غیر گنجان آباد علاقے میں اپنی حکومت قائم کرلی اور حبرون کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔ فلستیوں نے داؤد کی اس مہم جوئی کو یقیناً پسند کیا ہوگا کیوں کہ وہ اپنے اس ''ماتحت'' کے ذریعے کوہستانی علاقے میں اثر ورسوخ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن داؤد دراصل اپنا کھیل، کھیل رہا تھا۔ وہ اپنے عزم وارادے کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

یروشلم میں یبوسی اپنے اردگرد دو حریم بادشاہوں کی موجودگی پر مضطرب ہو رہے تھے۔ ان کے شمال میں اسرائیل کی ریاست تھی جس کا حکمران ساؤل کا بیٹا اشبوست اور جنوب میں یہوداہ کی ریاست تھی جس کا بادشاہ داؤد تھا۔ لیکن اشبوست ایک کمزور حکمران تھا۔ اس کی ریاست اپنے باپ کے مقابلے میں چھوٹی تھی۔ پھر اسے اپنے ایک اہم ترین کمانڈر کی بے وفائی کا دھچکا پہنچا جو اسے چھوڑ کر داؤد سے جا ملا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اشبوست کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے قاتل فرار ہو کر داؤد کے دربار میں پہنچ گئے۔ اب داؤد کا عروج شروع ہو گیا۔ اس نے اشبوست کے قاتلوں کو پھانسی دے کر بڑی ذہانت سے خود کو اس کے قتل سے بری الذمہ قرار دلوالیا۔ ساؤل کی بیٹی میکل کے خاوند کی حیثیت سے داؤد اب اسرائیل کے تخت کا بھی جائز وارث تھا۔ شمالی ریاست کے قبائلی عمائدین جلد ہی داؤد کے دربار میں پہنچ گئے۔ حبرون میں یہواہ کے معبد میں داؤد کے ساتھ معاہدہ کے کے اسے اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت سے بپتسمہ دے دیا۔ داؤد اب اسرائیل اور یہوداہ کی متحدہ ریاستوں کا حکمران تھا۔ لیکن ان ریاستوں کے عین وسط میں یبوسیوں کا شہر یروشلم تھا جسے داؤد اپنا دارالحکومت بنانا چاہتا تھا۔

======================

حوالہ جات

1۔ یشوع 10:40 (یروشلم بائبل (لندن) 1966ء۔

2۔ یشوع 15:63 قضاۃ 1:21

3. Robin Lane fox, The Unauthorized Version: Truth and

Fiction in the Bible (London, 1991), pp. 225-33.

4۔ یشوع 17:11-18 قضاۃ 1:27-36

5. J. Alberto Soggin, A History of Israel from the John Bowden (London 1984), pp. 141-43. Gosta W. Ahistrom, The History of Ancient Palestine (Minneapolis 1993), pp. 34-48.

6. AHLSTROM, Histroy of Ancient Palestine, pp. 234-35, 247-48---Amnon Ben Tor ed; The Archeology of Ancie Israel, Trans. R. Greenberg (New Haven and London, 1992), p. 213

7. G. E. Mendenhall, The Tenth Generation (Baltimore), 1973. N.P. Lemche, Early Israel: Anthropological and Historical Studies of the Israelite Society before the Monarchy (Leiden, 1985). D. C. Hopkins, the High Lands of Canaan (Sheffield, 1985). R. B. Coote and K. W. Whitelam, The Emergence of Early Israel in Jostproca; {ers[ectove (Sjeffoe;d. 1987). James D. Mazrtin, Israel as a Tribal Society. R. E. Clements. The World of Ancient Israel: Sociological, Anthropological and Political H. G. M. Williazm son in Clements, World of Ancient Israel pp. 141-42.

8۔ کنعانی قبائل راکیل اور لیہ کی شناخت یہی تھی۔

9۔ کتاب پیدائش 12:1

10۔ کتاب پیدائش 23:5

11۔ کتاب پیدائش 12:7

12۔ ماہر لسانیات حضرت یعقوبؑ کا نام لفظ عقب (ایڑھی) کے مادے سے ماخوذ دیکھتے ہیں۔ کتاب پیدائش 27:36 میں اس نام کا مطلب ''کسی کو ہٹا کر جگہ لینے والا ہے۔۔۔'' ''یاقوب'' کے معنی ''خدا حفاظت کرے'' ہیں۔

13۔ کتاب خروج 6:3

14۔ کتاب پیدائش 1-28:11

15۔ ایضا" 1-18:1

16۔ ایضا" 22:2

17۔ تواریخ-2 3:1

18۔ پیدائش 22:14

19۔ ایضا" 17:20

20. Harold H. Rowley, Worship in Ancient Israwel: Its froms & Meaning (London 1967), pp. 17-19.

21. Benjamin Mazar, The Mountain of the Lord (New York. 1075), p. 157

22. Flavius josephus, The antiquites of the Jes--- 1:40.

23۔ کتاب زبور 110:4

24. R. E. Clements, God & Temple (Oxford 1965), p. 43

25. Ibid pp. 44-4,

26. Jonathan Z. Smith, Earth & Gods in "Map is not Territory: Studies in The History or Religions (Leidon, 1973), p. 110.

27. Mircea Eliade, Patterns in Comparative Religion (London-1958), pp. 118-226.

28. Smith, Earth & Gods, p. 109.

29۔ کتاب استثنا۔ 32:10

30۔ کتاب یرمیاہ 2:2 کتاب ایوب 38:26 کتاب یسعاہ 34:12

31۔ کتاب یدیعاہ 34:11‘ یرمیاہ 4:25

32۔ استثنا 10:1-8‘ خروج 25: 10-22

33۔ کتاب گنتی۔ 10:35-36

34۔ 1۔سیموئیل 3:3

35۔ تضاۃ 5:4-5‘ استثناء 33:2‘ زبور 68:8

RICHAR J. CLIFORD, The Cosmic Mountain in Canaan & the Old Testament (Cambridge, Mass, 1972) PP-114-23.

36. Clements, God & Temples, pp. 25-28.

37۔ 1۔سیموئیل 7:2, 8:22, 10:11, 27:12

38. Keith W. Whitelem, Israelite Kingship: The Royal Ideology and its Opponents. Clements, World of Ancient Israel, pp. 119-26.

39۔ 1۔سیموئیل 4:1, 11:5, 6:1, 7:1

40۔ 2۔سیموئیل 1:23

41۔ صیقلاج کا اصل مقام تاریکی میں ہے۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ بیئر سبع سے اڑتالیس کلومیٹر دور موجودہ تل الصحارہ کا قدیم نام ہے۔

================

تیسرا باب

شہرِ داؤدؑ

یبوسیوں کو یقین تھا کہ (حضرت) داؤد علیہ السلام کبھی بھی ان کے شہر کو فتح نہیں کر سکیں گے۔ یروشلم ان دنوں کنعان کی شہری ریاستوں میں اگرچہ زیادہ مقدس یا طاقتور تو نہیں تھا لیکن (حضرت) داؤدؑ کی نوخیز بادشاہت کے مقابلے میں بہت پرانا اور اچھی طرح قلعہ بند تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں مشہور ہو چکا تھا کہ یہ ناقابل تسخیر ہے۔ جب (حضرت) داؤدؑ کے سپاہی اوفیل کے نیچے پہنچے تو یبو سیوں نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔۔۔ ''تم کبھی بھی شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہمارے اندھے اور لنگڑے بھی تمہیں روکے رکھیں گے''۔۔۔ (1) غالباً انہوں نے شہر کی دیواروں پر اپنے اندھوں اور لنگڑوں کا گشت بھی کرایا تھا کیونکہ حطی فوج کی روایت تھی کہ وہ دشمنوں کو دراندازی سے روکنے کے لئے ایک انتباہی اور تضحیک آمیز مظاہرہ کیا کرتے تھے۔(2) لیکن (حضرت) داؤدؑ نے مرعوب ہونے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنی فوج میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص سب سے پہلے کسی یبوسی کو مار گرائے گا اسے فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا جائے گا۔ (حضرت) داؤد کے پرانے ساتھی اور زریاہ کے بیٹے یواب نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ وہ جیہوں چشمہ سے شہر میں پانی لانے والی نالی ''وارنز شافٹ'' کے ذریعے شہر میں داخل ہو گیا۔(3) تاریخ ٹھیک طرح سے نہیں بتاتی کہ (حضرت) داؤدؑ نے یروشلم کو کس طرح فتح کیا۔ بائبل کا متن بھی نامکمل اور دھندلا ہے۔ لیکن یہ تسخیر تاریخ ساز تھی اور اس کے اثرات آج بھی ارتعاش پیدا کر رہے ہیں۔ ایک شہر جو تب تک کنعان میں ایک ثانوی حیثیت کا مالک تھا، روایت کے اس دائرے میں پہنچا دیا گیا جو انجام کار تاریخی توحید پرستی ثابت ہوئی۔ اسی تسخیر نے بعد ازاں اسے دنیا کا ایک محترم مقدس اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ متنازعہ شہر بنا دیا۔

(حضرت) داؤد نے 1000 ق م میں جب یروشلم کو فتح کیا تو شخص اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا ہو گا کہ ان کی متحدہ ریاستوں پر مشتمل سلطنت کے وسط میں موجود دشمن یبوسی شہر ان کے زیر نگیں آ گیا ہے جو ان کے پایہ تخت کے لئے انتہائی موزوں ہے۔ اسرائیل اور یہوداہ کا اتحاد بہت کمزور سا تھا۔ شمالی ریاست ابھی تک خود کو الگ وجود سمجھتی تھی۔ اس کے لوگ (حضرت) داؤد کی اطاعت کے بارے میں ملے جلے جذبات رکھتے تھے۔ کچھ لوگ انہیں سازشی سمجھتے تھے اور اطاعت پر تیار نہیں تھے۔ ان حالات میں حبرون

میں بیٹھ کر حکمرانی کرنا، دانشمندی نہیں تھی۔ یروشلم ایک پرانی شہری ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ غیر جانبدار علاقہ تھا۔ اس کا تعلق نہ تو (حضرت) داؤد کی اپنی ریاست یہودا سے تھا اور نہ الحاقی ریاست اسرائیل سے۔ چنانچہ قدیم قبائلی روایات سے آزاد تھا۔ چونکہ (حضرت) داؤد نے اس شہر کو اپنے سپاہیوں کی مدد سے فتح کیا تھا چنانچہ یہ علاقے کی رسم کے مطابق فاتح کی ذاتی جائداد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نیا نام ''ار۔ داؤد'' دیا گیا جس کے معنی ہیں شہر داؤد (4)۔ اب یہ باقاعدہ ایک غیر جانبدار شہر بن گیا جس کا الحاق نہ اسرائیل سے تھا اور نہ یہوداہ سے۔ داؤد اسے اور اس کے مضافات کو اپنی ذاتی شاہی اقلیم کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ اسے جغرافیائی فوقیت بھی حاصل تھی۔ مستحکم قلعہ بند ہونے کے علاوہ حبرون کے برعکس مرکزی مقام پر واقع تھا۔ بلند و بالا کوہستانی علاقے میں ہونے کی وجہ سے سنائی اور نیجیو کے فلستی قبائلیوں اور دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر تشکیل پانے والی نئی بادشاہتوں آمون اور مواب کے ناگہانی حملوں سے بھی محفوظ تھا۔ داؤدؑ نے اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ اپنے نئے دارالحکومت میں (حضرت) داؤد اب مسلسل پھیلتی ہوئی سلطنت کے غیر متنازعہ بادشاہ تھے جو کنعان کے کوہستانی ملک کی سب سے بڑی ریاست بننے والی تھی۔

(حضرت) داؤد کا دارالحکومت کیسا تھا؟ آج کے معیار کے مطابق یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ تقریباً پندرہ ایکڑ پر محیط، علاقے کے دوسرے قصبوں کی طرح ایک قلعے، ایک محل اور سپاہیوں اور شہریوں کے مکانات پر مشتمل چھوٹا سا شہر۔۔۔ اس میں دو ہزار سے زیادہ افراد نہیں رہ سکتے تھے۔ بائبل وضاحت سے نہیں بتاتی کہ داؤد نے شہر کو تسخیر کر لیا لیکن مورخین کا اصرار ہے کہ ''اس نے صیہون کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور پھر وہ شہر پناہ میں رہنے کے لئے چلا گیا۔۔۔'' (5) یشوع کی کتاب میں یروشلم کو یبوسیوں کی ایسی بستی کہا گیا ہے جو صیہون کے قلعہ کے پہلو میں واقع تھی۔ چنانچہ یشوع کی کتاب کے مطابق یہ صیہون سے الگ بستی اور آبادی سمجھی جانی چاہیے۔ (6) اس کا مطلب ہے کہ (حضرت) داؤد نے یبوسی قلعے (یا گڑھی) پر قبضہ کیا تھا جو محض ایک ''ملیٹری کو دیتا'' تھا۔ بائبل یروشلم کے باشندوں کے قتل عام کو کوئی ذکر نہیں کرتی جب کہ یشوع کی کتاب میں بھی ایسا ہی درج ہے، نہ ہی کوئی اس طرح کا اشارہ ملتا ہے کہ یروشلم کے یبوسی باشندوں کو شہر بدر کر کے وہاں یہواہ کے ماننے والوں کو آباد کر دیا گیا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ (حضرت) داؤد کی تسخیر محض ایک ''محلاتی سازش'' تھی جس میں انہوں نے اپنے چند قریبی ساتھیوں کی مدد سے یبوسی بادشاہ کو معزول کر دیا اور شہر اور اس کی آبادی کو محفوظ و مامون رکھا۔ آج ہم ان تمام امکانات کے بارے میں قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں لیکن جیسا کہ ہمارے سامنے آتا ہے۔۔۔ بائبل میں پہلی دفعہ یروشلم کا ذکر پڑھنے کو ملتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ شہر میں یبوسی اور یوداہ قبیلہ کے لوگ شانہ بشانہ رہتے تھے۔

اس طرح (حضرت) داؤد جو فلستیوں اور ایدومیوں کے قتل عام کے لئے مشہور تھے یروشلم کے عادل اور رحمدل فاتح بن کر سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف شہر کے پرانے باشندوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا بلکہ ان کے ساتھ مل کر کام کیا اور انہیں اپنی انتظامیہ میں شامل کیا۔ یشوع نے اگر یروشلم فتح کیا ہوتا تو وہ یبوسیوں کی قربان گاہوں کو مسمار کر دیتا اور ان کے مقدس مقامات کو روند دیتا لیکن تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ (حضرت) داؤد نے مقامی لوگوں کے مذہب میں کوئی مداخلت نہ کی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ یبوسیوں کے مذہبی نظریات اور عقائد کو یروشلم میں یہواہ کی عبادت میں داخل کر دیا گیا۔ J (حضرت) داؤدؑ کو دوسرا (حضرت) ابراہیمؑ قرار دیتا ہے کیونکہ (حضرت) ابراہیمؑ کی اولاد ایک طاقتور قوم بن گئی تھی اور کنعان کی سرزمین اسے وراثت میں مل گئی تھی۔ (7) لیکن (حضرت) داؤد ایک اور وجہ سے بھی (حضرت) ابراہیم کے مشابہہ تھے کہ انہوں نے ملک کے پرانے باشندوں کے مذہب کا احترام کیا۔

شہر داؤد میں یبوسیوں اور اسرائیلیوں کے رسم و رواج کے درمیان ایک مثالی تال میل پیدا ہوا۔ اروناہ جو یبوسیوں کا آخری بادشاہ تھا اسے شہر کی دیواروں کے باہر اور کوہ صیہون کے کناروں پر اپنی مملکت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ (حضرت) داؤد نے پرانی یبوسی انتظامیہ خود سنبھال لی۔ کنعان کی شہری ریاستیں وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اقتصادی امور کی ماہر ہو چکی تھیں لیکن یہوداہ اور اسرائیل کے کوہستانی قبائلیوں کو شہری ریاست چلانے کا نہ تو کوئی تجربہ تھا اور نہ مہارت۔ ان میں سے زیادہ تر غالباً اَن پڑھ تھے۔ چنانچہ دانشمندی اسی بات میں محسوس کی گئی کہ پرانا انتظام بحال رکھا جائے اور اس کے لئے یبوسی حکام کو استعمال کیا جائے۔ صرف اسی طرح ممکن تھا کہ شہر کا انتظام باقاعدگی سے چلتا رہے اور (حضرت) داؤد کو اپنی نئی یبوسی رعایا کا اعتماد حاصل رہے۔ (حضرت) داؤد کا یروشلم میں طرزِ عمل نشاندہی کرتا ہے کہ اسرائیلی ابھی ایسے اقدام کو مذہبی فریضہ نہیں سمجھتے تھے کہ ملک کے پرانے باشندوں سے خود کو الگ تھلگ رکھا جائے۔ بابل کو جلاوطنی کے بعد ایسا کرنا ضروری سمجھا گیا اور اسے اسرائیلیوں کا اصول بنا دیا گیا۔ جب مصریوں نے کنعان پر قبضہ کیا تھا تو شائد انہوں نے یہاں کے لوگوں کو اپنے انتظامی طریقے سکھا دیئے تھے۔ بائبل میں ہم دیکھتے ہیں کہ (حضرت) داؤد اور (حضرت) سلیمان کے دربار بالکل مصریوں جیسے تھے۔ اس میں ایک وزیراعظم، خارجہ امور کا ایک سیکرٹری، داخلی امور کا ایک مسل نویس اور ''بادشاہ کا ایک مصاحب'' ہوتا تھا۔ یوں امرنا دور کا نظام (حضرت) داؤد کے بیٹے (حضرت) سلیمان کے دور تک زیرعمل رہا۔ (حضرت) سلیمان کے کچھ حکام کے نام غیر سامی تھے۔ (8) حضرت داؤد نے تو تقریباً تمام تر یبوسی فوج کو برقرار رکھ کر اپنے ماتحت کر لیا تھا۔ یہ سپاہی بائبل کے مطابق فلیستی اور قریطی تھے۔ (حضرت) داؤد کے

ذاتی محافظ بھی یہی تھے۔ چنانچہ (حضرت) داؤد کے ہاتھوں شہر کی تسخیر کے بعد وہاں بہت معمولی انتشار پیدا ہوا اور اس کا یبوسی تشخص برقرار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نیا نام شہر داؤد زیادہ مقبول نہ ہوا۔ زیادہ تر لوگ اس کے پرانے نام یروشلم اور صیہون کا ہی استعمال کرتے رہے۔

یقیناً شاہی خاندان میں یبوسی خون ہی دوڑ رہا ہوگا کیونکہ (حضرت) داؤد نے ایک یبوسی عورت سے بھی شادی کی تھی۔ بعد میں یہ قانون سختی سے نافذ ہوا کہ اسرائیلی کسی غیر عورت سے شادی نہیں کر سکتا لیکن (حضرت) داؤد اور (حضرت) سلیمان کے ہاں ایسی احتیاط نظر نہیں آتی۔ (حضرت) داؤد نے بنت سبع (اریاہ حطی کی بیوی) کو اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔ اریاہ یبوسی فوج کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔ یاد رہے کہ یبوسی حطیوں کے رشتہ دار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ (حضرت) داؤد نے اریاہ کو مروانے کے لئے اسے عمونیوں کے خلاف لڑائی میں ایک خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ بنت سبع کے لفظی معنی ہیں سات دیوتاؤں کی بیٹی۔ منجی رسم الخط میں اسے ''سبیتی'' لکھا گیا لیکن عبرانی میں یہ شیوا یعنی ''سات'' بن گیا۔(9) یوں (حضرت) داؤد اور بت سبع کے ہاں پیدا ہونے والا بیٹا نیم یبوسی اور نیم اسرائیلی تھا۔ ناتن نبی نے اسے خالص اسرائیلی نام یدیدیاہ (یہواہ کا پیارا) دیا۔ یہ اس بات کی نشاندہی تھی کہ وہ (حضرت) داؤد کا وارث منتخب کر لیا گیا ہے۔ لیکن پھر اس کے والدین نے اس کا نام ''سلیمان'' رکھا۔ سلیمان کی نسبت سلیم یا شیلم سے تھی جو یروشلم کا پرانا دیوتا تھا۔ لیکن مورخ اس کا تعلق عبرانی شیلوم سے جوڑتے ہیں۔ بہر حال سلیمان کا مطلب ہے ''امن و سلامتی کا مرد''۔(10)

یہودی روایات میں اہمیت رکھنے والے دیگر مشہور یروشلمی بھی یبوسی تھے۔ ان میں سے ہی ایک نتن یا ناتن نبی تھے۔(11) بائبل میں تقریباً سبھی انبیاء کے نسلی تعلق کا ذکر موجود ہے لیکن ناتن کا ذکر کسی کنیت یا جدی نام کے بغیر کیا گیا ہے۔ غالباً وہ یبوسی بادشاہ کے مشیر تھے۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ (حضرت) داؤد اور ان کی نئی یبوسی رعایا کے درمیان ایک مفید رابطہ تھے۔ اریاہ کی موت کے بعد ناتن نے (حضرت) داؤد کو بہت سرزنش کی۔ صرف اس لئے نہیں کہ انہوں نے (حضرت) موسیٰ کی شریعت کی خلاف ورزی کی تھی بلکہ اس لئے کی کہ انہوں نے اپنے اختیار کا غیر موزوں استعمال کیا تھا۔ مشرق قریب کی کسی بھی بادشاہت میں اختیارات کے ناموزوں استعمال پر بادشاہ کو قابل گرفت سمجھا جاتا تھا کیونکہ بادشاہ نے عدل و انصاف قائم کرنے کا عہد کر رکھا ہوتا تھا۔ اریاہ کی موت پر (حضرت) داؤد کے یبوسیوں کے ساتھ تعلقات پر بھی برا اثر پڑا ہوگا۔ یروشلم کا کاہن اعظم ''صدوق'' بھی یبوسی ہی ہوگا۔ تاہم یہ بات ماضی میں بہت متنازعہ رہی ہے۔ (12) بعد میں اسرائیل کے تمام کاہنوں کو ثابت کرنا پڑتا تھا کہ وہ صدوق کی اولاد ہیں کیونکہ صدوق یہودی

صداقت کی علامت بن گیا تھا۔لیکن صدوق بہرحال ایک یبوسی نام ہے۔ بعد میں ''مورخ'' اسے ایک مکمل شجرہ دیتا ہے اوراس کا تعلق (حضرت) ہارون سے قائم کرتا ہے،لیکن یہ شجرہ (حضرت) داؤد اور (حضرت) ہارون کے درمیان موجود جدی واسطوں یا کڑیوں سے پانچ کڑیاں لمبا ہے۔(حضرت) داؤد اور (حضرت) ہارون کے درمیانی نسبی تعلق میں پانچ کڑیاں غائب ہیں۔(13) شائد مورخ (بائبل کے تواریخ نگار) نے صدوق کے یبوسی اجداد کو بھی اس شجرہ میں شامل کر دیا تھا۔ایل علیون کے کاہن اعظم کو برطرف کرنے کے لئے مقامی لوگوں کو اجنبی قرار دے دیا گیا۔اور پھر اسرائیلیوں کو مطمئن کرنے کے لئے قدیم کاہن شیلوع کی اولاد میں سے ابیاتر کو صدوق کے ساتھ خدمات سرانجام دینے پر مقرر کیا گیا۔لیکن ابیاتر (حضرت) داؤد کی وفات کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ چنانچہ صدوق ایک بار پھر یروشلم کا اکلوتا کاہن اعظم بن گیا۔لیکن ایک یبوسی کاہن کے ساتھ ایک اسرائیلی کاہن کو بیک وقت مذہبی رسوم ادا کرنے کا موقعہ دینا یقیناً (حضرت) داؤد کی طرف سے یروشلم میں بقائے باہمی کے تصور کو فروغ دینے کا اقدام تھا۔ وہ ایسی روایات قائم کرنا چاہتے تھے جن کے نتیجہ میں ان کی مملکت میں اتحاد پیدا ہو اور مختلف عناصر میں وحدت آجائے۔ (حضرت) داؤد نے بیٹوں میں سے ایک کو بعلیدہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔اس کا مطلب ہے کہ وہ مقامی صیہونی روایات کے لئے تنگ نظر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوہ صیہون پر سرانجام دی جانے والی پرانی یبوسی مذہبی رسوم کو یروشلم میں یہواہ کی رسوم میں مدغم کر دیا گیا تھا۔

حضرت داؤد کے سامنے سب سے پہلا کام عہد نامے کے صندوق (تابوت یہواہ) کو یروشلم منتقل کرنا تھا جو ابھی تک ان کی سلطنت کی مغربی سرحد کی ایک مقام قریت جیرم میں رکھا ہوا تھا۔ یہ اقدام اگرچہ نہایت خطرناک تھا لیکن پوری قوم میں روح پھونکنے والا تھا۔ شمالی ریاست کے لوگ جو ابھی تک (حضرت) داؤد سے مطمئن نہ تھے وہ صندوق کی موجودگی سے مطمئن ہو سکتے تھے۔صندوق سے وابستہ مقدس رسوم شہر کو نئی حیثیت دے سکتی تھیں۔اس طرح حکمرانی کو قانونی حیثیت مل جاتی اور شہر کو مذہبی تقدیس۔ ورنہ یہواہ کی عبادت کرنے والے اسرائیلیوں کے لئے یروشلم کوئی مذہبی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔صندوق کو منتقل کرنے کی (حضرت) داؤد کی پہلی کوشش المناک انجام سے دوچار ہوگئی۔کسی مقدس مقام کا قیام انسانوں کی اپنی مرضی پر منحصر نہیں ہوتا۔مقام کا تقدس ہمیشہ منکشف ہوتا ہے۔ ماضی میں یہواہ ایک حرکت پذیر دیوتا یا خدا کی حیثیت سے سامنے آچکا تھا لیکن اسے کسی بادشاہ کی مرضی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔کوئی بھی مقدس چیز جوہری طور پر بہت خطرناک ہوتی ہے اور صرف ان لوگوں کو اس کے پاس جانا چاہیے جو ضروری احتیاط سے آگاہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب صندوق کو پہلی مرتبہ لے جایا جا رہا تھا تو

دوران سفر ایک خادم عزہ نے اسے رتھ سے گرنے سے بچانے کے لئے اپنا ہاتھ لگا دیا۔ یہ عمل نہایت مہلک ثابت ہوا۔ عزہ وہیں گر کر ہلاک ہو گیا۔ صندوق یہواہ کی موجودگی کی علامت تھا اور اس حادثے سے ظاہر ہو گیا کہ (حضرت) داؤد محض ایک مقدس یادگار کو اپنے شہر میں لے جانے کی کوشش نہیں کر رہے بلکہ ایک طاقتور اور ناقابل تصور قوت کو دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ اگر یہواہ صیہون میں آ کر رہے گا تو صرف اور صرف اپنی مرضی سے اور صرف اس وقت جب وہ صیہون کو اس کام کے لئے منتخب کرلے گا۔

تین ماہ بعد (حضرت) داؤد نے ایک اور کوشش کی۔ اس دفعہ یہواہ نے صندوق کو یروشلم کے علاقہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہوا۔ (حضرت) داؤد علیہ السلام صندوق کے آگے ایک کاہن کی طرح مختصر سوتی لباس میں ناچتے اور جھومتے ہوئے چلتے رہے۔ راستے میں وہ وقفے وقفے سے صندوق کے ملبوس کو روک دیتے اور ایک بھیڑ اور ایک بکری کی قربانی دیتے۔ بلاآخر صندوق اس شامیانے کے معبد میں پہنچا دیا گیا جو جیہون چشمے کے پاس بنایا گیا تھا۔ ایک عظیم الشان تقریب منعقد ہوئی اور خوشی منائی گئی۔ (14) شہر داؤد کو رہائش کے قابل سمجھنے کا شگون یہواہ نے عافیت کے ساتھ صندوق کی منتقلی کی صورت میں دے دیا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ یہواہ نے (حضرت) داؤد کو اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت سے منتخب کرلیا ہے۔ اسرائیلیوں کو یقین ہو گیا کہ یہواہ نے (حضرت) داؤد کو اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت سے منتخب کرلیا ہے۔ (حضرت) داؤد نے فیصلہ کیا کہ یہواہ کے لئے یروشلم میں ایک معبد تعمیر کیا جائے گا۔ جب انہوں نے اپنے ارادے کا اظہار ناتن نبی سے کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔

MAP (نقشہ)

مشرق قریب میں ہر بادشاہ کے لئے یہ بات ہمیشہ ضروری رہی ہے کہ وہ اس خدا کا ایک گھر تعمیر کرے جس پر ان کی اقتدار کا انحصار ہوتا ہے۔ لیکن یہواہ کے ارادے کچھ اور تھے۔ اس نے ناتن نبی کو بتایا کہ "اس نے ہمیشہ ایک خانہ بدوش کی طرح شامیانے میں زندگی گزاری ہے۔ وہ اپنے لئے کوئی گھر نہیں چاہتا۔ اس کے برعکس وہ (حضرت) داؤد کے لئے اور اس کی نسل کے بادشاہوں کے لئے ایک گھر بنائے گا جو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گا۔" (15)

ناتن نبی کو خوف لاحق ہوا کہ یروشلم میں ایل علیون دیوتا کو ہٹا کر وہاں ایک غیر مقامی دیوتا کا معبد تعمیر کرنا (حضرت) داؤد کی طرف سے جلد بازی کا اقدام ہوگا کیونکہ یروشلم ابھی تک ایک یبوسی شہر تھا۔ ممکن ہے (حضرت) داؤد نے شہر کی دیواروں کے باہر جیہون چشمہ کے پاس جو جگہ معبد کے لئے منتخب کی تھی وہ یبوسیوں کے نکتہ نظر سے مناسب نہ تھی یا پھر اسرائیل اور یہودا کے قبائل ہی اس بات کے خلاف تھے کیونکہ وہ یہواہ کی خانہ بدوشی کے عادی ہو چکے تھے اور کنعان کے دوسرے دیوتاؤں کی طرح یہواہ کو کسی ایک مقام پر مستقل طور پر رکھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ہوسکتا ہے لوگ اس ممکنہ طاقت سے خوف زدہ ہو گئے ہوں جو معبد کی تعمیر سے (حضرت) داؤد کو حاصل ہو جاتی۔ لیکن جو بھی سبب تھا نتیجہ یہ نکلا کہ (حضرت) داؤد اپنے خدا کا گھر تعمیر کرنے میں ناکام رہے۔ بائبل کے مصنفین نے شاید اسی لئے یہواہ کی طرف سے معبد کی تعمیر کے خیال کو مسترد کرنے کی داستان شامل کر دی کیونکہ وہ اپنے مثالی بادشاہ کی اس ناکامی سے پریشان تھے۔ مورخ (بائبل کی کتاب تواریخ) کا خیال ہے کہ (حضرت) داؤد کو اس اعلیٰ تر اعزاز سے اس لئے محروم رکھا گیا کیونکہ اس نے بہت زیادہ قتل عام کیا تھا اور اس کی بجائے (حضرت) سلیمان کو اس لئے یہ سعادت نصیب ہوئی کیونکہ وہ ''ایک مرد امن'' تھا۔(16) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم دنیا میں عمارت کو ایک مذہبی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ (حضرت) داؤد نے یروشلم میں متعدد تعمیراتی کام کئے جو ایک بادشاہ کی حیثیت سے ان کے شایان شان تھے۔ انہوں نے بذات خود دیودار کی لکڑی سے ایک محل تعمیر کیا جو لبنان سے لائی گئی تھی۔ انہوں نے ''ملو'' کی مرمت کی جو بائبل کے مصنفین کے لئے ایک معمہ ہے لیکن اس سے مراد غالباً اوفیل کی قدیم مہتابی یا چبوترہ تھا۔ انہوں نے ''داؤد کا مینار'' بھی تعمیر کیا۔ یہ دراصل ایک گڑھی یا چھوٹا قلعہ تھا۔ ملازمین، ہنرمندوں اور سپاہیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر انہوں نے شہر کو وسعت دی اور ایسا کرنے کے لئے ایک سمت کی دیوار بھی توڑ دی گئی۔ لیکن جس طرح (حضرت) موسیٰ نے اپنی قوم کو مصر سے نکالنے کے لئے رہنمائی اور ارض موعودہ کا سفر اختیار لیکن ارض موعودہ کی دہلیز پر انتقال کر گئے اسی طرح (حضرت) داؤد نے یہواہ کی قوم کو یروشلم میں داخل ہونے کے لئے قیادت فراہم کی لیکن انہیں معبد تعمیر کرنے کا موقع نہ مل سکا جو یبوسیوں کے اس شہر کو یہودی دنیا کا مقدس ترین مقام بنانے کا سبب بنا۔

MAP (نقشہ)

عید فسح (عید گزراں) کے موقعہ پر یہودی خاندان مقبوضہ عرب علاقے میں جانا سعادت سمجھتے ہیں۔

اس حوالے سے (حضرت) داؤد کو کم از کم یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اروناہ سے زمین خرید لی۔ وہ غالباً یبوسیوں کا آخری بادشاہ تھا۔ یہ زمین اگرچہ قربان گاہ کے لئے خرید لی گئی لیکن بعد میں اسی پر معبد سلیمانی تعمیر ہوا۔ مصنفین ہمیں بتاتے ہیں کہ (حضرت) داؤد سے ایک غلطی ہوئی۔ انہوں نے مردم شماری کا حکم دے دیا۔ الوگ ہمیشہ ہی اسے ناپسندیدہ اقدام قرار دیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوتا تھا کہ اب بادشاہ نئے ٹیکسوں اور جبری مشقت کا بھی حکم دے گا۔ خدا کو بھی یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے سزا کے طور پر ملک پہ طاعون کی وبا نازل کر دی جس نے صرف تین دنوں میں ستر ہزار آدمی ہلاک کر دیئے۔ (حضرت) داؤد نے دیکھا کہ یہواہ کا فرشتہ اروناہ کے کھلیان میں کوہ صیہون پر کھڑا ہے اور اس نے نیچے شہر کی طرف اپنا بازو پھیلا رکھا ہے۔ (حضرت) داؤد طاعون کی وبا کو روکنے میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ انہوں نے قربان گاہ بنانے کا اعلان کیا۔ (حضرت) داؤد کے دربار میں موجود ایک برگزیدہ شخص نے کہا کہ جس جگہ فرشتہ دکھائی دیا ہے وہاں یہواہ کے لیے قربان گاہ بنائی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور پھر وبا رخصت ہوگئی۔ بائبل کے مصنفین بتاتے ہیں کہ اس بحران کے دوران اروناہ بادشاہ نے (حضرت) داؤد کے ساتھ مل کر بہت کام کیا۔ (حضرت) داؤد کا اروناہ سے زمین خریدنا اس واقعہ سے مشابہ ہے جس میں (حضرت) ابراہیم نے عفرون حطی سے میکفیلہ کا غار خریدا تھا۔ عفرون کی طرح اروناہ بھی اپنی زمین بلا قیمت دینا چاہتا تھا لیکن (حضرت) داؤد جو بڑی آسانی سے اس جگہ پر قبضہ کر سکتے تھے انہوں نے قابل تعریف طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین کے سابقہ مالک کو پوری قیمت ادا کی۔ (17) تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ مذکورہ جگہ پہلے سے یروشلم کے یبوسیوں کا کوئی مقدس مقام ہوگی کیونکہ کنعان میں کھلیانوں کو عام طور پر عوامی اجتماعات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا یا پھر ان میں بعل دیوتا سے منسوب زرخیزی کی مذہبی رسومات سرانجام دی جاتی تھیں۔ اروناہ کا کھلیان چونکہ یروشلم شہر کے دروازے کے پاس اونچی جگہ پر تھا اس لئے یقیناً یہ بھی مذہبی رسومات کے لئے وقف رہا ہوگا۔ (18) لیکن بائبل کے مصنفین اس بات کا ذکر نہیں کرتے۔ شاید اس لئے کہ ان کی نظر میں ایسی زمین مقدس معبد کے لئے موزوں نہیں ہوسکتی جو کافرانہ رسومات کے لئے اتعمال ہوتی رہی تھی۔ اروناہ نے کھلیان کی خریداری کی بات پر کسی برہمی کا اظہار کرنے کی بجائے یہاں مقدس مقام بنانے کے اقدام میں پوری طرح شریک ہونے کی پیش کش کی اور پھر اس نئی قربان گاہ پر پہلی قربانی کے لئے نذرانہ بھی دیا۔ دراصل کسی جگہ کا تقدس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسانی ملکیت یا قبضہ میں شمار کی جاسکے۔ فرشتہ نظر آنا اس بات کی

دلیل تھی کہ یہ جگہ مقدس ہے اور خدا سے تعلق رکھتی ہے اور آنے والی نسلیں جو (حضرت) داؤد اور اروناہ کی اولادیں ہوں گی مل کر یہاں عبادت کیا کریں گی۔

کہا جاتا ہے کہ (حضرت) داؤد نے مجوزہ معبد کے لئے سامان بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ الصور کا بادشاہ حیرم ان کا حلیف تھا۔ دیودار کی لکڑی اور صنوبر کے تیل کے لئے اسے پیغام بھجوایا گیا۔ تواریخ نگار بالخصوص اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ (حضرت) داؤد کے بارے میں کہا جائے کہ انہوں نے معبد کی تعمیر میں خود کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہواہ نے (حضرت) داؤد کو مجوزہ معبد کی تعمیر کے سلسلہ میں پوری تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا جو انہوں نے اپنے بیٹے سلیمان کو بتا دی تھیں۔(19) کیونکہ معبد صرف انہی خطوط پر تعمیر ہوسکتا تھا جن کی نشاندہی خود یہواہ نے اپنے ہاتھ سے لکھے حکم میں کر دی تھی۔(20) ویسے بھی ایک بادشاہ کسی معبد کے لئے اپنی پسند کی جگہ کا انتخاب نہیں کرسکتا تھا۔ اسے صرف اسی مقام پر تعمیر ہونا تھا جسے دنیا کے مراکز میں سے ایک کے طور پر منکشف کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم دنیا کے بادشاہوں نے سابقہ معبدوں کے لئے وہی مقامات منتخب کئے جہاں سے لوگوں کے لئے خدا یا دیوتا سے رابطہ اور رسائی ممکن ہوتی تھی۔ اسی طرح جب کوئی معمار کوئی نیا معبد ڈیزائن کرتا تو یہ اس کی اختراع نہیں بلکہ خدائی رابطے کے مقام کا محض ایک ''سمبل'' ہوتا تھا۔ یونانی زبان سے یہ لفظ اخذ کیا گیا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ دو چیزیں بہم کر دی گئی ہیں۔ قدیم دنیا میں بہم ہونے یا وصال ہونے کا تصور بہت اہم تھا۔ قدیم مذاہب کی بنیاد بھی یہی تھی۔ ایک معبد خدا کے آسمانی گھر کی نقل ہوتا تھا۔ یہی شبیہ آسمانی فن تعمیر اور زمین پر اس کی نقل کے درمیان تعلق پیدا کرتی تھی۔ اور دو کو مخصوص معنوں میں ایک کرتی تھی۔ اسی قریبی مشابہت نے دیوتاؤں کے لئے یہ ممکن بنایا تھا کہ وہ زمینی معبدوں میں بھی اسی طرح رہیں جس طرح وہ آسمانی جگہوں پر رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک معبد کا نقشہ بھی خدا خود مہیا کرتا تھا جیسا کہ (حضرت) داؤد پر منکشف کیا گیا۔ اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ زمین پر خدا کے گھر کے خدوخال اور تزئین و آرائش آسمان پر خدا کے گھر کی پوری پوری نقل ہوں۔

MAP (نقشہ)

لیکن اس سارے معاملے کا ایک سیاسی پہلو بھی تھا۔ صندوق کو یروشلم میں لانے کے بعد (حضرت) داؤد شہر کو بتدریج اپنے مکمل قبضہ وتصرف میں لا رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ اپنے لوگوں کی انتہائی متبرک چیز کو اوفیل کی ترائی میں لائے اور پھر اروناہ کا کھلیان خرید کر وہ کوہ صیہون پر اپنے مجوزہ معبد میں یہواہ کی مستقل تخت نشینی کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ (حضرت) سلیمان کے دور حکومت میں یہواہ یروشلم کا ایل علیون یعنی ایک سب سے بڑا خدا بن گیا۔ یوں (حضرت) داؤد قدم بہ قدم اپنے لئے ایک چھوٹی سی سلطنت تعمیر کر رہے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے فلستیوں کو زیر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انہیں یروشلم کی تسخیر سے پہلے وادی رفائیم میں شکست دے سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا بعد میں کیا۔ کسی مرحلے پر انہوں نے کنعان کی دوسری شہری ریاستوں کو بھی اپنی قلمرو میں داخل کر لیا ہو گیا لیکن بائبل اس کا ذکر نہیں کرتی۔ ان ریاستوں نے باج گذار کی حیثیت قبول کر لی ہوگی۔ آخر میں انہوں نے پڑوسی مملکتوں مواب اور ادوم کو تسخیر کرنے کے علاوہ شام کا کافی علاقہ زیر نگیں کر لیا۔ اسرائیلی (حضرت) داؤد کی سلطنت کو آج تک نہیں بھول سکے کیونکہ پھر وہ کبھی سیاسی طور پر اتنے طاقتور نہیں ہو سکے۔ لیکن (حضرت) داؤد کی سلطنت کا تذکرہ مشرق قریب کے کسی اور ریکارڈ میں نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اسے بنی اسرائیل کے بزرگان دین کی کہانیوں کی طرح محض ایک افسانہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مذہبی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ اسرائیل اور یہوواہ ریاستوں پر مشتمل ایک متحدہ سلطنت حقیقت میں موجود تھی۔ اس دور کے مشرق قریب میں پائی جانے والی سیاسی، اقتصادی اور تجارتی صورت حال کی تفصیلات کا ذکر بائبل کرتی ہے جو (حضرت) داؤد کی سلطنت کو مشکوک بناتی ہیں لیکن مصر اور میسوپوٹیمیا دونوں زوال کا شکار تھے۔ وہ اپنے داخلی مسائل میں اس طرح الجھے ہوئے تھے۔ کہ (حضرت) داؤد کی سلطنت کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ ہی نہیں رہا ہوگا۔ علاوہ ازیں بائبل اس سلطنت کو مثالی نہیں سمجھتی۔ چمکتے دمکتے تذکرے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے کہ یہ قوم خود بری طرح تقسیم تھی۔ اپنے وسائل سے تجاوز کر رہی تھی۔ اور یوں تیزی سے بحران کی طرف گامزن تھی۔

(حضرت) داؤد کو بعد از مرگ ہیرو تو کہا جا سکتا ہے لیکن اپنی زندگی میں وہ زیادہ ہر دل عزیز نہیں تھے۔ ان کے بیٹے ابی سلوم نے ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ چشمہ عین راجل پر اس نے اپنے لئے

ایک یادگار بنائی۔ اس مقام پر یبوسی بادشاہ مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ حبرون میں جا کر اس نے اسرائیل اور یہوداہ کا بادشاہ ہونے کا دعوی کر دیا۔ صورت حال اتنی نازک ہوگئی کہ (حضرت) داؤد کو یروشلم سے نکل کر بغاوت کو دبانا پڑا۔ اس بغاوت کو عومی حمایت بھی حاصل تھی (حضرت) داؤد اپنی اعلی تر عسکری صلاحیت کی بدولت اس خلفشار کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسرائیل اور یہوداہ کی ریاستوں کے درمیان اتحاد بھی بہت ڈھیلا ڈھالا تھا۔ چونکہ (حضرت) داؤد اپنی ریاست یہوداہ کی طرف زیادہ مائل تھے اس لئے اسرائیل کے ساتھ اتحاد ہر وقت ٹوٹنے کے خطرے سے دو چار رہتا تھا۔ ابی سلوم کی شورش کے بعد پوری اسرئیلی ریاست متحدہ سلطنت سے الگ ہوگئی اور (حضرت) داؤد کو ایک بار پھر طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ ان کی زندگی کے آخر لمحوں میں یروشلم میں، یبوسیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان پھوٹ پڑ چکی تھی۔ جب (حضرت) داؤد بستر مرگ پر تھے تو ان کے زندہ بچ رہنے والے بڑے بیٹے ادونیاہ نے عین راجل کے مقام پر خود ہی اپنی تاج پوشی کر لی اور بادشاہ بن بیٹھا۔ حبرون کے کاہن ابی یاتر اور سپہ سالار یوآب نے بھی اس کی حمایت کر دی۔ یبوسی گروہ نے (حضرت) داؤد کی حمایت حاصل کرنے کے بعد جوابی کاروائی کی۔ ناتن، صدوق اور بت سبع نے قریطیوں اور فلیتیوں پر مشتمل پرانی یبوسی فوج کی مدد سے (حضرت) سلیمان کو چشمہ جیحوں کے پاس یہوداہ کے معبد پر بادشاہ بنایا اور ان کی تاجپوشی کے لئے بہت بڑی تقریب منعقد کی۔ ادونیاہ نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے یوآب کے ساتھ پھانسی دے دی گئی۔ جبکہ ابی یاتر کو کاھن کے منصب سے معزول کر دیا گیا۔ جب (حضرت) داؤد کا انتقال ہوا تو یبوسی گروہ یروشلم میں نئے حکمرانوں کی آمد پر اظہار مسرت کر رہا تھا۔

(حضرت) داؤد کے دورِ حکومت میں یروشلم کنعان کی چھوٹی سی شہری ریاست کی بجائے ایک سلطنت کا دارالحکومت بن گیا۔ (حضرت) سلیمانؑ کے دور حکومت میں جو 970 ق م میں شروع ہوا، یروشلم نے علاقائی طاقت کا درجہ حاصل کر لیا اور اس کی سلطنت کے حجم میں دوگنا اضافہ ہوگیا۔ (حضرت) سلیمان کے حرم میں بہت بڑی تعداد میں شہزادیاں تھیں۔ جو حلیف یا ماتحت بادشاہوں کی بیٹیاں تھیں۔ (حضرت) سلیمان نے ایک فرعون کی بیٹی سے شادی کر کے خصوصی شہرت پائی۔ سلطنت کے پاس اب ان گنت رتھوں کی فوج تھی۔ رتھ اس زمانے کا جدید ترین عسکری اور حربی ذریعہ تھا۔ خلیج عقبہ میں ایک بہت بڑا بحری بیڑہ تھا۔ (حضرت) سلیمان، عسکری تاجر بن گئے۔ اور مصر اور صلیقیہ کے ساتھ رتھوں اور گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ بائبل بتاتی ہے کہ سبا (موجودہ یمن) کی ملکہ (حضرت) سلیمان کی دانشمندی کی شہرت سے متاثر ہو کر ان سے ملنے کے لئے آئی۔

یہ کہانی (حضرت) سلیمان کی بادشاہت کی بڑھتی ہوئی اہمیت کی عکاسی کرتی ہے۔ اگر انہوں نے بحر احمر میں تجارت شروع کر دی تھی تو اس سے یقیناً سب کی معیشت متاثر ہوئی ہوگی۔ (حضرت) سلیمان کو افسانوی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی دولت اور دانشمندی دونوں حیرت انگیز حد تک وافر کہی جاتی ہیں۔ انہوں نے ایک لائق بادشاہ کی شہرت پائی جس نے بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کیں۔ انہوں نے ایک عظیم الشان تعمیراتی منصوبہ شروع کیا جس میں پرانے قلعہ بند شہروں حجر، مجدو اور عراد شامل تھے۔

یروشلم (حضرت) سلیمان کے دور میں عروس البلاد اور ان کے عظیم الشان تعمیراتی منصوبے کی بھرپور جھلک بن گیا۔ شہر کو جنوب کی طرف وسعت دیتے ہوئے انہوں نے کوہ صیہون کے کنارے پر ایک شاہی گڑھی تعمیر کی۔ اس مقام پر پہلے اروناہ کی شاہی عمارات تھیں۔ نئی گڑھی یا بالا حصار کا جو نقشہ بائبل بتاتی ہے وہ دسویں صدی ق م کی ان گڑھیوں جیسا تھا جو شام اور میسوپوٹیمیا کی کھدائی کے دوران مختلف مقامات پر دریافت ہو چکی ہیں۔ اس گڑھی میں یہواہ کا ایک معبد اور بادشاہ کے لئے ایک محل تھا۔(21) یہاں کچھ اور عمارتیں بھی بنائی گئی تھیں۔ دیودار کے ستونوں والا ایک مکان جس کا استعمال ہم پر واضح نہیں۔ ایک عمارت خزانے کے لئے، ایک بہت بڑا کمرہ عدالت جس میں (حضرت) سلیمان کا شاندار تخت رکھا تھا جو ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ ان سب کے علاوہ ایک خصوصی محل تھا جو فرعون کی بیٹی کے لئے بنایا گیا تھا۔ (حضرت) سلیمان کی یہ بیوی تمام بیویوں میں ممتاز، معروف اور حسین و جمیل تھی۔

ان تمام عمارتوں میں سے کسی کا بھی اب نام و نشان موجود نہیں۔ معبد جو ان عمارتوں میں سے سب سے زیادہ اہم تھا اس کے بارے میں بھی ہمارا علم صرف بائبل کے متن تک محدود ہے۔ یہ معبد یہواہ کے لئے وقف تھا اور تابوت یہواہ (عہد نامے کا صندوق) اسی میں رکھا گیا تھا۔ مشرق قریب کے معبدوں کے برعکس اس میں کوئی ایسی شبیہ یا صورت نہیں تھی جو معبد کے دیوتا کی موجودگی کا علامتی اظہار ہوتی تھی۔ دراصل کوہ سینا پر جب یہواہ (حضرت) موسیٰ پر ظاہر ہوا تھا تو اس نے ہدایت کر دی تھی کہ اسے انسانی شبیہ میں نہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ یہواہ کے مذہب میں مورتیاں اور بت شمل نہ ہوئے۔ لیکن (حضرت) سلیمان کے تعمیر کردہ معبد میں باقی سب کچھ وہی تھا جو اس دور کے شامی اور کنعانی معبدوں میں ہوتا تھا۔ اسکا طرز تعمیر اور نقشہ بھی شامی اور کنعانی معبدوں جیسا تھا۔ اسی کی تعمیر غالباً الصور کے ہنرمندوں کے ہاتھوں ہوئی اس لئے لگتا ہے کہ یہ شامی شاہی طرز تعمیر کا مخصوص نمونہ تھا۔ (22) عام عبادت گزار معبد کی عمارت مین داخل نہیں ہوتے تھے۔ قربانیاں بیرونی احاطہ میں ہی پیش کی جاتی تھیں۔ عبادت گاہ بذات خود بہت چھوٹی اور تین حصوں پر مشتمل تھی۔ مغربی سمت میں ڈیوڑھی (اولام) اس کے آگے ہیکل اور پھر زینے سے کچھ اوپر دیور

(خانہ اقدس)۔۔یہاں صندوقلو رکھا گیا تھا جو نیلے، قرمزی اور ارغوانی رنگ کے سوتی پردوں سے ڈھکا ہوا تھا۔(23) معبد فرنیچر ظاہر کرتا ہے کہ یروشلم کے یہودی مذہب نے مشرق قریب کے روحانی مزاج کی بھر بھرپور تسکین کا اہتمام کر رکھا تھا۔صندوق کے علاوہ وہاں خروج کی علامت کے طور پر کوئی چیز نہیں تھی۔ بائبل بتاتی ہے کہ ہیکل میں دو بڑے طلائی شمعدان تھے ان کے ساتھ سونے کی ایک میز تھی جس پر نذر کی روٹیاں رکھی جاتی تھی دیوادار کے بنے بخوردان پر سونے کے پترے چڑھے تھے۔کانسی کا بنا ایک سانپ نما عصا بھی تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ (حضرت) موسیٰ اس سے طاعون کے مریضوں کا علاج کیا کرتے تھے۔لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ قدیم یبوسی مذہبی رسم سے تعلق رکھتا تھا۔(24) اولام یعنی ڈیوڑھی کے داخلہ پر کھلے ستون ایستادہ تھے۔دائیں ستون کا نام ''یاکن'' اور بائیں کا بوعز تھا۔(25) کھلے صحن میں پیتل کا ایک مذبح اور ایک بہت بڑا حوض تھا۔اس کے نیچے بیلوں کی بارہ مورتیاں تھیں۔یہ ''یم'' اور ابتدائی سمندر کی علامت تھے۔معبد کی دیواریں اندر اور باہر دونوں طرف نقش ونگار سے مزین تھیں۔ان پر فرشتوں، کھجور کے درختوں اور پھولوں کی تصاویر کندہ تھیں(26) یہ کندہ کاری شامی اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔پیتل کا حوض شام کے بعل دیوتا کی یم۔نہر عفریت سے لڑائی کی یاد دلاتا ہے۔بیل کو زرخیزی اور الوہیت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔جب کہ یاکین اور بوعز نامی ستون کنعان کے کھڑے پتھروں (ماتزیوات) کی نقل تھے۔ بائبل میں عبرانی تقویم کی بجائے کنعانی تقویم کے ذکر کے ساتھ معبد کی تعمیر کی تفصیلات دی گئی ہیں۔کنعانی تقویم کے جس مہینے میں تعمیر شروع ہوئی وہ ''ایتھا تیم'' (ستمبر اکتوبر) تھا۔اسی مہینے میں بعل دیوتا کا موسم خزاں کا ''میلہ'' منعقد ہوتا تھا۔یہ میلہ بعل دیوتا کی ''مات'' پر فتح اور کوہ زیفون پر تخت نشینی کی یاد میں منعقد ہوتا تھا۔ اسرائیلی روایات میں یہ میلہ ''سکوتھ'' (مظلہ) کے نام سے منایا جاتا تھا۔اگر چہ یہ تہوار فصل انگور سے موسوم تھا لیکن بعد میں اسے ''خروج'' کے واقعہ سے منسوب کر دیا گیا۔

معبد سلیمانؑ

MAP (نقشہ)

1۔	دیور	7۔	(تابوت یہواہ (صندوق)
2۔	ہیکل (عبادت گاہ)	8۔	کروبیاں (فرشتوں کے مجسمے)
3۔	اولام (ڈیوڑھی)	9۔	شمع دان
4۔	حجرے	10۔	بخوردان
5۔	یاکن اور بوعز ستون	11۔	بارہ روٹیوں کی میز
6۔	چکردار زینہ		

لیکن معبد بہر طور ''کافرانہ'' شبیہوں سے لبریز ہونے کے باوجود اسرائیل کا انتہائی متبرک مقام تھا۔ کچھ انبیاء اور مصلحین اس بات سے ناخوش تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ واپس اس خالص مذہب کی طرف لوٹ جائیں جو خروج کے بعد انہیں عطا کیا گیا تھا۔ لیکن لوگ راسخ العقیدہ ہو چکے تھے۔ اور جب معبد سلیمانی کو نبوکد نضر نے تاراج کیا تو اسرائیلیوں کی اکثریت سمجھتی تھی کہ ان کی دنیا انجام کو پہنچ گئی ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ زیادہ تر لوگ کنعانی اور شامی دیو مالا کی علامتوں کو تابوت یہواہ اور خروج کے مذہب کے مطابق خیال کرتے تھے۔ دراصل خروج کی کہانیاں بعل دیوتا اور مردوک کی قدیم دیو مالائی کہانیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اگر ہم ''خروج'' کی کہانی کو محض تاریخی واقعہ کی نظر سے دیکھیں تو یہ ''سچا'' واقعہ تھا جب کہ بعل دیوتا کی یم۔ نہر عفریت سے لڑائی محض ایک افسانہ ہے چنانچہ ''جھوٹا'' واقعہ تھا۔ لیکن اگر ہم خروج کے واقعات کے داخلی معنوں کو دیکھیں اور اس کی طاقت کی دائمی حقیقت کو محسوس کریں تو معبد سلیمانی کے صحن میں بنایا گیا حوض نامناسب معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں تاریکی کی قوتوں سے دائمی جنگ اور نجات کے راستے کی بات کرتے ہیں۔ جس طرح یہودی اپنے آپ کو یاد دلاتے رہتے ہیں، کہ ہر نسل کو یہ سمجھنا ہے کہ وہ مصر کی غلامی سے آزاد ہو رہی ہے۔

MAP (نقشہ)

یہودی ربی ہیکل سلیمانی کے قریب عبادت میں مصروف ہیں۔ یہ عبادت گاہ حرم الشریف کے ایک تہہ خانہ میں ہے۔

اسی طرح یم کی موجودگی ایک یاددہانی ہوتی تھی کہ برائی کی قوتوں پر غلبہ پانے کی جدوجہد جاری رہنی چاہئے۔ اس کی علامت کو معبد کی دہلیز کے پاس بنانے کا مقصد بھی یہ تھا کہ برائی کو ختم کرنے کا چیلنج اور کوشش خدا کی منشا ہے۔اسے پورا کرنے کی ضرورت اور تحریک موجود رہنی چاہئے۔

یروشلم کے مذہب، یہواہ سے تعلق رکھنے والے بھجنوں اور مناجاتوں سے پتہ چلتا ہے کہ معبد تصوراتی طور پر کوہ صیہون سے وابستہ تھا۔ جب ''صندوق'' سے ملاتا تھا اور اس کی جڑیں زمین کے نیچے پائی جانے والی دنیا میں بھی اترتی تھیں جسے ابتدائی سمندر کے طور پر پیش کیا گیا۔ کہا جاتا تھا کہ تخلیق کائنات کے وقت صرف سمندر تھا جہاں نیکی اور بدی کی قوتوں میں جنگ ہوتی اور پھر دنیا معروض وجود میں لائی گئی۔ مقدس پہاڑ کی طرح معبد بھی اس حقیقت کی علامت تھا جو کائنات کی زندگی کو برقرار رکھتی ہے۔ (حضرت) یعقوبؑ کے زینے کی طرح یہ اس پل کی نمائندگی کرتا تھا جو عدم کو وجود سے ملاتا تھا اور جس کے بغیر ناپائیدار دنیا برقرار نہیں رہ سکتی۔ چونکہ یہ معبد اس جگہ بنا تھا جہاں فرشتے کی رویت ہوئی تھی چنانچہ عبادت گزاروں کو امید ہوتی تھی کہ یہاں وہ خدا سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ جب وہ مقدس مقام میں داخل ہوتے تو وہ ایک ایسی سمت میں قدم رکھ دیتے، جس کے بارے میں ان کا ایمان تھا کہ وہ انہیں اس دنیا میں لے جاتی ہے جو ان کی موجودہ دنیا کی ہم عصر ہے اور اسے برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کوہ صیہون اپنے اردگرد پائے جانے والے پہاڑوں سے کلی طور پر مختلف تھا۔ چنانچہ اسے ''ھولی' Holy' (کادوش) کہا گیا۔ عبرانی میں اس لفظ کے معنی ہیں مختلف یا ''سب سے الگ''۔ معبد سلیمانی کا نقشہ بھی ایسا ہی بنایا گیا تھا کہ مقدس مقام کے تین درجے تھے۔ سب سے اونچا اور مقدس ترین مقام خانہ اقدس (دیور) تھا جو خدا کی برتری اور ماورائے ادراک ہونے کی علامت تھا۔ چونکہ ہر شخص برتر قوت تک رسائی نہیں رکھتا اس لئے عام لوگوں کو خانہ اقدس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں صرف کاہن اور ربی داخل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ خانہ اقدس خاموش، خالی اور ناقابل رسائی رہتا۔ چونکہ یہ صندوق اور یہواہ کی موجودگی کا احاطہ کئے ہوئے تھا چنانچہ یہ اس حقیقت کا

خاموش گواہ تھا کہ خدا، انسانوں کی دنیا میں داخل ہو سکتا ہے۔ یہ تصور جبلی اور برتر تھا۔

مقدس کوہ صیہون کی چوٹی پر تعمیر ہونے کی وجہ سے معبد یہواہ کے باغ عدن کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔ یہ بات j پیدائش کے باب نمبر دو اور تین میں کرتا ہے۔(27) بڑے بڑے شمعدان ان درختوں کی مثال تھے جن کی شاخیں پھولوں اور باداموں سے لدی رہتی تھیں۔ کھجور کے درختوں اور پھولوں کی شبیہوں کی ہیکل کے دروازوں اور دیواروں پر کندہ کاری اس باغ کی یاد دلاتی تھی جس میں فرشتے ابتدائی زمانے میں چہل قدمی کرتے تھے۔ معبد میں سانپ بھی موجود تھا۔ ممکن ہے j نے یہ سب کچھ (حضرت) سلیمان کے عہد میں لکھا ہو لیکن اگر وہ بعد کے دور سے تعلق رکھتا تھا تب بھی وہ معبد کی روحانیت سے واضح طور پر متاثر دکھائی دیتا ہے۔ جب مردوک نے دنیا تخلیق کی تو اس نے ایک معبد بھی بنایا لیکن j ہمیں بتاتا ہے کہ جب یہواہ نے تخلیق مکمل کر لی تو پھر اس نے ایک باغ آراستہ کیا جہاں وہ شام کے وقت ٹہلتا تھا اور اولین انسانوں (آدم وحوا) سے گفتگو کرتا تھا۔

باغ عدن کی کہانی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے معبد میں عبادت کرنے والے اسرائیلیوں کے لئے خدا کیا چاہتا تھا۔ جس طرح گم گشتہ جنت کی تمام کہانیوں میں موجود ہے؛ عدن ایک ایسی جگہ تھی جہاں بالائی دنیا سے رابطہ بہت آسان تھا۔ عدن بذات خود خدا کا ایک تجربہ تھا۔ j کے مطابق یہ دنیا کی زرخیزی وشادابی کا ایک ذریعہ تھا۔ اس کے عین وسط میں ایک دریا تھا جو باغ سے نکلنے کے بعد چار نہروں میں تقسیم ہو جاتا تھا اور پوری دنیا کو سیراب کرتا تھا۔ ان نہروں میں سے ایک کو جیہون کہا جاتا ہے۔ معبد میں دو بڑے بڑے شمعدان تھے۔ عدن میں دو درخت تھے جو اپنے آپ کو ہر سال نیا جنم دینے کی طاقت رکھنے کی بدولت خدا کی تخلیقی قوت کی علامت تھے۔ عدن اس ابتدائی کلیت کا ایک تجربہ تھا جو دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے مقدس مقامات میں تلاش کرتے ہیں۔ خدا اور انسان تقسیم نہیں تھے بلکہ ایک ہی مقام (باغ عدن) میں رہتے تھے۔ آدم وحوا کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ یوں آدم وحوا ایک ایسے مقام پر تھے جو تمام تضادات اور تمام تفریقات سے بلند تر تھا۔ یہ ایک ایسی وحدت ہے جو ہمارے تجربے سے دور اور ہماری ناپائیدار دنیا میں ناقابل تصور ہے۔ البتہ ہم اسے اپنی داخلی بصیرت اور وجدان کے توسط سے کبھی کبھار دیکھ سکتے ہیں۔ ہم آہنگی اور یک جہتی کی یہ ایک ایسی تصوراتی دنیا ہے جسے تمام مذاہب کے لوگ تخلیق آدم کا مقصد سمجھتے ہیں۔ آدم وحوا سے جب لغزش ہوئی تو وہ اس دنیا (یا جنت) سے محروم ہو گئے۔ انہیں خدا کے تصور (موجودگی) سے خارج اور باغ عدن سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ جب عبادت گذار معبد سلیمانی میں داخل ہوتے تو اس کے ماحول میں موجود باغ عدن کی مشابہت اور شبیہیں انہیں تصوراتی طور

پر واپس باغ عدن یا یہواہ کے باغ میں لے جاتیں اور وہ۔۔۔ چاہے لمحاتی کیفیت ہی سہی۔۔۔ اس جنت میں خود کو محسوس کرنے لگتے جوان سے چھن چکی تھی۔ یہ احساس اس جدائی کے زخم کو مندمل کر دیتا جو مذہبی جستجو کی بنیاد ہے۔ مذہب انسان کو یہ جدائی ختم کرنے اور جنت میں واپس پہنچ جانے کا راستہ دکھاتا ہے۔ معبد سلیمانی کا ماحول وہاں پہ رکھی چیزیں اور عبادت سب مل کر عبادت گزاروں کے اس روحانی سفر کو ممکن بناتے جو وحدت کی طرف لیجاتا ہے اور وحدت اس حقیقت اعلیٰ سے الگ کچھ اور نہیں جسے ہم خدا کہتے ہیں۔

یہی تصورات بابل کے مینار کی داستان میں پائے جاتے ہیں۔ یہ داستان بھی ایک مستقل نوعیت کے مقدس مقام کی تخلیق پر مشتمل ہے۔ مقدس مقام کی بشارت کا انتظار کرنے کی بجائے لوگ ازخود پیش رفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔۔۔ آؤ ہم خود ہی ایک شہر اور ایک مینار تعمیر کریں جس کی چوٹی آسمان کو چھوتی ہو۔'' آسمان کی طرح بلند و بالا ہونے کی کوشش ایک قابل فخر اور ذاتی عظمت و ترقی کا اقدام ہے۔ اس طرح کے اقدامات کرنے والے لوگ اپنے لیے اپنا نام تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نتیجہ پھوٹ، تقسیم اور تفریق کی صورت میں نکلتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں کو ان کی گستاخیوں کی سزا دینے کے لئے انہیں پوری طرح گڈ مڈ کر دیتا ہے پھر وہ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام کو بابل کہا گیا کیونکہ خدا نے وہاں ساری دنیا کی زبان کو بے ترتیب یا گڈ مڈ (بل) کر دیا۔ (28) J کی کہانی میں بابل اور اس کے زگورتوں کے لئے ایک گہری دشمنی جھلکتی ہے۔ دیوتاؤں کا دروازہ (بادعیلانی) اجنبیت، بے آہنگی اور انتشار کی وہ علامت بن گیا جو دنیاوی زندگی کی بدترین شکل ہوتی ہے۔ صیہون میں جس کے معنی ''امن (شیلم) اور مفاہمت کا شہر'' ہیں عبادت گزاروں کے لیے ایک مختلف تجربہ ہوتا تھا۔ یہاں اسرائیل کے لوگوں کو اس مقدس پہاڑ پر مذہبی اجتماع کرنے کا موقعہ ملتا تھا جسے خدا نے خود اپنی میراث قرار دیا۔ بابل کے لوگ اس لئے انتشار و افتراق کے شکار ہو گئے کہ انہوں نے مصنوعی طور پر کسی مقام کو مقدس بنانے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ خدا کی خوشنودی کی بجائے انسانی خواہشوں اور ہوس اقتدار کی تسکین کے لئے کیا گیا۔

کوہ صیہون پر حضرت سلیمان کے تعمیر کردہ معبد نے زائرین اور عبادت گزاروں کو خدا کی موجودگی کا احساس دیا۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ بہت سے لوگوں کو وہاں خدا کی رویت کی امید تھی۔ بابل کے لوگوں کے برعکس جنہوں نے دنیا میں انتشار پیدا کیا، اسرائیلیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہواہ کے معبد میں داخل ہو کر خود کو پرسکون محسوس کرتی۔ خدا کی علامت و نشانی کے طور پر یہ معبد دنیا کی زرخیزی اور امن و سکون کا ذریعہ تھا۔ (29) اور مشرق قریب کے دوسرے ملکوں کی طرح اس کا تقدس اس جدوجہد کا اٹوٹ حصہ تھا۔ جسے آج ہم ''سماجی انصاف'' کہتے ہیں۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ کیونکہ اب انہوں نے اپنی بادشاہت

قائم کر لی تھی۔ اسرائیل اور یہوداہ کے لوگوں نے مقدس بادشاہت کا مقامی تصور اپنا لیا تھا۔ لیکن یہ بادشاہ یہوداہ کا ''مسیحا'' تھا۔ اس کا برکت یافتہ ۔۔۔ خدا کے مقدس پہاڑ پر بادشاہ کی تاجپوشی کے دن ۔۔۔ خدا نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔(30) اس کا محل معبد کے ساتھ اور اس کی کرسی عدالت ۔۔۔ یہواہ کے تخت یعنی خانہ اقدس (دیور) کے پہلو میں تھی۔ بائبل کے گیت اور مناجاتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ ۔۔۔ بادشاہ کا فریضہ غریبوں کا تحفظ، ضرورت مند بچوں کی کفالت اور ظالموں کی سرکوبی تھا۔(31) اگر یہ انصاف قائم ہوتا ہے تو ریاست میں ہم آہنگی، امن اور زرخیزی جنم لیتی ہے۔(32) ایسی صورت میں یہواہ انہیں تحفظ مہیا کرتا ہے۔ جو قدیم دنیا کی سب سے بڑی اور مسلسل ضرورت تھی۔ صیہون چونکہ اب یہواہ کی میراث تھا اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے خدا کی حفاظت میں چلا گیا۔(33) لیکن صیہون میں اگر انصاف نہیں ہوگا تو پھر کوئی تحفظ اور کوئی ''شلیم'' بھی نہیں ہوگا۔

یہ نصب العین یروشلم کے مذہبی گیت میں بار بار آنے والے تین لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثبت(Misphat) زیدیک Tzedek اور شلیم Shalom ۔(34) مشبت ایک قانونی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں فیصلہ یا عدالت کی رائے لیکن اس سے مراد کوہ صیہون پر یہواہ کی عادلانہ حکمرانی بھی ہے۔ جب تابوت یہواہ کو خانہ اقدس میں پہنچایا گیا تو یہ ایک طرح سے کوہ صیہون پر یہواہ کی تخت نشینی تھی۔ چنانچہ اب وہ یروشلم کا حقیقی بادشاہ تھا۔ زمین کا بادشاہ انسانوں میں اپنی موجودگی کی وجہ سے۔ بادشاہ کا فرض زیدیک کا نفاذ تھا۔ کنعان میں زیدیک (عدل وانصاف) سورج دیوتا کی صفت تھی۔ جو پوشیدہ گناہوں کو منظر عام پر لاتا تھا۔ مظلوموں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو ختم کرتا تھا اور ایک منصف کی حیثیت سے دنیا پر نظر رکھتا تھا۔ جب یہواہ کی تخت نشینی صیہون پر ہوگئی تو یہ صفت اس سے بھی منسوب ہوگئی۔ اسے دیکھنا ہوتا تھا کہ کیا اس کی سلطنت میں انصاف ہو رہا ہے۔ کیا غریب اور کمزور کو تحفظ مل رہا ہے۔ اور کیا طاقتور کہیں ظلم تو نہیں کر رہا؟ صرف اسی صورت میں صیہون شلیم کا شہر بن سکتا تھا۔ شلیم ایک ایسی کیفیت تھی جس سے مراد ''امن'' تھا لیکن اس لفظ کے حقیقی معنی کلیت یا تکمیل تھے۔ ایک ایسی کلیت یا تکمیل جو مقدس مقامات پر لوگ چاہتے یا ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ شلیم میں فلاح و بہبود، زرخیزی، امن وسلامتی، ہم آہنگی اور جنگ میں فتح ۔۔۔ سب کچھ شامل تھا۔ شلیم کی موجودگی، اجنبیت، غیریت اور عداوت کی نفی تھی جو زمین پر انسانی ابتری کا سبب بنتی ہیں۔ یروشلم اس وقت تک شلیم کا مقدس شہر نہیں بن سکتا تھا جب تک اس میں زیدیک یعنی عدل وانصاف نہ ہو۔ لیکن اسرائیلی اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ وہ یروشلم کی تقدیس اور عظمت کا شور تو مچاتے ہیں۔ اس کی پاکیزگی کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں گے لیکن بنیادی شرط کو بھول

جاتے ہیں۔ پیغمبروں نے انہیں بار بار یاد دلایا کہ اگر وہ عدل وانصاف کا دامن چھوڑ دیں گے تو ناگزیر طور پر شیلم سے محروم ہو جائیں گے۔

صیہون پہ معبد بنا کر اور اس میں یہواہ کی تخت نشینی کر کے حضرت سلیمان نے کنعانی اصطلاح میں ''خاندان داؤدؑ'' کی سلطنت کے نام پر باقاعدہ زمین پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہواہ اب یروشلم کا حکمران تھا اور بنی اسرائیل چونکہ اس کی قوم تھے اس لئے زمین ان کی ہوگئی۔ کوہ زیفون پر بعل دیوتا کے محل نے اردگرد کے علاقے کو اپنی میراث بنالیا تھا۔ اب صیہون کا تعلق یہواہ سے تھا۔ صیہون اس کی دائمی میراث بن گیا۔ معبد اور یہواہ کی تخت نشینی (حضرت) سلیمان کے اس دعوی کی بنیاد بنی کہ یروشلم داؤد کے خاندان کی دائمی میراث ہے۔ معبد کی تعمیر، تسخیر کا ایک اقدام اور خدا کی پشت پناہی کے ساتھ ارض موعودہ پر قبضہ کا ایک ذریعہ تھی۔ مقدس عمارت اس بات کا اعلان تھی کہ اسرائیلیوں کی خانہ بدوشی کے دن ختم ہو گئے ہیں اور متحدہ سلطنت کے لوگ بالاخر اپنے گھر میں آگئے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ پر منظم کرلیا ہے جہاں وہ خدا کیساتھ قریبی رابطہ میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

لیکن حضرت سلیمان کو انجام کار مایوس کن قرار دیا گیا۔ توریت کی پانچویں کتاب کا مصنف انہیں ایک صنم پرست قرار دیتا ہے۔ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان نے یروشلم میں اپنی غیر ملکی بیویوں کے دیوتاؤں کے معبد بنائے۔ وہ خود بھی اپنے پڑوسی علاقوں کے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ جن میں صیدا کی دیوی عشتارت، عمون کے دیوتا ملکوم اور مواب کے دیوتا کیموش شامل تھے۔ یروشلم کے مشرق کی پہاڑیوں میں ملکوم اور کیموش کی قربان گاہیں بھی بنائی گئی تھیں۔ (35) یہ سب کچھ بت پرستی کی وجہ سے تھا۔ D کا کہنا ہے کہ اسرائیل اور یہوداہ کی متحدہ مملکت حضرت سلیمان کی وفات کے بعد ٹوٹ گئی۔ لیکن D اس کا ذکر مختلف مفہوم میں کرتا ہے چھٹی صدی قبل مسیح کے بعد اسرائیلی خالصتاً توحید پرست بن رہے تھے۔ اب ان کا عقیدہ وایمان یہ تھا کہ یہواہ ہی اصل اور اکیلا خدا ہے یہی سچ ہے اور تمام دیوی دیوتا جھوٹ ہیں۔ لیکن حضرت سلیمان اور ان کی رعایا ابھی اس عقیدے کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ بائبل کے علما کہتے ہیں کہ اگر چہ معبد سلیمانی کافروں کے بتوں سے بھرا پڑا تھا اور یروشلم میں دوسرے دیوتاؤں کے معبد بھی بنائے گئے تھے لیکن یہ سب کچھ اپنی غیر ملکی بیویوں کے لئے حضرت سلیمان کی رواداری کا اظہار تھا۔ ان باتوں سے یہواہ کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اب بھی صیہون کا بادشاہ تھا اور چھوٹے خداؤں پر بالا دستی رکھتا تھا۔ مذہبی گیتوں میں دیوتاؤں کی الوہی مجلس کا صدر نشین قرار دیا جاتا تھا۔

اگر حضرت سلیمان ناکام ہو گئے تھے تو اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ زیدیک پر عمل پیرا نہیں ہو سکے

تھے۔ان کی مملکت کی معیشت کمزور تھی۔سلطنتیں اس وقت تحلیل ہو جاتی ہیں جب اپنے وسائل سے تجاوز کر جاتی ہیں۔یہی کچھ حضرت سلیمان کے دور میں ہوا۔حضرت سلیمان کے مبینہ خزانوں کے باوجود اصراف بے جا کی کیفیت تھی۔الصور کے بادشاہ حیرم سے قیمتی سامان تعمیرات خریدا گیا اور پھر اس کا قرض ادا نہ کیا جا سکا۔چنانچہ مغربی گلیلی میں بیس قصبے اس کے حوالے کرنا پڑے۔اپنی طاقتور فوج کے باوجود (حضرت) سلیمان ان علاقوں پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکے جو انہیں اپنے والد حضرت داؤد سے وراثت میں ملے تھے۔پہلے ادوم اور پھر دمشق کی ریاستیں آزاد ہو گئیں۔لیکن سب سے زیادہ سنگین بات مملکت میں عدم اطمینان اور بدعنوانی تھی۔حضرت داؤد نے اپنی ریاست یہوداہ کو زیادہ نوازا تھا چنانچہ اسرائیل کی ریاست متحدہ مملکت سے اپنی وابستگی کے لئے پر جوش نہیں رہی تھی۔حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس صورت حال کو پیش نظر نہ رکھا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انوں نے بھی اسرائیلی ریاست کا استحصال کیا۔اسے برابر کا حصہ دار بنانے کی بجائے مفتوحہ علاقہ سمجھ لیا۔انہوں نے مملکت کے شمالی علاقہ کو 12 انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا۔ان میں سے ہر ایک سال میں ایک مہینہ کے لئے دربار کے اخراجات اور بیگار کے لئے افرادی قوت مہیا کرنے کی پابند تھی۔اس کے برعکس جنوبی علاقہ جو یہوداہ ریاست پر مشتمل تھا اس کے لئے اس طرح کو کوئی حکم نہیں تھا۔متحدہ مملکت کے لوگ ویسے بھی بیکار سے ناخوش تھے۔(36) جبری بھرتی قدیم دنیا میں زندگی کی ایک حقیقت تھی۔حضرت داؤد نے بھی جبری بھرتی نافذ کر رکھی تھی اور کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔لیکن جبری مشقت مختلف بات تھی۔حضرت سلیمان کو اپنے بڑے بڑے تعمیراتی منصوبوں کے لئے وسیع تر افرادی قوت کی ضرورت تھی۔اس سے معیشت کو دو طرح سے نقصان پہنچا۔لوگوں کی بہت بڑی تعداد پیداواری کاموں سے نکل گئی اور تعمیراتی کام بذات خود غیر پیداواری تھے۔دیہات اور قصبے جن میں ملک کی دولت پیدا ہوتی ہے، جبری مشقت کے لئے جانے والے مردوں کی وجہ سے خالی ہو جاتے تھے۔معیشت بری طرح متاثر ہوتی جبری مشقت سماجی اور اقتصادی ناانصافی کی بدترین شکل ہوتی ہے چنانچہ یہ زیدیک کی نفی تھی۔تاریخ بتاتی ہے کہ اسرائیل کے تیس ہزار افراد کو بیگار پر مجبور کیا گیا لیکن یہوداہ کے لوگوں کے لئے کسی جبری مشقت کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔(37) اسرائیل کے لوگ بہت ناخوش تھے اور ان کی اکثریت یروشلم سے اپنے ناطے توڑنے کی خواہش مند تھی۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قدیم دنیا میں انصاف کی رسم مذہب میں نہیں البتہ گہرے سیاسی فہم میں پائی جاتی تھی۔سماجی عدم اطمینان کی وجہ سے بادشاہتیں ختم ہوتی رہی ہیں۔تیرھویں صدی قبل مسیح میں یوگیرت اس لئے تباہ ہوا کہ اس کے نظام میں کسانوں پر ناقابل برداشت بوجھ تھا۔حضرت سلیمان کی مملکت بھی اسی لئے

منتشر ہوئی کہ انہوں نے اپنی رعایا کے ساتھ مساوی برتاؤ نہ کیا۔ ان کے جانشینوں کے لئے یہ ایک واضح سبق تھا۔ حضرت سلیمان اس بات سے آگاہ تھے کہ ان کی مملکت خطرے میں ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی زندگی کے آخری برسوں میں اسرائیل کا افسر بیگار، یربعام، ان کے خلاف ہو گیا۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی علاقے کیا یک نبی نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ حضرت سلیمان کی مملکت دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گی اور یربعام، اسرائیل کے دس قبیلوں کا حکمران بن جائے گا۔ (38) اسی لئے یربعام بغاوت کے لئے ساز باز کرتا رہا اور حضرت سلیمان نے اسے قتل کرانیکی کوشش کی۔ یربعام مصر کو بھاگ گیا اور وہاں اس نے فرعون سیسق کے دربار میں پناہ لے لی۔ لیکن اسے زیادہ عرصہ تک جلاوطن نہ رہنا پڑا۔ حضرت سلیمان چالیس سال تک حکومت کرنے کے بعد 930 قبل مسیح میں انتقال کر گئے۔ انہیں اپنے والد کے پہلو میں شہر داؤد میں دفن کیا گیا۔ انتشار نے اسرائیل اور یہوداہ کی متحدہ سلطنت پر حملہ کر دیا جس کا حضرت سلیمان کو خدشہ تھا۔

===============

حوالہ جات

1۔ سیموئیل 5:6

2۔ اسرائیلی ماہر آثار قدیمہ یگال یادین کا کہنا ہے کہ اسی وجہ سے بعد میں لنگڑے اور نابینا افراد کا داخلہ معبد میں ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔

3۔ سیموئیل 5:8 ' 1۔ تواریخ 11:4-7

4۔ سیموئیل 5:9

ار۔ داؤد کے معنی غالباً قلعہ داؤد ہونے چاہئیں۔

5۔ سیموئیل 5:8 ' 1۔ تواریخ 11:5

6۔ یشوع 15:8

7. R. E. Clements, Abraham & David (London.1967)

8۔ 1۔ سلاطین 4:3

9. G.E. Mendenhall, Jerusalem from 1000 to 63 BC, in K. J. Asali, Jerusalem in History (New York-1990), p. 45.

10۔ تواریخ 21:9

Gosta W. Ahistrom, the History of ancient Palestine (Minneapolis, 1993), pp. 504-05

11. Gosta W. Ahlstrom, Der prophet Nathan and Der Tempelban (1961).

R.E. Clements, God & Temple (Oxford 1965), P. 58.

12. Harold H. Rowley, Worship in Ancient Israel: Its froms & Meaning (London-1967), p. 73.

Clements, God & Temple, pp. 42-43.

Ronald de Vaux, Ancient Israel: Its Life & Institutions. (New York & London- 1961), pp. 114-311.

13۔ 1۔ تواریخ 6

14۔ 2۔ سیموئیل 6

15۔ 2، سیموئیل 7:6-16

16۔ 1۔ تواریخ 28:11-19

17۔ 2۔ سیموئیل 24

18. BENJAMIN MAZAR, The Mountain of the Lord (New York- 1975). p. 52.

CLEMENTS, God a Temples. pp. 61-62.

AHLSTROM, HISTORY Of ancient Palestine, P. 471.

HANS- JOACHIM KRAUS, Worship in Israel (Oxford- 1966) p. 188

19۔ 1۔ تواریخ 28:11-19

20۔ 1۔ تواریخ 28:19

21۔ معبد آٹھ سال میں اور محل تیرہ سال میں تعمیر ہوا۔

22. DAVID USSISHKIN, King Solomon's Palaces, Biblical Archeologist 36 (1973).

23۔ 1۔ سلاطین 6:1-14 '2۔ تواریخ 3:1-7

24۔ گنتی 21:8-9' 2۔ سلاطین 18:14

25۔ ان دونوں ستونوں کے ناموں کے معنی نامعلوم ہیں۔ شاید یہ دو دعاؤں کے ابتدائی لفظ ہیں۔ یاکین یہواہ (خدا داؤد کا تخت ہمیشہ کے لیے قائم کرے) اور بوعز یہواہ (یہواہ کی طاقت سے) کی دعاؤں سے لیے گئے ہیں۔ بوعز کا ذکر کتاب روت میں بادشاہ داؤد کے اجداد کی حیثیت سے بھی موجود ہے۔ ممکن ہے ان کے یہ نام کائناتی ستون قرار دیئے جانے کی وجہ سے رکھے

گئے تھے۔ طلوع آفتاب کی پہلی کرنیں انہی ستونوں کے ذریعے معبد میں داخل ہوتی تھیں۔

26۔ 1۔ سلاطین 6:15-38، 2۔ تواریخ 3:8-13

27. MARGRATE bARKER, The Gate of Heaven: The History and Symbolism of the Temple in Jerusalem (London) 1991, pp. 26-29.

CLEMENTS, God & Temple- p. 65.

28۔ پیدائش 11:4-9

29. CLEMENTS, GOD & TEMPLE- PP. 64, 69, 72.

30۔ زبور 2:6-12

31۔ زبور 72:4

32۔ زبور 9:10-16

33۔ زبور 48:8

34. COHN, Cosmos, Chaos and the World to come- p. 139.

35۔ 1۔ صلاطین 11:4-8

36۔ 1۔ صلاطین 4:18-19

37۔ 1۔ صلاطین 8:15-24

38۔ 1۔ صلاطین 11:26-40

==================

چوتھا باب

شہر یہوداہ

حضرت سلیمان کے بیٹے رجعام کو وراثت میں ایک کمزور اور برگشتہ سلطنت ملی۔ اس کی حکمرانی کو ریاست یہوداہ میں تو تسلیم کرلیا گیا لیکن اسرائیل کی شمالی ریاست نے قبول نہ کیا۔ اسرائیل کی ریاست حضرت سلیمانؑ کے عظیم تعمیراتی منصوبوں کو وجہ سے چنانچہ جب رجعام اسرائیل کے بڑوں سے ملنے اور اپنی بادشاہت کی توثیق کرانے کے لئے سیکم میں گیا تو اسے بتا دیا گیا کہ اس کی بادشاہت صرف اسی صورت میں قبول کی جائے گی کہ اسرائیل پہ ٹیکسوں اور جبری مشقت کا بوجھ ہکا کر دیا جائے۔ رجعام کے سامنے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ اگر یہ شرط تسلیم کرلی جاتی تو حضرت داؤد کی عظیم سلطنت کا خواب ادھورا رہ جاتا اور خود رجعام کو ایک کم تر درجہ کے حکمران کی حیثیت قبول کرنا پڑتی۔ بہت کم حکمران اس طرح کی حیثیت قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ رجعام نے یہ شرط مسترد کردی۔ اسرائیل کے بزرگوں اور کہنہ مشق مشیروں کی مذکورہ شرط ایک مفید تجویز تھی اس سے سلطنت میں استحکام پیدا ہوسکتا تھا لیکن رجعام کے نوجوان ساتھیوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر اسرائیل سے ٹیکس اور جبری مشقت میں نرمی برتی گئی تو یہوداہ کے لوگوں کے آرام و آسائش میں کمی آجائے گی۔ رجعام نے اسرائیل کے بزرگوں کو جواب دیا ''میرے باپ نے تم کو چابک سے ٹھیک کیا، میں تمہیں کوڑوں سے ٹھیک کروں گا۔(1)

MAP (نقشہ)

اسرائیل کے بزرگوں نے متحدہ سلطنت سے قطع تعلق کا اعلان کردیا۔۔۔ بیگار افسر کو سنگسار کردیا گیا جب کہ

رجعام جان بچا کر یروشلم بھاگ آیا۔

اب یہوداہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے راستے الگ الگ تھے۔ یربعام اسرائیل کا بادشاہ بن گیا۔ اس نے ترضہ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور بیت ایل اور دان کے قدیم معبدوں کو شاہی معبدوں میں تبدیل کر دیا۔ بعد میں اسرائیل کے بادشاہ اومری نے سامریہ کو اپنا دارالحکومت بنایا جو اس علاقے کا سب سے شاندار اور خوشحال شہر بن گیا۔ اسرائیل کی راست، یہوداہ کی ریاست سے زیادہ بڑی اور زیادہ دولت مند تھی۔ اس میں بڑی بڑی شاہراہیں اور وہ علاقے تھے جن کا تعلق متمول شہری ریاستوں سے تھا۔ اس کے مقابلے میں یہوداہ کی ریاست الگ تھلگ، وسائل سے محروم اور ایسے پہاڑی علاقوں اور لق و دق صحراؤں پر مشتمل تھی جہاں کاشت کاری ناممکن تھی۔ یہوداہ کے بادشاہ کو اسرائیل کے الگ ہونے سے بہت نقصان پہنچا۔ اس نے اسرائیل پر مذہب سے برگشتہ ہونے اور الحاد وارتداد کا الزام لگا دیا۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا ذمہ دار یہوداہ کا بادشاہ رجعام ہی تھا جس نے صورت حال اپنے باپ کی طرح جوں کی توں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہوداہ اور اسرائیل کی علیحدگی کے پچاس برس بعد دونوں ریاستوں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہوداہ کی ریاست کمزور ہونے کی وجہ سے خاص طور پر غیر محفوظ تھی۔ رجعام، فرعون سیسق کی مدد سے یروشلم کو اسرائیل کے قبضے سے بچانے میں کامیاب ہوا۔ فرعون کنعان میں اپنی سیاسی موجودگی چاہتا تھا۔ رجعام نے معبد کی آمدنی کے عوض اسے اپنا حلیف بنا لیا۔ یہوداہ کے بادشاہ آسا کے دور (911-870 ق م) میں اسرائیل کی فوجیں رامہ کے مقام تک پہنچ گئی تھیں جو یروشلم سے شمال میں صرف پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اس دفعہ یہوداہ کے بادشاہ نے یروشلم کو دمشق کی آرامی بادشاہت کی مدد سے بچایا۔ آرامی بادشاہ نے یہوداہ کے بادشاہ کی مدد کی درخواست پر اسرائیل پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس کے بعد اسرائیل شام کے ساتھ خونین سرحدی چھڑپوں میں الجھ گیا اور یہوداہ نے سکھ کا سانس لیا۔

چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر جانے کے بعد یہوداہ کے لوگ یہوداہ کی مدد کے طالب ہوئے۔ اب وہ یہوداہ کو پکارنے لگے۔ کنعان کے عام لوگوں کی طرح وہ ابتری اور خلفشار کی قدیم طاقتوں کے ساتھ ساتھ مصر، اسرائیل اور بعد میں حریف بن جانے والی ریاست دمشق کو اپنے دشمن قرار دیتے تھے۔ سمندر اور ریگستان کی طرح یہ دشمن بھی ان کی ریاست کو ختم کر سکتے تھے۔ اپنے دشمنوں پر غالب آنے کے لئے اپنی سابقہ جدوجہد اور لڑائیوں کو یاد کر کے اپنی توانائیاں مجتمع کرنے کی بجائے وہ یہواہ کی اس جدوجہد کو یاد کرنے لگے جو اس نے ابتدائی زمانے مین ابتری اور خلفشار کے خلاف کی تھی۔ تمام تر مشرق قریب کے معبدوں میں بعل اور مردک جیسے دیوتاؤں کی ایسی لڑائیوں کی یاد ہر سال پورے تزک واحتشام کے ساتھ

منائی جاتی تھی۔اس کے پیچھے یہی تصور کارفرما تھا کہ جس امن وسلامتی کی ان کے شہروں کو ضرورت ہے وہ صرف آسمانی جنگجو ہی قائم کر سکتے ہیں۔ قدیم دنیا کی یہ مذہبی رسوم محض یاد کرنے کی کاروائیاں نہیں ہوتی تھیں۔وہ ان دیومالائی داستانوں کو اس طرح پیش کیا کرتے تھے کہ لوگوں کو محسوس ہو کہ یہ سب کچھ پھر رونما ہونے والا ہے۔اور لوگوں کو برائی کے عفریتوں اور نیکی کے دیوتاؤں کے درمیان ہونے والی دائمی اور نادیدہ کشمکش میں دیوتاؤں کے محتاج ہونے کا یقین آجائے۔ ماورائی قوتوں کی جنگوں کو تمثیلی انداز میں ایک مکمل ناٹک کے ذریعے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ یوں عبادت گزار دیو مالا کی ''ابدی وازلی دنیا'' میں پہنچ جاتے۔ یہ مذہبی رسوم کائنات کی اس تلخ حقیقت کا مظہر تھیں جو ہمیشہ موت اور اذیت کی صورت رکھتی ہے لیکن یہ بھی واضح کر دیا جاتا کہ یہ جدوجہد ہمیشہ ایک تخلیقی نتیجہ رکھتی ہے۔یم اور مات کے ساتھ مہلک لڑائیوں میں کامیاب ہونے کے بعد بعل کی تخت نشینی کوہ زیفون پر ہوئی تھی اور یہ ہمیشہ کے لئے اس کا گھر بن گیا تھا۔ زیفون سے بعل نے امن، زرخیزی اور نظم قائم کئے جن کو اس کے دشمن ختم کرنا چاہتے تھے۔جب یوگیرت میں اس فتح کی یاد منائی جاتی تو بادشاہ، بعل کا کردار ادا کرتا اور اپنے آسمانی وجود کی حیثیت سے بپتسمہ دیتا تھا کہ اس کی سلطنت میں امن، زرخیزی اور انصاف کا فریضہ پورا ہو۔ ہر سال موسم خزاں میں بعل کی تخت نشینی کا جشن منایا جاتا۔ یہ تقریبات ایتھانیم کے مہینے میں منعقد کی جاتیں اور ان آسمانی توانائیوں کو جنم دیتیں جن سے یوگیرت کے لوگ پورا سال استفادہ کرتے۔

یروشلم میں معبد سلیمانی کی تعمیر سے پہلے۔۔۔ ہمارے علم کے مطابق۔۔۔ یہواہ کو خدائے خالق نہیں سمجھا جاتا تھا۔خروج کی داستانیں اسے کائنات کی بجائے ایک قوم کی تخلیق کرتے ہوئے دکھاتی ہیں۔لیکن جب کوہ صیہون پر خانہ اقدس (دیور) میں اس کی تخت نشینی منعقد ہوگئی تو اس کی مذہبی رسوم میں وہ باتیں بھی شامل ہوگئیں جو اس علاقے کے سابقہ معبود یعنی بعل ایل علیون کی عبادت سے تعلق رکھتی تھیں۔ غالباً کاہن صدوق کے زیر اثر یبوسی عقائد اسرائیلیوں کے عقائد میں شامل ہو گئے۔بعل دیوتا کی طرح اب یہواہ کے بارے میں بھی کہا جانے لگا کہ اس نے سمندری عفریت لوتان کے ساتھ جنگ کی۔عبرانی میں لوتان لویاتان کہا گیا۔(2) اس نے ابتری وانتشار کے ابتدائی پانیوں کو مطیع کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ زمین پر سیلاب لے آتے۔ان سرحدوں کی نشاندہی کر دی جن کو عبور کرنے کی اجازت نہیں تھی اور ایک مقفل دروازے کے ذریعے ان پانیوں کو ''باندھ'' دیا گیا۔(3) مردک دیوتا کی طرح اس نے بھی ایک سمندری عفریت کو چیر کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔اس عفریت کا نام رہاب تھا اور یہ معرکہ آرائی اس وقت ہوئی جب یہواہ نے زمین کی بنیاد رکھی۔(4) بعد میں ان ہنگامہ خیز تخلیق کے واقعات کو ''پیدائش'' کے باب میں

پر امن تخلیق میں تبدیل کر دیا گیا۔لیکن بائبل بتاتی ہے کہ یہوداہ کے لوگوں میں ایسی کہانیاں مقبول تھیں جوان کے پڑوسی علاقوں کے عقائد سے قریبی مشابہت رکھتی تھیں اور بحران کے وقت وہ لوگ اسی ''کافرانہ دیو مالا'' کی طرف رجوع کرتے۔مقابلے کی داستان دلجوئی کا ذریعہ تھی کیونکہ اس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اگرچہ تباہی کی قوتیں بہت طاقتور ہیں لیکن عافیت ہمیشہ موجود رہے گی۔البتہ یہ سب کچھ از خود نہیں ہوگا۔کاہنوں اور بادشاہوں کی ذمہ داری تھی کہ اولین فتح کی یاد ہر سال منائیں تاکہ یروشلم میں خدائی قوت حلول کر جائے۔ ان کا فرض تھا کہ اپنے لوگوں کو اس عظیم اسرار سے وابستہ رکھیں جو دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ کائنات کی ناگزیر دہشت کا سامان کریں اور یہ دیکھنا سیکھیں کہ بظاہر جو کچھ دہشت ناک اور ہلاکت آفریں ہے اس کا مثبت پہلو کیا ہے؟ زندگی اور نظم کی فتح موت اور ابتری پر مبنی ہے۔ ہر قحط اور بانجھ پن کے بعد ہریالی اور زرخیزی آئے گی اور فنا کا خطرہ ٹل جائے گا کیونکہ خدائی قوت ان کے درمیان موجود ہے۔

بائبل کی ابتدائی مناجاتیں بتاتی ہیں کہ کتنے بھرپور طریقے سے یہوداہ کے لوگ اس عقیدے میں یقین رکھتے تھے بعض مقامات پر تو یہ مناجاتیں یوگیرت کی قدیم دیو مالا کو دھراتی ہیں۔

ہمارے خدا کے شہر میں، اپنے کوہ مقدس پر
یہواہ بزرگ اور بے حد ستائش کے لائق ہے
خدا کا شہر اس کا مقدس پہاڑ ہے
اس کی چوٹی جب تک بلند ہے
پوری دنیا میں مسرت وشادمانی ہے

کوہ صیہون، زیفون کا دل ہے
جو عظیم بادشاہ کا شہر ہے
یہاں اس کے محلات کے درمیان
خدا اس کا قلعہ ثابت ہوا ہے(5)

(زبور ۔ 48:3)

یہواہ کی اسی طرح یروشلم کے لئے لڑنا تھا جس طرح بعل اپنی میراث کے لئے یوگیرت میں لڑا تھا۔اس کی موجودگی نے دشمنوں کے مقابلے میں شہر کو ایک ناقابل تسخیر حصار میں ملفوف کر دیا۔یروشلم کے شہریوں کو کہا گیا تھا کہ صیہون کی قلعہ بندی کی تعریف کریں۔اس کے برجوں کو گنیں اور دیواروں کی تعریف

کریں۔اس کے محلات کو بار بار دیکھیں اور ستائش کریں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ارد ک کے شہری گل گامش کے بنائے ہوئے برجوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔دہر پر گہری نظر ڈالنے کے بعد یروشلم کے لوگ کہہ اٹھیں گے کہ ''خدا یہاں ہے۔''(6) ابتدائے آفرینش کے وقت یہواہ نے حدود متعین کر دی تھیں تا کہ ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر رہے: یروشلم کی سلامتی اور تحفظ کے لئے دیواریں اور حفاظتی اقدامات بھی وہی مذہبی نوعیت رکھتے تھے جو دنیا کو ابتری اور فنا سے بچانے کے لئے عظیم دیوتا کے اقدامات کی تھی۔ چنانچہ یروشلم کے شہریوں کو یقین تھا کہ شہر کبھی تسخیر نہیں ہوگا۔ یہواہ اپنے لوگوں کا قلعہ ہے۔ وہ ہر حملے کو پسپا کر دے گا اور دشمنوں کے نیزوں کو توڑ دے گا۔(7) یہوداہ کے لوگوں کو اس وقت بھی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں جب ان کے اردگرد ساری کائنات منہدم ہو رہی ہو۔ پہاڑ سمندر میں ڈوب رہے ہوں اور طوفانی لہریں چنگھاڑتی ہوئی ہر چیز کو نگل رہی ہوں۔(8) ان کے شہر میں یہواہ نے شیلم کی جنت بنا رکھی ہے جس میں کلیت، ہم آہنگی اور سلامتی ہے۔

یروشلم کے مذہبی عقائد میں لوگوں نے قدیم خروج کی داستانوں کو یہواہ کی تخلیق کائنات کے پس منظر میں دیکھا۔ یہواہ نے جب لویاتان اور رہاب کو شکست دے دی تو اپنے آپ کو پوری دنیا کا بادشاہ بنا لیا اور پھر دنیا کو قائم و دائم رکھا۔ بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی سے نجات دلانا، پوری بنی نوع انسان کی نجات کے لئے اس کے ارادوں کا ایک اظہار تھا۔(9)

نقادوں نے بائبل کی مناجاتوں سے ابتدائی مذہب کو پھر سے اصلی شکل دینے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے لمبے چوڑے دعوے کھوکھلے ہیں۔اس دور کے یروشلم میں مذہب کے بارے میں ہم بہت کم علم رکھتے ہیں۔تاہم کوہ صیہون پر یہواہ کی بادشاہت مرکزی نکتہ دکھائی دیتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ سکوتھ کی ضیافت بادشاہ (حضرت) سلیمان کی طرف سے معبد کو نذر گزارنے کی ایک رسم تھی جو مقدس پہاڑ پر تخت نشینی کی سالانہ تقریب کے دوران ادا کی جاتی تھی۔ جس طرح بعل دیوتا، مات کو شکست دے کر اور زمین کی زرخیزی بحال کر کے کوہ زیفون پر اپنے محل میں واپس آیا تھا۔اسی طرح یہواہ نے صیہون اور اس کے مقامات کی زرخیزی کو یقینی بنایا تھا چنانچہ اس قدیم زرعی میلے (سکوتھ) میں اس کی یاد بھی منائی جاتی تھی۔اس کا اظہار موسیقی، تالیوں اور نعروں سے کیا جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہواہ نفیریوں کی آواز سن کر خانہ اقدس میں اپنے تخت پر بیدار ہو جاتا ہے۔(10) آلات موسیقی بجا کر، مذہبی نعرے لگا کر اور معبد کو بخور کے دھوئیں سے بھر کر شائد معبد میں ''رویت خدا'' وہی ماحول بنانے کی کوشش کی جاتی تھی جو کوہ سینا پر حضرت موسیٰ کے سامنے خدا کے ظہور کے وقت موجود تھا۔(11) غالباً ایک جلوس بھی جیہوں سے معبد تک نکالا جاتا تھا جو

یہواہ کے کوہ صیہون کی طرف پہلے سفر کی یاد تازہ کرتا تھا۔ان تمام تر مذہبی رسومات میں یہواہ کے بارے میں ایک ایسا زبردست تاثر مرتب ہوتا تھا کہ لوگ اسے محض سیہون کا بادشاہ ہی نہیں۔۔۔پوری دنیا کا عظیم بادشاہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔اس نے دوسرے تمام دیوی دیوتاؤں پر برتری حاصل کر لی تھی۔(12)

کیونکہ تم یہواہ ہو

پوری دنیا کے علیون

دوسرے تمام معبودوں سے بالا و برتر(13)

اسرائیلیوں کی طرف سے باقاعدہ نظریہ توحید تشکیل دینے سے بہت پہلے کوہ صیہون پر ایسی مذہبی رسومات اور تقریبات شروع کی جا چکی تھیں جن کا مقصد یہواہ کے لوگوں کو جذباتی طور پر یہ سکھانا تھا کہ یہواہ ہی واحد خدا ہے۔

MAP (نقشہ)

بیابان نوردی کے چالیس سالوں کی یاد میں سکوتھ کا تہوار پورے مذہبی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔کھجور کی شاخیں اس موقعہ پر ادا کی جانے والی رسوم کا ضروری حصہ ہوتی ہیں۔

لیکن صیہون کی مذہبی رسم محض شور و غوغا کی تقریب نہیں ہوتی تھی۔ابتدائی زائرین کی مناجاتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ رسم ایک گہری ذاتی روحانیت تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔معبد کی زیارت کے لئے جانا معراج تھا۔زائرین جوں ہی صیہون کی چوٹی پر جانے کے لئے وادی حنوم سے یروشلم کی ڈھلوانوں پر قدم رکھتے تو وہ اپنے آپ کو یہواہ کی رویت کے لئے تیار کر لیتے۔(14) پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچنے کا یہ سفر محض جسمانی سفر نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک داخلی اور روحانی معراج بھی ہوتا تھا جو زائر کو ایک ایسی جگہ پر لے جاتا جہاں اس کی داخلی دنیا، خارجی دنیا سے مربوط ہو جاتی۔یہ ایک طرح سے گھر لوٹ آنے یعنی محفوظ ہو جانے کا احساس بیدار کرتا تھا۔

تیرے مذبحوں کے پاس گوریا نے اپنا آشیانہ

اور ابابیل نے اپنے لئے گھونسلا بنالیا

جہاں وہ اپنے بچوں کو رکھے

اے لشکروں کے خداوند۔۔۔یہواہ

مبارک ہیں وہ جو تیرے گھر میں رہتے ہیں(15)

آرام اور مستقل سکونت کا تصور حضرت داؤد کے اس گیت میں موجود تھا جو انہوں نے سب سے پہلے یروشلم میں یہواہ کا گھر بنانے کی تجویز میں پیش کیا تھا۔(16) معبد کی مذہبی رسوم نے یہوداہ کے لوگوں کو دنیا سے مربوط ہونے میں مدد دی۔ تخلیق کی داستانوں میں زور دے کر کہا گیا تھا کہ کائنات کی ہر چیز کی اپنی ایک متعین جگہ ہے۔ سمندروں کو یہواہ نے پابند کر دیا تھا کہ وہ خشک زمین پر غالب نہ آئیں۔ اب یہواہ اپنی مخصوص جگہ پر کوہ صیہون پر تھا۔ اس کی موجودگی نے یہ مقام یہوداہ کے لوگوں کے لئے ایک محفوظ مسکن بنا دیا تھا۔ اور یہ لوگ خود بھی مقدس ہونے کی وجہ سے اپنے لئے مخصوص کردہ متعین جگہ پر تھے۔ شہر کی دیواروں کے باہر تباہی پھیلانے والے دشمن تھے جو ان کی دنیا (شہر) کو انتشار و ابتلا کا شکار بنا سکتے تھے۔ لیکن اس حصار کے اندر وہ اپنی دنیا خود تخلیق کر سکتے تھے۔ صیہون کا معبد وابستگی اور مسرت کا جو احساس پیدا کرتا تھا اس سے زائرین کو روحانی اور جسمانی طور پر اپنے ٹھیک مقام پر ہونے کا اطمینان اور تسکین ملتی۔ معبد پر حاضری ایک خوشگوار فریضہ تھا۔ زائرین خداوند کی بارگاہ کے مشاق ہوتے تھے۔(17)

اے لشکروں کے خداوند

تیرے مسکن کیا ہی دلکش ہیں

میری جان خداوند کی بارگاہوں کی مشتاق ہے

بلکہ گداز ہو چلی ہے

زائرین کو معبد پر آ کر داخلی سکون ملتا اور وہ خود کو توانا محسوس کرتے تھے۔ وہ خود کو دنیا کے لامتناہی بکھیڑوں اور بے معنویت سے آزاد سمجھتے۔ ان کی دیو مالا بیابان نوردی کی طویل ابتلا کا ذکر کرتی تھیں۔ ایسی ابتلا جس میں کوئی انسان زندہ بچ رہنے کی امید نہیں رکھتا۔ لیکن اب معبد میں تغیر رکھنے والی دنیا کے ساکن اور پرسکون مقام پر زائر خود کو بھرپور طریقے سے زندہ محسوس کرتا۔ پوری شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کو محسوس

کرتا۔ معبد کے صحنوں میں گذارا ہوا ایک دن اس کے لئے کسی دوسرے مقام پر گزارے ہوئے ہزاروں دنوں سے زیادہ قیمتی تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہواہ ہی اکیلا خدا تھا جس کی عبادت یروشلم میں کی جاتی تھی۔ اگرچہ علمائے بائبل یہوداہ اور اسرائیل کے بادشاہوں کو صرف اس معیار سے دیکھتے ہیں" ۔۔۔۔۔ اچھے بادشاہ وہ ہیں جو اکلوتے یہواہ کی عبادت کو فروغ دیتے ہیں اور دشمن دیوتاؤں کی خانقاہوں، مذہبی مقامات اور ایستادہ پتھروں کو ختم کرتے ہیں۔۔۔ برے بادشاہ وہ ہیں جو غیر ملکی مذہبوں اور رسموں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔" لیکن ہمیں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس دور میں بادشاہوں کی دوسری سرگرمیوں کے بارے میں کچھ سننے اور پڑھنے کو نہیں ملتا۔ لیکن جب یہ بتایا جاتا ہے کہ کون کون سے بادشاہ یہواہ کے ساتھ مخلص تھے تو یہ حقیقت چھپی نہیں رہتی کہ ان حکمرانوں کے دور میں بھی یروشلم میں غیر ملکی مذہبی رسوم پھلتی پھولتی رہیں۔۔۔ خاندان داؤد کے بادشاہ یہوسفط (870-848 ق م) کی یہواہ سے وفاداری کی بہت تعریف کی جاتی ہے لیکن اس کے دور میں بھی دوسرے خداؤں کے مذہبی مقامات آباد تھے۔ علاوہ ازیں یہوسفط نے اپنے بیٹے یہورام کی شادی اسرائیل کے شاہ اہب اور ملکہ یزبیل کی بیٹی عتلیاہ سے کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی حالانکہ وہ بعل کی راسخ العقیدہ عبادت گزار تھی۔ وہ اپنے ساتھ فونیقی مذہب بھی یروشلم میں لائی اور وہاں اس نے معبد بھی تعمیر کروایا۔ اس معبد کا کاہن صیدا کا ماتن تھا۔

یہورام اور عتلیاہ کی شادی کے نتیجہ میں غالباً ایک ایسا معاہدہ طے ہوا تھا جس کے مطابق یہوداہ کی ریاست، اسرائیل کی ماتحت ریاست بن گئی تھی۔ بائبل کا کہنا ہے کہ "۔۔۔ اور پھر یہوسفط اور یہورام دونوں اسرائیل کی طرف سے دمشق کے خلاف لڑتے رہے۔" نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں مشرق قریب ایک نئی خوشحالی سے ہم کنار ہوا۔ یودہ (عیسو) کی پیشین گوئیاں پوری ہوگئیں۔ کیونکہ یہوسفط کو مواب، عمون اور شعیر کے خلاف قابل ذکر کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن ایک نیا خطرہ سر اٹھا رہا تھا۔ آشور جسے اب عراق کہا جاتا ہے، اس کے حکمران ایک نئی سلطنت تشکیل دے رہے تھے جس کی طاقت اور قوت کی مثال ماضی میں موجود نہیں تھی۔ آشوریوں کا دارالحکومت نینوا تھا۔ ان کی سب سے بڑی خواہش مغرب کی طرف بحر روم کے ساحلوں تک پہنچنا تھا۔ آشوریوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے دمشق اور اسرافیل نے ایک دوسرے سے الجھنا چھوڑ دیا اور اناطولیہ اور دوسری چھوٹی ریاستوں کے ساتھ مل کر ایک اتحاد بنا لیا۔ لیکن اس اتحاد کو 863 ق م میں شکست ہوئی اور دمشق اور اسرائیل کو آشوریوں کی غلامی پر مجبور ہونا پڑا۔ یہوداہ کی ریاست چونکہ غیر اہم تھی اس لئے آشوریوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ چنانچہ اس کی آزادی برقرار

رہی۔

آزادی کے باوجود یروشلم میں امن وسکون نہیں تھا۔ جب ملکہ عتلیاہ 841 ق م میں اپنے بیٹے کی موت کے بعد قائم مقام فرمان روا بنی تو اس نے (حضرت) داؤد کے خاندان کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ تخت کی جائز وارث بن جائے گی۔ چھ سال کے بعد معبد کے کاہنوں اور شہر کی اشرافیہ نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور عتلیاہ کے سات سالہ پوتے یوآس کو بادشاہ بنالیا گیا جسے شیر خواری میں کاھن کی بیٹی نے عتلیاہ کی دست برد سے بچالیا تھا۔ یوآس کی تاجپوشی کے دن عتلیاہ کو قتل کر کے بعل کے معبد میں پھینک دیا گیا۔ یروشلم کو بیرونی دشمنوں کا خطرہ بڑھا تو یوآس نے دمشق کے بادشاہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور ایک خطیر رقم کے عوض اسے یروشلم پہ حملہ کرنے سے روک دیا۔ یوآس کے بیٹے امصیاہ کے دور حکومت (796-781 ق م) میں اسرائیل کی فوج نے یروشلم کے معبد اور شاہی محل پر قبضہ کر لیا۔ فوج نے واپس سامریہ جانے سے پہلے شہر کی دیوار کا ایک حصہ بھی منہدم کر دیا۔ لیکن اس واقعہ کے باوجود لوگوں کی صیہون سے عقیدت میں کمی نہ آئی۔ امصیاہ کے بیٹے عزیاہ (781-740 ق م) کے دور میں یروشلم روز بروز طاقتور ہوتا چلا گیا حالانکہ بادشاہ جذام کے مرض میں مبتلا تھا۔ (19) اسرائیلی حملہ میں منہدم ہونے والی دیوار کو پھر سے تعمیر کر دیا گیا۔ میلو کے مقام پر موجود پرانے قلعے کی جگہ شہر اور معبد کے درمیان اوفیل میں ایک نیا قلعہ بنوایا گیا۔ اب یروشلم ایک صنعتی شہر بن گیا اور اس کی آبادی میں اضافہ ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دنوں شہر کی آبادی دیواروں کے باہر بھی پھیل گئی تھی۔ اسی زمانے میں آشوریوں کی طاقت عارضی طور پر ضعف کا شکار ہو گئی۔ مقامی ریاستوں نے انھیں اپنے اپنے علاقوں سے باہر دھکیل دیا۔ اسرائیل کی ریاست بھی آزاد ہو گئی اور خوشحالی کے سفر پر گامزن ہو گئی۔

لیکن اس خوشحالی نے سماجی مسائل پیدا کر دیئے امیر اور غریب کے درمیان وسیع خلیج دانشمند لوگوں کے لئے نا قابل قبول تھی۔ چنانچہ اسرائیل اور یہوداہ دونوں ریاستوں میں انبیاء اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ظلم و ناانصافی کی مذمت کرنا شروع کر دی۔ تخت نشینی کے وقت مشرق قریب کے بادشاہ عہد کیا کرتے تھے کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کو تحفظ دیں گے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان ریاستوں کے حکمران اپنا یہ نصب العین بھول گئے تھے۔ ممرے میں خدا کا انسانی روپ میں (حضرت) ابراہیم کے پاس آنا اور حضرت ابراہیم کا اس کی مہمان نوازی کرنا، یہواہ کے مذہب میں تمام انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت تھی۔ یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ روح القدس کسی بھی انسان، معبد اور مقدس مقام میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ لیکن اسرائیل اور یہوداہ کی ریاستوں میں انسانوں کے لئے جذبہ ترحم مفقود ہو چکا تھا۔

اس دور میں نئے مذاہب تمام مہذب دنیا میں نمودار رہے تھے۔مورخین اس کو ''محوری دور'' کہتے ہیں۔تمام نئے مذاہب کا اصرار تھا کہ سچے ایمان کی خصوصیت انسانی ہمدردی کا عملی اظہار ہے۔چنانچہ یہواہ کا مذہب بھی دنیا کے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے تبدیلیوں کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔

محوری دور کا کوئی بھی نبی یروشلم کے معبد کے ساتھ اتنا مخلص نہیں تھا جتنا یسیعاہ نبی۔اسے 740 ق م میں نبوت ملی۔یہ سال بادشاہ عزیاہ کی موت کا تھا۔یسیعاہ شاہی خاندان کا ایک رکن تھا اور یقیناً کاھن بھی ہوگا کیونکہ وہ اس وقت ہیکل میں کھڑا عود و لوبان کے دھوئیں کے بادلوں کو دیکھنے اور مذہبی نعروں کا شور سننے میں محو تھا کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ دیور کے پردے کے پیچھے ہیبت ناک حقیقت ظاہر ہو چکی ہے۔اس نے دیکھا کہ یہواہ خانہ اقدس میں رکھے تخت پر بیٹھا ہے، اس کے گرد فرشتے حلقہ بنائے کھڑے ہیں اور خانہ اقدس سے پھوٹنے والا نور تمام دنیا پر چھا رہا ہے، فرشتے گا رہے تھے۔۔۔''مقدس، مقدس، مقدس ہے یہواہ، رب الافواج۔۔۔ساری زمین اس کے جلال سے معمور ہے۔''

یسیعاہ کی اس رویا میں معبد فیصلہ کن انداز میں اہم ہو گیا۔صیہون کا مقدس پہاڑ زمین کا مرکز تھا کیونکہ اسی جگہ پر مقدس حقیقت بنی نوع انسان کی ارضی دنیا میں اتری تھی تا کہ انہیں نجات دلائے۔صیہون کا مذہب یہواہ کی عالمی بادشاہت کا اعلان کر چکا تھا اور اب یسیعاہ کی رویا اس دن کی پیشن گوئی کر رہی تھی جب تمام قومیں یہواہ کے معبد کے پہاڑ کی طرف چل پڑیں گی اور ایک دوسرے کو یروشلم میں رویت خدا کے لئے جانے کی ترغیب دیں گی۔تب سب لوگ کہیں گے۔۔۔''آؤ یعقوب کے خدا کے معبد کو چلیں۔۔۔''(21) اور یہ باغ عدن کو عالمی مراجعت ہوگی۔''وہاں ساری مخلوق پیار اور محبت سے رہے گی۔بھیڑیا بھیڑ کے ساتھ رہے گا۔چیتا بکری کے ساتھ رہے گا اور شیر کا بچہ بچھڑے کے ساتھ رہے گا۔''(22) (یسیعاہ۔11:9) یروشلم کا پہاڑ ایک نئے عالمی نظام کی تخلیق دیکھے گا۔اس گم گشتہ کلیت (جنت) کی بازیافت دیکھے گا جس کے لئے انسانیت بے چین ہے۔

نئے یروشلم کے لئے یسیعاہ کی رویا کو کبھی نہیں بھلایا گیا۔یسیعاہ کی پیشین گوئی تھی کہ امن کے دور کا آغاز کرنے والے ایک برکت یافتہ بادشاہ، ایک مسیحا کی آمد ہوگی۔چنانچہ لوگ آج بھی امید کرتے ہیں کہ وہ مسیحا ضرور آئے گا جو امن کے دور کا آغاز کرے گا اور پھر حضرت ابراہیم کے تینوں مذاہب کے توحید پرستوں میں نئی روح پھونک دے گا۔پھر یہودی، عیسائی اور مسلمان یروشلم کی طرف ایک ایسے مقام کی حیثیت سے دیکھیں گے جہاں خدا انسانی تاریخ میں آخری مرتبہ مداخلت کے لئے ظاہر ہوگا۔پھر ایک عظیم فیصلہ ہوگا۔ایک آخری جنگ ہوگی اور پھر نادم اور پشیمان منکروں کا بہت بڑا جلوس یروشلم کی راہ لے گا تا کہ خدا

کی مرضی کے آگے سر جھکا دے۔ یہ امید اور یہ خواب یروشلم کی سیاست کو آج بھی متاثر کر رہا ہے۔

لیکن یروشلم کے عالمی مرکز بن جانے کی یسیعاہ کی پیشین گوئی کا آغاز ایک ایسی غیبی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو پورے صیہونی مذہب کی مذمت اور نفی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تمہارے ذبیحوں کی کثرت سے مجھے کیا کام؟
یہواہ کہتا ہے۔۔۔میں مینڈھوں کی سوختنی قربانیوں
اور بچھڑوں کی چربی سے بیزار ہوں
تمہیں کون کہتا ہے کہ میری بارگاہوں کو روندو؟(23)

محوری دور میں اب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ محض مذہبی رسوم کی تکمیل اس وقت تک بے معنی ہے جب تک ان کے ساتھ ایک جذبہ ترحم نہ ہو۔ انصاف قائم کیا جائے، جو مظلوموں کی مدد کرے اور تیمیوں اور بیواؤں کا سہارا بنے۔(24) محققین کا خیال ہے کہ یہ باتیں یسیعاہ نبی کی نہیں تھیں بلکہ مولفین نے اس کی پیشین گوئی کے ساتھ خود اضافہ کر دیا۔ لیکن اس طرح کی باتیں دوسرے انبیاء سے بھی منسوب ہیں جو سماجی انصاف کے علمبردار تھے۔ اسرائیل کی ریاست میں ایک نبی عاموس نے بھی دلائل دے کر ثابت کیا کہ معبد کے رسومات میں خروج کے مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یسیعاہ کی طرح عاموس کو بھی رویت یہواہ ہوئی لیکن یہ بیت ایل کے معبد میں ہوئی۔ عاموس کو اتنا وقت نہ مل سکا کہ وہ ایک مکمل مذہب کی تشکیل کر لیتا۔ اس نے خدا کو یہ کہتے ہوئے دکھایا ہے۔

''کیا بیابانی کے چالیس برسوں میں تم مجھے قربانیاں
اور نذرانے پیش کرتے رہے ہو؟
تم تو ملکوم کا خیمہ اور کیوان کے بت اٹھائے پھرتے
رہے ہو جو تم نے اپنے لئے بنائے تھے
یہواہ کو تمہارے نعروں اور بربطوں کے شور
کی ضرورت نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ
انصاف پانی کی طرح بہے اور دیانت داری

کبھی نہ ختم ہونے والے چشمہ کی طرح جاری رہے۔''(25)

(عاموس۔5:27)

عاموس نے کہا کہ'' خدا یروشلم میں اپنے معبد سے بلند آواز میں گرج رہا ہے کیونکہ اردگرد کے تمام ملکوں میں ناانصافی ہو رہی ہے اور اس ظلم وستم نے اس کے مذہب کو مذاق بنا دیا ہے۔(26) جب محوری دور میں یہواہ کا مذہب تبدیل ہوا تو انصاف اور رحم بنیادی فرائض بن گئے۔ان کے بغیر مقدس مقامات سے وابستگی کو بے معنی قرار دے دیا گیا۔یروشلم کے مذہب میں بھی یہ فرائض شامل ہو گئے۔اعلان کیا گیا کہ یہواہ تمام کمزوروں اور غریبوں کے لئے فکرمند ہے۔صیہون کو غریبوں کے لئے ایک پناہ گاہ ہونا تھا اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہودی اپنے آپ کو یروشلم کے حقیقی بیٹے قرار دیتے ہوئے خود کو'' غریب'' کہتے ہیں۔لیکن یروشلم میں'' غربت'' سے مراد محض مادی محرومی نہیں تھی۔غریب کا متضاد امیر نہیں بلکہ ''متکبر'' تھا۔یروشلم میں لوگوں کو انسانی طاقت، بیرونی اعانت یا عسکری صلاحیت پر نہیں بلکہ صرف اور صرف یہواہ پر انحصار کرنا تھا۔وہی صیہون کا اکلوتا قلعہ اور حصار تھا۔انسانی سپاہ اور قلعہ بندیوں پر متکبرانہ انحصار کو کفر قرار دے دیا گیا۔(27)

لیکن آج کی طرح تب بھی ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو رحم اور دردمندی کے مشکل فریضہ کی ادائیگی کے برعکس اپنی مذہبی توانائیاں مقدس مقامات سے وابستگی پر صرف کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔یسیعاہ کی طویل نبوت میں ایسے اشارے سامنے آ گئے تھے کہ یروشلم کے نظریہ میں کچھ خطرات سر اٹھا سکتے ہیں۔ یہوداہ کے بادشاہ آخز (---716 36 ق م) کے عہد میں آشور کی سلطنت نے مشرق قریب میں پھر طاقت پکڑ لی۔آشوریوں کے غلبہ سے بچنے کے لئے دمشق کے حکمرانوں نے اسرائیلی ریاست کے ساتھ ایک نئے اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔یہوداہ کی ریاست کو بھی اس اتحاد میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کے بادشاہ آخز نے انکار کر دیا۔دمشق اور اسرائیل کی مشترکہ فوج نے یروشلم کا محاصرہ کرنے کے لئے جنوب کا رخ کر لیا۔یسیعاہ نبی نے آخز کو ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا۔اس نے پیشن گوئی کہ۔۔۔''اس کی ملکہ جس بچے کو جنم دینے والی ہے وہ'' داؤد کی بادشاہت'' کو بحال کرے گا۔اسے عمانوایل (خدا ہمارے ساتھ ہے) کہا جائے گا کیونکہ وہ امن کے دور کا نقیب ہوگا۔اس دور میں عورتیں اور مرد ایک بار پھر خدا کے ساتھ صلح وآشتی کے ساتھ رہیں گے۔اس سے پہلے کہ یہ بچہ جوان ہو، دمشق اور اسرائیل کی ریاستیں تباہ ہو جائیں گی۔بدحواس ہونے یا دوسرے بادشاہوں کے ساتھ اتحاد کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔آخز کو صرف یہواہ پر انحصار کرنا چاہئے۔(28)

یسیعاہ کی تاکید اور پھر بھی کے باوجود آخز ڈٹے رہنے کا مشورہ ماننے پر تیار نہ ہوا۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے تحفظ کے لئے آشور کے بادشاہ تگلت پلنا سر کے سامنے سر جھکا دیا اور آشور کی بالادستی قبول کر لی۔ آشوریوں نے فوراً اسرائیل اور دمشق پر حملہ کر دیا اور ان دونوں پر قبضہ کر کے وہاں کے باشندوں کی اکثریت کو باہر دھکیل دیا۔ 733 ق م میں اسرائیلی ریاست سکڑ کر سامریہ کی شہری حدود تک رہ گئی۔ اس پر ایک کٹھ پتلی حکمران کی حکومت قائم کر دی گئی۔ آشوریوں کی پالیسی میں غلام قوموں پر اپنا مذہب مسلط کرنا شامل نہیں تھا۔ لیکن آخز چاہتا تھا کہ اپنے نئے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ان کی کچھ مذہبی رسوم اپنے لے۔ چنانچہ معبد سلیمانی کے صحن میں پرانی

MAP (نقشہ)

اپنی قدیم قلعہ شکن مشین (منجنیق) کے ساتھ ایک شہر کا محاصرہ کئے ہوئے آشوری سپاہی اپنے قیدیوں کے لئے پوری سفاکی اور بے رحمی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ (745 ق م کے ایک پتھر پہ کندہ تصویر اور تحریر)

قربان گاہ کی جگہ ایک آشوری قربان گاہ بنا دی گئی۔ پھر ریاست یہوداہ میں آشوریوں کے دیوتاؤں سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش پر مبنی مذہبی رسوم کے لئے ایک نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ان دنوں مشرق قریب میں آشوریوں کا مذہب فروغ پاتا ہوا نظر آتا ہے۔

یسیعاہ آخز کو بہت کم وقت دیتا تھا۔ لیکن آخز اپنا ملک بچانے میں کامیاب رہا۔ اس بچے کے بارے میں بھی کچھ سامنے نہ آیا جسے یسیعاہ نے عمانوایل کی حیثیت سے قابل تعریف قرار دیا تھا۔ 716 ق م میں آخز کے بعد اس کا بیٹا حزقیاہ یہوداہ کا بادشاہ بنا۔ بائبل بتاتی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو صرف یہواہ کے لئے وقف کر دیا۔ اس نے وہ تمام عبادت گاہیں بند کر دیں جو دوسرے معبودوں سے منسوب تھیں۔ تمام مذہبی نشانات، اونچے مقامات اور مذبحے مسمار کر دیئے۔ معبد سلیمانی کے ہیکل میں رکھا ہوا پیتل کا سانپ نما عصا بھی توڑ دیا۔ بائبل بتاتی ہے کہ کاہنوں نے اس کی اصلاحی تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا اور معبد میں موجود غیر ملکی مذہبی رسوم کا ساز و سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ حزقیاہ نے یہوداہ اور اسرائیل کے لوگوں کو حکم

دیا کہ یروشلم کے معبد سلیمانی میں اکٹھے ہوں اور عید فسح کی ضیافت میں شامل ہوں۔ حزقیاہ کے باپ کے دور تک عید فسح کی ضیافت کا اہتمام لوگ گھروں میں کرتے تھے۔(29) بائبل کے مولفین بتاتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح تک اس ضیافت کا اہتمام معبد میں نہیں کیا جاتا تھا۔ حزقیاہ نے اسے بحال کیا لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اس بحالی کے پس منظر میں کیا تھا اور وہ اس اصلاح سے کیا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ غالباً حزقیاہ اپنے اس اقدام سے خود کو اپنے باپ کی مخلوط مذہب کی پالیسیوں سے منحرف اور بیزار ثابت کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ آشوریوں کی بالادستی سے نکلنے کی ابتدا کر رہا تھا۔ اسرائیل کے لوگوں کو یروشلم بلانے کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ یہ اقدام نشاندہی کرتا ہے کہ حزقیاہ متحدہ مملکت کے احیاءِ نو کا خواہش مند تھا۔ اسرائیل اب خطرہ نہیں رہا تھا اور یہوداہ میں اپنے سابقہ دشمن کی مصیبت پر اطمینان محسوس کیا جا رہا تھا۔ علیحدگی کے بعد پہلی دفعہ یہوداہ کی ریاست ایک طاقتور حیثیت میں ابھری تھی، اور بقیہ اسرائیلیوں کو شہر داؤد میں بلانے کے پس منظر میں حزقیاہ کی یہ خواہش مچل رہی تھی کہ یسعیاہ کی رویا کو عملی تعبیر دی جائے۔

MAP (نقشہ)

اگر اس طرح کی امید پائی جاتی تھی تو یہ 722 ق م میں کچلی گئی۔ اس برس اسرائیل نے جو سامریہ کی شکل میں اب چھوٹی سی ریاست تھا، آشوریوں کے خلاف ایک ناکام بغاوت کی۔ سامریہ کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ اسے آشوری بادشاہ شا نیسر نے پوری طرح برباد کر دیا۔ اب اسرائیل کی ریاست، آشوریہ کا ایک صوبہ بنا دی گئی جسے سامرینہ کہا گیا۔ 27 ہزار سے زائد اسرائیلیوں کو آشوریہ میں منتقل کر دیا گیا اور پھر ان کے بارے میں کسی کو کوئی خبر نہ ہوئی۔ ان کی جگہ بابل، کتھناح، اراد اور سیفوریم کے لوگوں کو آباد کیا گیا۔ یہاں ان لوگوں نے اپنے پرانے معبودوں کے ساتھ ساتھ نئے معبود یہواہ کی عبادت بھی شروع کر دی۔ اب اسرائیل کے نام سے کوئی جغرافیائی علاقہ باقی نہ رہا بلکہ یہوداہ میں مذہبی اصطلاح کے طور پر زندہ تھا۔ لیکن سارے اسرائیلیوں کو چونکہ علاقہ بدر نہیں کیا گیا تھا اس لئے باقی بچ رہنے والوں نے اپنے تباہ شدہ ملک کو نئے آباد کاروں کی مدد سے پھر تعمیر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کچھ اسرائیلی یہوداہ میں آ گئے اور یروشلم کے اندر اور ارد گرد آباد ہو گئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ وہ عقائد اور مذہبی رسوم لے کر آئے تھے جو کبھی اسرائیل میں رائج تھیں۔ ان عقائد نے یروشلم کے مذہب پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

سابق اسرائیل سے آنے والے افرادی بہاؤ نے یروشلم کی آبادی اور رقبہ میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے تین چار گنا اضافہ کر دیا۔ دو نئی مضافاتی بستیاں آباد ہوئیں ان میں سے ایک معبد کے سامنے مغربی پہاڑی پر تھی جسے مشنہ محلّہ کہا گیا۔ یہ دراصل دوسرا شہر تھا۔ دوسری آبادی وادی الوعد میں قائم ہوگئی اسے مکتیش Makhtesh یعنی نشیب کہا گیا۔ نئے آشوری بادشاہ سارگون دوم نے زیادہ آزادانہ پالیسیاں اپنائیں۔ اور اپنے مقبوضہ اور غلام علاقوں کے لئے نرم رویہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں یروشلم کو خصوصی مراعات اور اقتصادی ثمرات میسر آئے۔ لیکن شمالی ریاست (اسرائیل) کے انجام سے کوئی سبق سیکھنے کی بجائے حزقیاہ نے اپنی خوشحالی کو گھمنڈ کا سبب بننے دیا۔ جب سارگون 705 ق م میں مرا تو یروشلم مضطرب مقبوضہ علاقوں کا مرکز تھا۔ یہ علاقے اپنی گردنوں سے آشوریہ کی غلامی کا طوق اتارنا چاہتے تھے۔ مقبوضہ ریاستوں نے اتحاد قائم کر لیا اور اس اتحاد کو الصور، اور اسقلون کے بادشاہوں کے علاوہ فرعون مصر نے بھی مدد کا وعدہ کیا ادھر ایک اور باغی اتحاد نے میسوپوٹیمیا میں جنم لیا۔ اس کی قیادت بابل کا بادشاہ مردک بلشان کر رہا تھا۔ اس نے اپنا ایلچی یروشلم بھیجا تاکہ یہاں گوداموں اور قلعہ بندیوں کا جائزہ لے۔ حزقیاہ نے جنگ کے لئے زبردست تیاریاں کیں۔ اس نے آب رسانی کا نظام بہتر بنانے کے لئے نئی سرنگ بنوائی جو سترہ سو فٹ لمبی تھی اور چشمہ جیہوں سے سیلوم کے تالاب تک پانی پہنچاتی تھی۔ ایک نئی دیوار بنوائی جو اس تالاب اور غالباً محلّہ مشنہ کو محفوظ کرتی تھی۔ حزقیاہ کو اپنی عسکری سلاحیت کا بہت گھمنڈ تھا لیکن یہ یروشلم کے ''غریبوں'' کی روحانی طاقت سے محروم تھی۔

حزقیاہ کو جلد ہی اپنی حماقت کا احساس ہوگیا۔ یروشلم کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ آشوریہ کی طاقت کے سامنے زیادہ عرصہ تک ٹھہر سکے۔ جب آشوریہ کے بادشاہ سنخیرب نے بابل اور میسوپوٹیمیا کے دوسرے علاقوں کی بغاوت کر فرو کر لیا تو وہ مغرب میں یروشلم کی طرف بڑھا۔ مصر نے مدد کے لئے ایک بھی سپاہی نہ بھیجا۔ اردن کا مشرقی علاقہ اور فونیق یہ، آشوری فوجیوں کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آگرا اور بالاخر سنخیرب کی فوجیں یروشلم کے باہر خیمہ زن ہوگئیں۔ حزقیاہ نے تباہی سے بچنے کے لئے تحفے اور خراج بھیجا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یسیعاہ کے شاگرد میکاہ نے پیشین گوئی کی کہ یروشلم بہت جلد ملبے کے ڈھیر میں اور صیہون ایک ہل چلے کھیت میں تبدیل ہو جائے گا۔(30) لیکن یسیعاہ کا اب بھی اصرار تھا کہ:

''سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ یہواہ جو صیہون کا قلعہ ہے، اپنے شہر کی حفاظت کرے گا۔ سفارت کاری اور فوجی تیاریاں بے کار ثابت ہوئی

ہیں لیکن یہواہ کی موجودگی دشمن کو پسپا کردے گی۔''(31)

اور پھر تمام تر مشکلات کے باوجود، یسیعاہ کی پیشین گوئی ڈرامائی طور پر درست ثابت ہوئی۔ ہمیں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ بائبل کہتی ہے کہ یہواہ نے فرشتہ بھیجا جس نے آشوری فوج کو تباہ کر دیا اور بادشاہ سنیجرب وطن واپس جانے پر مجبور ہوگیا۔(32) اس کی معقول وجہ غالباً یہ تھی کہ آشوری فوج میں طاعون پھیل گیا تھا۔ لیکن یروشلم کے لوگ بہر طور اسے یہواہ کی کاروائی ہی قرار دیتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ وہ اس مرج کا ظہور ایک معجزہ سمجھتے تھے۔ یوں یہواہ حقیقت میں ایک طاقتور جنگجو ثابت ہوا جس نے اپنے لوگوں کو ابتلا سے نجات دی تھی۔

اس غیر معمولی واقعہ نے یروشلم کی سیاست پر مہلک اثرات مرتب کئے۔ ماضی میں رجعام اور آسا نے شہر کو دانشمندانہ سفارت کاری کے ذریعے بچایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صیہون پر یہواہ کا مذہب انہیں معجزوں پر انحصار کرنے کی بجائے لازم قرار دیتا ہے کہ یہواہ کی جدوجہد میں شامل ہوں اور اپنے دشمنوں کا مقابلہ ہر اس ہتھیار سے کریں جو انہیں دستیاب ہو۔ لیکن بعد کے نسلوں نے سوچ لیا تھا کہ شہر ناقابل تسخیر ہے اور انہیں معجزانہ مداخلت سے یہواہ بچاتا رہے گا۔ یہ سوچ روحانیت کی بجائے جادوگردی کی قائل نسلوں کا ذہنی رویہ تھا۔ سنیجرب کی پسپائی کے بعد حزقیاہ ایک ہیرو بن گیا۔ لیکن اس کی غیر دانشمندانہ پالیسی ملک کو تباہی کے دھانے پر لے آئی۔ آشوریوں کی تاریخ میں سینحرب کا دعوی ہے کہ اس نے حزقیاہ کے 46 فصیل بند شہروں اور لاتعداد دیہات کو لوٹا۔ آبادی کی ایک کثیر تعداد کو علاقہ بدر کیا اور حزقیاہ کا تقریباً سارا علاقہ چھین لیا۔ یروشلم ایک بار پھر ایک چھوٹی سی شہری ریاست تھا۔ حزقیاہ کے بیٹے منسی کو ایک مشکل صورت حال میراث میں ملی وہ 698 قبل مسیح میں برسراقتدار آیا اور یروشلم میں 55 سال حکمران رہا۔ بائبل کے مطابق منسی یروشلم کا سب سے براحکمران تھا۔ اپنے آپ کو مختلف ثابت کرنے کے لئے اس نے باپ کی تمام مذہبی پالیسیوں کو ترک کردیا۔ اس کے پیش نظر یہوداہ ریاست کی سالمیت اور بالخصوص خطرات کا خاتمہ تھا۔ اس نے بعل کے لئے قربان گاہیں تعمیر کیں اور مضافات میں آسمانی دیوی دیوتاؤں کی عبادت گاہیں بحال کردیں۔ اس نے وادی حنوم میں انسانی قربانی کا احیاء کیا۔ معبد میں آشور دیوتا کا بت نصب کیا۔ غالباً یہ خانہ اقدس (دیور) میں نصب کیا گیا تھا۔ معبد کے صحن میں منسی نے ''مقدس رنڈیوں'' کے لئے گھر بنوائے۔ صیہون اب آشور کی مذہبی رسوم کے لئے وقف ہوگیا تھا۔ جہاں دوسرے آسمانی دیوی دیوتاؤں کے لئے بھی قربان گاہیں تھیں۔(33) یہواہ کے کٹر معتقدان اقدامات سے فطری طور پر نالاں تھے لیکن عام

لوگوں کی اکثریت کے لئے یہ اقدامات شائد قابل قبول تھے۔ حوزی نبی کی تاریخ بتاتی ہے کہ بعل کی مذہبی رسومات 722 ق م سے پہلے شمالی ریاست میں وسیع طور پر رائج تھیں 270 برسوں سے زائد عرصہ تک یہواہ یروشلم میں ''علیون'' رہا تھا۔ انبیاء اس ''معزولی'' پر شدید عذاب کی وعید دیتے اور اسے مذہب سے انحراف اور 701 ق م کی نجات کی ناشکر گذاری قرار دیتے تھے۔ اس کے باوجود منسی شاید یہ سمجھتا تھا کہ آشوریوں کو مطمئن کرنا اور اپنے باپ کی یہواہ پرستی سے گریز کرنا ضروری ہے۔ اس کے طویل اقتدار نے

MAP (نقشہ)

یہواہ کو اپنی طاقت بحال کرنے کا وقت مہیا کیا اور منسی اپنے باپ حزقیاہ کے دور میں چھن جانے والے علاقوں میں سے کچھ واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔

منسی کے نقاد اس کے دور میں یہواہ ازم کی ایک نئی قسم تشکیل دے رہے تھے وہ صیہون کے مذہب کو اچھی نظروں نہیں دیکھتے تھے۔ یہ توریت کی پانچویں کتاب کے مولف تھے اور 722 ق م میں اسرائیل کی ریاست کی تباہی کے بعد وہاں سے یروشلم میں آئے۔ انہوں نے اسرائیل میں آشوریوں کے ہاتھوں معبدوں کی بربادی دیکھی تھی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے معبدوں کو زمین اور آسمان کے درمیان رابطہ نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ ہی یہ لوگوں کو دشمنوں سے بچا سکتے ہیں۔ آسمان اور زمین کے درمیان خلیج پیدا ہو رہی تھی۔ ان موءلفین کے لئے یہ بات عقل و فہم سے بعید تھی کہ خدا انسانوں کی بنائی ہوئی کسی عمارت میں رہ سکتا ہے۔ یہ مولفین جب (حضرت) سلیمان کے یروشلم کے معبد کی تعمیر کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی زبان سے ایسے لفظ نکلواتے ہیں جو صیہونی مذہب کی بنیادوں کو متزلزل کرتے ہیں: ''کیا واقعی خدا آدمیوں کے ساتھ زمین پر رہے گا؟'' حضرت سلیمان نے اعتقادی کے ساتھ کہتے ہیں۔۔۔ ''آخر کیوں تمہارے آسمان تمہیں وہاں نہیں رکھ سکتے؟ یہ گھر کتنا چھوٹا ہے جو میں نے بنایا ہے''۔(34) خدا آسمان میں رہتا تھا اور دنیا میں تو صرف اس کا نام۔۔۔ اس کی ذات کا ایک سایہ موجود تھا۔ توریت کے مولفین کے خیال میں صیہون کا مذہب پرانی کنعانی دیو مالا پر استوار تھا۔ وہ ایک ایسا مذہب چاہتے تھے۔ جس کی بنیاد تاریخ بنے نہ کہ ایسی علامتی کہانیاں جن کا حقائق سے کوئی واسطہ نہیں۔ کئی طرح سے وہ آج مغرب میں رہنے والے ہم لوگوں کے قریب ہیں۔ مثلاً وہ بنی اسرائیل کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ کنعان

کی سرزمین پران کا حق کوہ صیہون پر یہواہ کی تخت نشینی کی وجہ سے ہے۔اس کے برعکس انہوں نے یشوع کی کہانی کوترجیح دی جس میں وہ خدائی اشارے پر کنعان کی سرزمین کوفتح کرتا ہے۔یہ کہانی ظاہر کرتی ہے کہ یشوع نے خدا کی مدد سے اورتلوار کے ذریعے کنعان کا ایک علاقہ تسخیر کیا۔سکوتھ کی ضیافت کے بارے میں ان کا اصرار ہے کہ یہ کٹائی کے موسم کا تہوار تھا۔چنانچہ وہ اسے کوہ صیہون پر یہواہ کی تخت نشینی کا سالانہ جشن نہیں مانتے۔(35)

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ توریت کے یہ مولفین چاہتے تھے۔کہ اسرائیلی صرف اورصرف یہواہ کی عبادت کریں اوردوسرے خداؤں سے منہ موڑلیں۔شمالی ریاست (اسرائیل) کے انبیاء مثلاً حوزی اورالیاہ نے طویل عرصہ تک اسی پیغام کی تبلیغ کی۔لیکن (حضرت) سلیمان کے زمانہ سے ہی یروشلم میں مخلوط خداؤں کا تصور موجود تھا۔نئے عقیدہ کے لوگ منسی کی پالیسیوں کوآخری تنکا سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ خروج کے وقت اسرائیلیوں نے صرف یہواہ کی عبادت کا وعدہ کیا تھا۔وہ یشوع کی کتاب کے چوبیسویں باب کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اسرائیلیوں نے اس انتخاب کی باقاعدہ توثیق ایک معاہدے (میثاق بنی اسرائیل) میں کی تھی۔یشوع کی ولیانہ سرپرستی میں انہوں نے تمام دوسرے خداؤں کو چھوڑ دیا تھا اوراپنے دل یہواہ سے لگا لئے تھے۔(36)

یروشلم کے معبد میں عبادت کے انداز نے بھی یہواہ کے کچھ لوگوں کوایسا ہی سوچنے پرمجبور کردیا تھا۔صیہون کی مذہبی رسوم کے حوالے سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان میں یہواہ کواکلوتا بادشاہ اور دوسرے خداؤں سے برتر خدااقرار دیا جاتا تھالیکن نقادوں کا کہنا ہے کہ صیہون کی مذہبی رسوم ناقص اورمشکوک تھیں۔ یہ قدیم دنیا میں مذہب کا مرکزی نکتہ ہوتی تھیں اورشائد اس وقت ان کے بغیر زندگی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ نقادوں یا توریت کے مولفین کا خیال ہے کہ اسرائیلیوں کو صرف ایک مقدس مقام اپنانا چاہئے تھا۔اوراس بات کا سختی سے خیال رکھنا چاہئے تھا کہ ان کے مذہب میں غیرملکی مذاہب کے تصورات سرائیت نہ کرجائیں۔ ابتدا میں شائد اسرائیلیوں کے ذہن میں سیکم یا بیت ایل کومقدس مقام بنانے کا خیال تھالیکن 722 کے بعد یروشلم کا معبد ہی یہواہ کا معبد اورسب سے بڑا مقدس مقام بنا دیا گیا۔چنانچہ مصلحین کواسی سے ناطہ جوڑنا پڑا۔جب وہ (حضرت) موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ارض موعودہ میں کسی مرکزی معبد کی تلاش کا ذکر کرتے تو صیہون یا یروشلم کا ذکر کرنے سے گریز کرتے۔اس کی بجائے وہ (حضرت) موسیٰ کی طرف سے مبہم انداز میں یہ کہلواتے ہیں۔۔۔''وہ جگہ جسے یہواہ تمہارے خدانے اپنا نام لئے جانے کے لئے منتخب کیا ہے۔''(37)

منسی کے دور میں مصلحین کے نصب العین کی عملی تعبیر ممکن نہیں تھی لیکن غیر متوقع طور پر انہیں اس کا موقعہ منسی کے پوتے یوسیاہ کے دور (609-640 ق م) میں مل گیا۔ یہ انتہائی مناسب وقت تھا۔ پورے مشرق قریب میں لوگ غیر مبہم طریقے سے اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ قدیم نظام ختم ہو رہا ہے۔ نئی دیوہیکل سلطنتوں، آشور یہ اور اس کی ابھرتی ہوئی مدمقابل بابل، میں رہنے کے تجربے نے لوگوں کو پہلی دفعہ ایک وسیع تر عالمی تناظر مہیا کیا تھا۔ تکنیکی ترقی نے بھی انہیں اپنے ماحول پر قابو پانے میں مدد دی تھی۔ اب لوگ دنیا کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے جس سے ان کے اباواجداد دیکھا کرتے تھے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی سمجھا جا رہا تھا کہ اب پرانے پاگان ازم (بت پرستی یا تاریک خیالی) میں اصلاح وقت کا تقاضا ہے۔ محوری دور میں تاؤمت، کنفیوشس مت، بدھ مت، ہندومت اور آخر میں یونانی مذہبی عقالیت نے پرانے مذاہب کی جگہ لے لی۔ اسی طرح کی اصلاحی تحریک یہوداہ میں بھی تھی۔ لیکن جب قدیم تاریک خیالی نے دم توڑا تو مصر سے میسوپوٹیمیا تک لوگوں میں ایک تصوراتی ماضی کی حسین یادوں کا عارضہ پھیل گیا۔ مصلحین کا ''سنہری دور'' بھی کچھ اسی طرح کا تھا جس میں خروج اور قاضیوں کے ادوار شامل تھے۔ یہ ایک ایسا ماضی تھا جو اگرچہ زیادہ تر افسانوی باتوں پر مشتمل تھا لیکن حال کے انتشار اور پراگندگی سے زیادہ پرکشش تھا۔

حسین ماضی کی طرف مراجعت کے ایک حصہ کے طور پر یوسیاہ نے معبد سلیمانی کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا جو تین سو سال گزرنے کے بعد اب مرمت طلب تھا۔ جب مرمت کا کام ہو رہا تھا تو کاھن اعظم حلقیاہ کو ایک ایسا طغریٰ ملا جو توریت کی پانچویں کتاب کا ایک حصہ تھا۔ جب یہ طغریٰ یوسیاہ کے سامنے پڑھا گیا تو نوجوان بادشاہ کو یہ جان کر سخت صدمہ پہنچا کہ ''خدا کی حمایت اسرائیل کے لئے غیر مشروط طور پر اور حضرت داؤد کے خاندان کے دائمی انتخاب کی وجہ سے نہیں بلکہ اس امر پر منحصر ہوگی کہ حضرت موسیٰ کی شریعت کی پابندی کی جائے گی۔(38) کوہ صیہون پر یہواہ کی اپنے معبد میں موجودگی کافی نہیں تھی۔ اس نئی دینیات پر یوسیاہ کا ردعمل ظاہر کرتا ہے کہ ''شریعت موسوی'' یہوداہ کے لوگوں کی مذہبی زندگی کا مرکزی نکتہ نہیں تھی۔ چنانچہ اب شریعت موسوی کو ملک کا قانون بنا دیا گیا۔

یوسیاہ نے اپنی اصلاحات کا آغاز توریت کے قوانین کے مطابق کیا لیکن اس طرح کی تمام اصلاحات کی طرح یہ بھی دراصل ماضی کو پھر سے تخلیق کرنے کی کوشش تھی۔ سب سے پہلے یہوداہ کے تمام بڑوں کو طلب کیا گیا تاکہ معبد میں قدیم میثاق اسرائیل کی تجدید کی جائے۔ لوگوں نے دوسرے خداؤں اور دیوتاؤں سے قطع تعلق کرنے اور اپنے آپ کو صرف یہواہ کے لئے وقف کرنے کا عہد کیا۔ اگلے مرحلہ میں

مذہبی رسوم کی تطہیر تھی۔اس موقع پر بائبل یروشلم میں پاگان رسوم کی موجودگی کے بارے میں بتاتی ہے۔بعل، آشور اور آسمانی دیوتاؤں کے بتوں اور نشانات کو شہر سے نکال کروادی قدرون میں جلایا گیا۔معبد کو مکروہات سے پاک کیا گیا اور معبد کے صحن میں آشور کے لئے وقف ''مقدس رنڈیوں'' کے گھروں کو منہدم کیا گیا۔

'' اور اس نے توفت میں جو بنی حنوم کی وادی میں ہے، نجاست پھنکوائی تا کہ کوئی شخص مولک کے لئے اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں نہ جلوا سکے۔ اور اس نے ان گھوڑوں کو دور کر دیا جن کو یہوداکے بادشاہوں نے سورج کے لئے مخصوص کر کے خداوند کے گھر کے آستانہ پر ناتن ملک خواجہ سرا کی کوٹھڑی کے برابر رکھا تھا جو ہیکل کی حد کے اندر تھی اور سورج کی رتھوں کو آگ سے جلا دیا۔ اور ان مذبحوں کو جو آخز کے بالاخانے کی چھت پر تھے جن کو شاہان یہوداہ نے بنوایا تھا۔اور ان مذبحوں کو جن کو منسی نے خداوند کے گھر کے دونوں صحنوں میں بنایا تھا بادشاہ نے ڈھا دیا اور وہاں سے چور چور کر کے ان کی خاک کو قدرون کے نالے میں پھنکوا دیا۔اور بادشاہ نے ان اونچے مقاموں (Bamoth) پر نجاست ڈلوائی جو یروشلم کے مقابل کوہ آلائش کے دہنی طرف تھے جن کو اسرائیل کے بادشاہ سلیمان نے صیدانیوں کی نفرتی عستارات اور موآبیوں کے نفرتی کموس اور بنی عمون کے نفرتی ملکوم کے لئے بنایا تھا۔۔اور اس نے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یسیرتوں کو کاٹ ڈالا اور ان کی جگہ میں مردوں کی ہڈیاں بھر دیں۔''(39)

(۲۔سلاطین۔ب۔۲۳:۱۰تا۱۵)

تطہیری مہم کے اس مرحلہ پر ایک پریشان کن تشدد سامنے آتا ہے یہ اسرائیلیوں کی بت پرستی سے کراہت کا آغاز تھا۔بت پرستی نے انبیاء، فقیہوں اور مذہبی گیت لکھنے والوں کو غیض وغضب سے بھر رکھا تھا۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عام اسرائیلی قدیم مذاہب کی علامتوں میں اتنی کشش محسوس کرتے تھے کہ ان

علامتوں کو پرامن طریقے سے ان سے الگ کرنا آسان نہیں تھا۔ مہاتما بدھ ہندوستان میں اپنی اصلاحی تحریک کے دوران تاریک خیالی سے وابستہ علامتوں کو آسانی سے ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن یہاں صورت حال کچھ مختلف تھی۔ دراصل بت پرستی مذہبی جستجو کا ایک حصہ ہوا کرتی ہے کیونکہ خدا انسانوں پر اپنا ظہور براہ راست نہیں کیا کرتا بلکہ اساطیر، عمارتوں، انسانوں، چیزوں، انسانی تصورات اور عقائد میں ملتا ہے۔ خدا کی تمام علامتیں ہمیشہ ناکافی ہوتی ہیں کیونکہ وہ ایسی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں جو ناقابل بیان اور ماورائے ادراک ہوتی ہے۔ لیکن مذہب کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ جب کسی قوم کے حالات تبدیل ہو جاتے ہیں تو قدیم مذہبی اسرار و رموز ان کے لئے کارآمد نہیں رہتے۔ وہ خدا کی موجودگی اور اس سے تعلق کو مزید ظاہر کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہبی معاملات میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ لوگ مذہبی علامتوں اور نشانات مثلاً پتھر، درخت یا عقیدے کو خدا کا درجہ دے دیں۔

یوسیاہ کے دور میں واضح طور پر اسی طرح کی مذہبی تبدیلی ایک عبوری مرحلہ میں تھی۔ تین سو سال تک یروشلم کے لوگوں نے کنعان کے دوسرے مذہبی نشانات سے روحانی غذا حاصل کی تھی۔ لیکن اب یہ نشانات اور مظاہر انہیں اتنے ناقص نظر آنے لگے تھے کہ برائی اور شیطنت کی علامتیں محسوس ہوتے تھے۔ یوسیاہ اور حلقیاہ کو ان مذہبی علامتوں میں روحانیت اور تقدس کی بجائے فحاشی اور گندگی نظر آتی۔ اس دور کی دینیات میں ایک تناؤ تھا جو بعد میں توحید پرستوں کی روایات میں بھی دکھائی دے گا۔ یہ استرداد پوری قوت کے ساتھ شمالی علاقوں میں ابھرا۔ یہ علاقے ماضی میں اسرائیلی ریاست تھے۔ آشوری اب زوال میں تھے چنانچہ صوبہ سامرینہ پر ان کا تسلط زیادہ عرصہ تک نہ رہا۔ وہاں یوسیاہ کی تحریک غالباً الحاق نو کا ایک حصہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ''داؤد کی سلطنت'' پھر سے متحد ہو جائے۔ لیکن یہاں اس کی اصلاح ظالمانہ اور پر تشدد ہو گئی۔ یوسیاہ نے بعل کی قدیم قربان گاہ منہدم کر دی جسے ''کافر'' یربعام نے اسرائیل کا شاہی معبد بنا دیا تھا۔ انتقامی جذبے کے تحت یوسیاہ نے اس کے پتھروں کو تڑوا کر سفوف بنوا دیا۔ پھر اس نے قریبی قبرستان کی قبریں کھدوا کر وہاں سے ہڈیاں نکلوائیں اور قربان گاہ کی بے حرمتی کرنے کے لئے اس کی زمین پر یہ ہڈیاں جلائیں۔ اس نے یہ حرکت اسرائیل میں موجود تمام پرانے مذہبی مقامات پر دہرائی اور ان کے پروہتوں کو قتل کر دیا۔ پروہتوں کی نعشیں انہی کی قربان گاہوں پر جلائیں۔ یہ وحشیانہ پن اور مذہبی جنوں اس مذہبی رواداری کے برعکس تھا جو (حضرت) ابراہیم نے دوسرے مذاہب کے لئے پیش کی تھی۔ یہاں دوسرے مذاہب کے مقدس حقوق کے لئے مکمل احترام کا وہ مظاہرہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ جس کی تلقین انبیاء کرتے رہے تھے۔ لیکن اس جذبے کو توریت کے مورخین یشوع کے طرز عمل میں دیکھ کر سراہتے ہیں جس نے ان کے دعوے کے

مطابق بے رحمی سے اسرائیلیوں کے پیشروؤں کو کنعان میں خدا کے نام پر قتل کیا۔ بدقسمتی سے یہ جذبہ یروشلم کی روحانی فضا کا ایک حصہ بن گیا۔

یوسیاہ کی اصلاحی تحریک صیہون کی مہم بھی تھی۔ وہ یروشلم کو پورے یہوداہ اور اسرائیل میں یہواہ کا ایک اور اکلوتا معبد بنا کر توریت کے نظریہ کو نافذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس مرکزی مقدس مقام کے تحفظ کے لئے دیگر تمام مقدس مقامات کو مسمار اور ان کی بے حرمتی کرنا ضروری خیال کیا جا رہا تھا۔ بیت ایل کے لئے یوسیاہ کی شدت اور تندی خاص طور پر اس لئے تھی کہ اس نے یروشلم کو چیلنج کرنیکی جرات کی تھی۔ شمالی علاقے کے پروھتوں کو قتل کیا گیا لیکن یہوداہ کے مسمار شدہ معبدوں کے پروھتوں کو صرف وہاں سے نکال کر یروشلم میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں انہیں صیہون کے نچلے درجے کے کاہنوں میں شامل کر دیا گیا۔ یروشلم کی سرفرازی کے لئے بقیہ شہروں میں تباہی، موت، بے حرمتی اور بے دخلی عمل میں لائی گئی۔ بنی اسرائیل کے انبیاء نے رحم اور ہمدردی کو مذہب کا لازمی جزو قرار دیا تھا لیکن یوسیاہ کی اصلاحی تحریک نے صرف اور صرف یروشلم کے وقار اور سربلندی کو مقدم رکھا۔

اصلاحی تحریک زندہ نہ رہی البتہ جو جذبہ اس نے پیدا کیا تھا وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا۔ 609 ق م میں یوسیاہ نے مکمل سیاسی خود مختاری کے لئے پیش رفت چاہی اور فرعون نیکوہ دوم پر حملہ کر دیا جو کنعان میں مصر کی موجودگی چاہتا تھا۔ فرعون اس وقت آشوریوں پر یلغار کے لئے دریائے فرات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجدو کے مقام پر یوسیاہ اور فرعون کے درمیان تصادم ہوا۔ یوسیاہ ابتدائی حملہ میں ہی قتل ہو گیا۔ یہوداہ کی اشرافیہ نے یوسیاہ کے بیٹے یہوآخز کو یہوداہ کا بادشاہ بنا دیا۔ لیکن فرعون نیکوہ دوم نے یہوداہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی یوسیاہ کے بیٹے یہوآخز کو معزول کر کے اس کے بھائی یہویقیم کو بادشاہ بنا دیا۔ لیکن مصری زیادہ عرصہ تک یروشلم کو ماتحت نہ رکھ سکے۔ 605 ق م میں بابل کے بادشاہ بنوکدنضر نے مصر اور آشور کو شکست دے دی اور بابل کو مشرق قریب کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔ علاقے کی دیگر ریاستوں کی طرح یہوداہ کی ریاست بھی بابل کی غلام بن گئی۔ ابتدا میں ایسا محسوس ہوا کہ نئی سلطنت کے زیر نگیں یہوداہ خوشحال ہو جائیگی لیکن ایسا نہ ہو سکا تین سال کی محکومی کے بعد یہویقیم بابل سے منحرف ہو گیا۔ اس نے مشنہ کے مضافات میں ایک شاندار محل تعمیر کیا۔ صورت حال اچانک بگڑ گئی اور یروشلم خون ریز خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہویقیم نے مصر سے اتحاد کر لیا جو علاقے میں اپنا اثر ورسوخ بحال کرنا چاہتا تھا۔ مصر کی اعانت سے یہویقیم نے بابل کی طاقت کے خلاف خم ٹھونک لیا۔ انبیاء نے ماضی کی طرح ایک بار پھر لوگوں کو یقین دلایا کہ صیہون پر یہواہ کی موجودگی یروشلم کو بنوکدنضر سے اسی طرح محفوظ رکھے گی جس طرح اس نے سنخریب کے

حملہ کے وقت محفوظ رکھا تھا۔ خودکشی کے اس رویہ کے خلاف یوسیاہ کے ساتھی خلقیاہ کے بیٹے یرمیاہ نے بہت شور مچایا۔ اس نے لوگوں کو متنبہ کیا کہ یہواہ یروشلم کو اسی طرح تباہ کر دے گا۔ جس طرح وہ ایک بار شلوہ (سیلا) کو تباہ کر چکا ہے۔ اس توہین یہواہ پر یرمیاہ کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ اگرچہ یرمیاہ کی جاں بخشی ہوگئی لیکن وہ مسلسل یروشلم کی گلیوں میں گشت کر کے آنے والی تباہی کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرتا رہا۔ لوگ بار بار نعرے لگاتے۔۔۔ " یہ یہواہ کا معبد ہے۔۔" (40) اور یرمیاہ انہیں کہتا۔۔۔ "تم صیہون کو جادوئی طاقت سمجھ کر فیٹش کی طرح پوجتے ہو۔ لیکن یہ یہواہ کا گھر ہے اور یہواہ تمہیں صرف اسی صورت میں تحفظ مہیا کرے گا جب تم دوسرے خداؤں سے منہ موڑ لو گے، ایک دوسرے کے ساتھ ایمانداری اور دیانت داری سے پیش آؤ گے، مسافروں، یتیموں اور بیواؤں کا استحصال کرنے سے باز آ جاؤ گے۔"

اس سے پہلے کہ نبوکد نضر اپنے سرکش غلام کو سزا دینے کے لئے پہنچتا، یہویم کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے یہویاکین کی تخت نشینی کر دی گئی۔ بابل کی فوج نے 597 ق م میں یروشلم کا محاصرہ کیا اور تین ماہ کے بعد شہر میں داخل ہوگئی۔ چونکہ شہزاد خود سرنگوں ہوگیا تھا۔ اس لئے نہ تو قتل عام ہوا اور نہ تباہی و بربادی۔ نبوکدنضر نے معبد لوٹنے اور یہوداہ کی قیادت کو بابل منتقل کرنے پر اکتفا کیا۔

بائبل کا کہنا ہے کہ:

> " وہاں ملک میں سوا کنگالوں کے کوئی اور باقی نہ رہا۔ وہ سارے یروشلم کو اور سب سرداروں اور سب سورماؤں کو جو دس ہزار تھے اور سب دستکاروں اور لوہاروں کو اسیر کر کے یروشلم سے بابل کو لے گیا۔۔ اور یہویاکین بادشاہ، بادشاہ کی ماں اور بیویوں اور اس کے عہدے داروں اور ملک کے رئیسوں کو اسیر کر کے بابل لے گیا۔۔"
> (2۔سلاطین 24:16-14)

قدیم سلطنتوں میں یہ دستور تھا کہ محکوم علاقوں میں آئندہ بغاوتوں کا امکان ختم کرنے اور ہتھیاروں کی تیاری روکنے کے لئے وہاں کے عہدیداروں، جنگجوؤں اور صاحب ثروت لوگوں کے ساتھ ساتھ دستکاروں کو بھی علاقہ بدر کر دیا جاتا تھا۔ (41) یروشلم پر نبوکدنضر کے حملہ کے وقت بھی ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو لوگ باقی رہ گئے تھے، انہوں نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ نبوکدنضر نے یہویاکین کے چچا اور یوسیاہ کے بیٹے صدقیاہ کو یروشلم میں نیا بادشاہ بنایا۔ صدقیاہ نے بھی اپنے اقتدار کے آٹھویں برس میں بابل کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ اس دفعہ جب نبوکدنضر یروشلم میں داخل ہوا تو

اس نے رحم و مروت سے قطعاً کوئی کام نہ لیا۔ بابلیوں نے 18 ماہ تک شہر کا محاصرہ برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ اگست 588 ق م میں شہر پناہ توڑ دی گئی۔ بادشاہ اور اس کی فوج نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن بابل کی فوج نے تعاقب کیا اور یریحو کے قریب گرفتار کر لیا۔ صدقیاہ کے بیٹوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا گیا اور پھر اس کی آنکھیں نکال کر پابہ زنجیر بابل روانہ کر دیا گیا۔ اب بابلی کمانڈر نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ شہر کو زمین بوس کرنا شروع کیا۔ پہلے اس نے معبد سلیمانی کو آگ لگائی۔ پھر شاہی محل کو اور پھر یروشلم کے تمام گھروں کو جلا دیا۔ معبد سلیمانی کی تمام قیمتی چیزیں بابل بھیج دی گئیں۔ بائبل تفصیل کے ساتھ ان تمام اشیاء کا ذکر کرتی ہے جو اہل بابل لوٹ کر لے گئے لیکن تابوت یہواہ (عہد نامے کے صندوق) کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا جو ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ چنانچہ بعد میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ (41) قدیم دنیا میں کسی شاہی معبد کی تباہی کا مطلب ریاست کی تباہی ہوتا تھا۔ کوئی ریاست اپنے کسی ایسے مرکز کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی جو آسمان کے ساتھ اس کا تعلق قائم کرتا ہو۔ یہواہ کو بابل کے دیوتا مروک نے شکست دے دی۔ یہوداہ کی ریاست ختم ہو گئی۔ مزید 823 افراد تین مرحلوں میں علاقہ بدر کئے گئے۔ اب پیچھے صرف مزدور، دیہاتی اور کسان رہ گئے۔

یرمیاہ علاقہ بدر کئے جانے والے لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ شائد اس لئے کہ اس کا موقف بابلیوں سے ملتا جلتا تھا۔ جب تباہی نازل ہو گئی تو یرمیاہ، غیب دان، اپنے لوگوں کا مسیحا بن گیا۔ اس نے جلاوطن کئے جانے والے لوگوں کو لکھا۔ ''یہواہ کی خدمت اجنبی سرزمین میں بھی ممکن ہے، وہاں آباد ہو جاؤ، باغ لگاؤ، مکان تعمیر کرو اور نئے ملک کی تعمیر میں حصہ لو۔ (43) تابوت یہواہ کی کمی کوئی بھی محسوس نہیں کرے گا۔ کوئی نیا تابوت نہیں بنایا جائے گا۔ (44) جلاوطن کئے جانے والے ایک دن واپس آئیں گے، وہ یروشلم کے اردگرد، یہوداہ کے شہروں میں، کوہستان، وادی اور جنوب کے علاقوں میں زمینیں خریدنے کے لئے واپس آئیں گے۔'' (45)

معبد کی تباہی کو یہواہ کا خاتمہ سمجھنا چاہئے۔ وہ اپنے شہر کو تحفظ دینے میں ناکام رہا۔ اس نے دکھایا کہ وہ صیہون کا مضبوط قلعہ نہیں تھا۔ یروشلم ''بیابان'' بن گیا۔ انتشار اور بربادی کی قوتیں کامیاب ہو گئیں۔ صیہونی وعدہ سراب ثابت ہوا۔ لیکن انہی کھنڈروں میں سے ابھی یروشلم شہر کو ایک ایسا مذہبی نشان بن کر ابھرنا تھا جو مستقبل کے لئے ایک نئی امید کو جنم دے سکتا تھا۔

================

حوالہ جات

1۔ سلاطین 12:11

2۔ یسیعاہ 27:1، ایوب 3:12، 26:12، زبور 74:14

3۔ ایوب 38:10

4۔ زبور 89:10

5۔ زبور 48:3۔ یہ ترجمہ بائبل کے یروشلم نسخہ سے نہیں لیا گیا بلکہ زیڈ، اسمتھ کی کتاب ''ارتھ اینڈ گاڈز'' سے لیا گیا ہے

6۔ زبور 48:12-14

7۔ زبور 46:5-9

8۔ زبور 46:1

9۔ زبور 99

10۔ زبور 47:5-6

11۔ زبور 97:2، یسیعاہ 6:4

12۔ زبور 47:2، 99:1-4

13۔ زبور 97:9

14۔ زبور 84:5-7

15۔ زبور 84:3

16۔ 2۔ سیموئیل 7:10.12

17۔ زبور 84:1-2

18۔ زبور 84:10

19۔ بادشاہ عزیاہ کے دور کی تاریخی ترتیب کئی اور بادشاہوں کے ادوار کی طرح توریت کی پانچویں

کتاب اور تواریخ کے مولفین نے غلط دی ہے۔عزیاہ کا معاملہ بالخصوص پیچیدہ ہے کیونکہ اس کی بیماری کے دوران اس کا بیٹا یوتام امور سلطنت سرانجام دیتا تھا۔

20۔ یسعیاہ 6:3

21۔ یسعیاہ 2:2-3

22۔ یسعیاہ 11:6-9

23۔ یسعیاہ 1:11-12

24۔ یسعیاہ 1:16-17

25۔ عاموس 5:25-27

26۔ عاموس 1:2

27۔ زبور 9:10-13

BEN C. OLLEN BURGER, ZION, The city of the great king (SHEFFIELD-1987) pp. 58-69

28۔ یسعیاہ 7:14-17

29۔ 2۔تواریخ 29-30

30۔ میکاہ 3:12

31۔ 2۔ سلاطین 29:34

32۔ 2۔ تواریخ 32:21

33۔ 2۔ سلاطین 21:1-18، 2۔تواریخ 33:1-10

34۔ 1۔ سلاطین 8:27

35۔ استثنا 16:13-15

36۔ استثنا 6:4 (سن اے اسرائیل۔خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے)

37۔ استثنا 12:1-4

HAROLD H. ROWELEY: Worship in Ancient Isreal. Its forms & meaning (London - 1967) pp. 106-7

38۔ 2۔ سلاطین 22:2، 2۔ تواریخ 34:8-28

39۔ 2۔ سلاطین 14-23:10

40۔ یرمیاہ 7:3-7

41۔ بابل کو جلاوطن کئے جانے والے افراد کی تعداد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یرمیاہ نبی کا کہنا ہے کہ صرف 3023 افراد کو بابل بھیجا گیا لیکن وہ تین گروہوں کی صورت میں یہوداہ سے روانہ ہوئے۔

42۔ میکابیز 2:4-5‘ یوما 52-B‘ حورایوت 12A‘ جےشیکالیم 6:1

43۔ یرمیاہ 29:5-10

44۔ یرمیاہ 3:16

45۔ یرمیاہ 32:44

===============

پانچواں باب

جلاوطنی

یروشلم اوراس کے معبد کی تباہی ایک گہرے مفہوم میں بنی اسرائیل کی دنیا کا خاتمہ تھا۔یہواہ نے اپنا شہر چھوڑ دیا۔اور یروشلم ایک ''بیابان'' بن گیا۔تخلیق سے پہلے کی بے ترتیبی اور ابتری غالب آ گئی۔تباہی تخلیق کو معدوم کرنے کا ایک عمل تھا جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سیلاب نے دنیا میں زندگی ناپید کر دی تھی۔یرمیاہ کی پیشن گوئی کے مطابق یروشلم ایک ایسے بیابان کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں سے پرندے بھی کوچ کر جاتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ نظام کائنات میں خلل آ گیا ہے۔سورج اور چاند روشنی نہیں دیتے۔پہاڑ لرزتے رہتے۔''روئے زمین'' پر کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیتا تھا۔(1) شاعر دہشت کے ساتھ وہ دن یاد کرتے جب بابل کے سپاہی معبد میں دندناتے پھرتے تھے،خانہ اقدس میں ان کے کہلاڑوں اور ہتھوڑوں کی ضربیں ابھی تک شاعروں کے کانوں میں گونجتی تھیں۔

اوراب وہ اس کی ساری نقش کاری کو
کلہاڑی اور ہتھوڑوں سے بالکل توڑے ڈالتے ہیں
انہوں نے تیرے مقدس میں آگ لگا دی ہے
اور تیرے نام کے مسکن کو زمین تک مسمار کر کے
ناپاک کر دیا ہے۔(2) (زبور 74:7-3)

وہ انتقام اور مکافات عمل کے متمنی تھے۔ان کی آرزو تھی کہ بابل کے بچوں کے سر چٹانوں پر پٹخے جائیں۔(3)

اے بابل کی بیٹی جو ہلاک ہونے والی ہے
مبارک ہوگا، جو تجھے اس سلوک کا
جو تو نے ہم سے کیا، بدلہ دے
چٹان پر پٹخ دے گا۔ (زبور=137:8-9)

یہوداہ کے لوگ تضحیک کا سامان بن چکے تھے۔مہذب قوموں کے لوگ ان کا تمسخر اڑاتے اور پوچھتے۔۔۔۔"کہاں ہے تمہارا خدا؟"(4) معبد کے بغیر قدیم دنیا میں خدا سے رابطہ ناممکن تھا۔یہواہ غائب ہو چکا تھا۔معبد ملبے کا ڈھیر تھا اور خدا کے لوگ اجنبی سرزمین پر بکھرے پڑے تھے۔

مشرق قریب میں دستور تھا کہ جب کوئی شہر تاخت و تاراج کیا جاتا تو اس کے زندہ بچ رہنے والے لوگ کھنڈروں پر بیٹھ کر اسی طرح نوحہ خوانی کرتے جیسے کسی عزیز کی موت پر کی جاتی ہے۔یہوداہ اور اسرائیل کے بچ رہنے والے لوگ سال میں دو دفعہ اپنے مقدس شہر کا سوگ منایا کرتے تھے۔ایک دفعہ ماہ ایو کی نو تاریخ کو تباہی کی برسی کے موقعہ پر اور دوسری دفعہ سکوتھ کے روز معبد کے لئے وقف ہونے کی سالگرہ کے موقع پر۔وہاں آنے والے لوگوں کے بارے میں بائبل ہمیں بتاتی ہے۔

"اس کے دوسرے دن یوں ہوا کہ سکم اور سیلا اور سامریہ سے کچھ
لوگ جو سب کے سب اسی تھے ڈاڑھی منڈائے اور کپڑے پھاڑے
اور اپنے آپ کو گھائل کئے اور ہدیئے اور لوبان ہاتھوں میں لئے
وہاں آئے تا کہ خداوند کے گھر میں گزرانیں۔(5) (یرمیاہ=41:6)

کتاب گریہ میں کچھ نوحے محفوظ ہیں جو زمین بوس معبد کے قریب سوگ کے روایتی انداز میں بیٹھ کر یہوداہ اور اسرائیل کے بڑوں نے پڑھے تھے۔سوگ کا روایتی انداز ٹاٹ کے کپڑے پہننا اور پیشانی پر راکھ ملنا تھا۔۔۔۔یہ نوحے یروشلم کی بربادی کے دلدوز مناظر پیش کرتے ہیں۔ایک گنجان آباد شہر جس کی گلیاں زائرین سے بھری رہتی تھیں اب وہاں ھو کا عالم تھا۔چوک خالی، گلیاں سنسان، مکان کھنڈر اور گیدڑوں

کی پاتال سے ابھرتی ہوئی وحشت ناک آوازیں۔ان نوحوں نے شدید نفسیاتی اثر مرتب کیا اور باقی بچ رہنے والے لوگ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگے۔ جو لوگ 596 ق م میں مر گئے وہ خوش قسمت ثابت ہوئے۔ اب لوگ گندگی کے ڈھیروں میں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے پھرتے تھے۔کمزور دل ماؤں سے اپنے بچوں کی بھوک نہ دیکھی جا سکی۔انہوں نے خود اپنے بچوں کو ہلاک کر دیا۔کتاب گریہ کے ایک نوحہ میں لکھا ہے:

”اس کے شرفا برف سے زیادہ صاف اور دودھ سے زیادہ سفید تھے۔
ان کے بدن مونگے سے زیادہ سرخ تھے۔ان کی جھلک نیلم کی سی
تھی۔اب ان کے چہرے سیاہی سے بھی زیادہ کالے ہیں اور ان کا
چمڑا ہڈیوں سے سٹا ہے۔وہ سوکھ کر لکڑی سا ہو گیا ہے۔“(6)

سب سے بڑھ کر اذیت ناک بات احساس ذلت تھا۔یروشلم،مقدس شہر اب ناپاک ہو چکا تھا۔ جو لوگ اس کی تعریف کیا کرتے تھے اب اسے تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔شہر خود بھی سسک رہا تھا۔اور اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔اس کا لباس حیض آلود خون سے نجس ہو چکا تھا۔(7) لیکن مایوسی کی تاریکیوں میں بھی جو نوحے لکھے گئے ان میں بابلیوں کو موردالزام ٹھہرانے کی بجائے اپنے گناہوں کو نظر میں رکھا گیا۔نوحے لکھنے والوں کو علم تھا کہ یہواہ نے یروشلم کو بنی اسرائیل کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کیا ہے۔

یروشلم اب مزید قابل رہائش نہیں تھا۔شہر کے جنوب کا علاقہ تو اس طرح تباہ ہوا تھا کہ آباد کرنا ناممکن تھا۔ یہوداہ کی سابق ریاست کے انتہائی جنوب میں ادومیوں نے غلبہ پا لیا اور ادومیہ کی ریاست کی بنیادیں رکھ دیں۔یہوداہ کے زیادہ تر لوگ جو 586 ق م میں باقی بچ رہے تھے وہ سامرینہ چلے گئے یا یروشلم کے شمال میں بیت ایل اور اس کے مضافات میں آباد ہو گئے۔ بابلیوں نے بادشاہ یوسیاہ کے محرر کے پوتے جیدالیاہ کو علاقے کا گورنر مقرر کیا۔اس نے اپنے شہر مصفاہ میں رہتے ہوئے حالات پرسکون بنانے کی کوشش کی۔ بابلیوں نے ملک کی تعمیر نو کے لئے وہاں رہ جانے والے لوگوں کو علاقہ بدر لوگوں کی زمینیں دیدیں۔ یہوداہ کے جو لوگ ماضی میں نہایت غریب اور استحصال زدہ تھے انہیں زمینیں مل گئیں لیکن نئے وفادار پیدا کرنے کی کوششیں ناکام رہیں۔582 ق م میں سابقہ یہودائی فوج کے جو افسران موارئے اردن کو بھاگ گئے تھے وہ واپس آ گئے۔انہوں نے خاندان داؤد کے ایک فرد اسماعیل کی قیادت میں منظم ہو کر گورنر جیدالیاہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔لیکن یہ بغاوت ناکام ہو گئی کیونکہ اسماعیل عوامی حمایت نہ حاصل کر سکا وہ

عمون کو بھاگ گیا۔ سیاسی طور پر زیادہ فعال لوگ بابلیوں سے بچنے کے لئے مصر کو ہجرت کر گئے۔ اگلے پچاس برس تک یہوداہ اور یروشلم کے بارے میں تاریخ کے اوراق خاموش ہیں۔

بے وطنی کی اذیت کے باوجود جلا وطن کئے گئے لوگ آسودہ حال ہو گئے۔ انہیں بابل میں ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنایا گیا۔ بادشاہ یہویاکین بابل کے دربار میں رہا اس کا شاہی منصب بحال رکھا گیا۔(8) جلا وطن ہو کر آنے والے لوگ بابل اور اس کے گردونواح کے پرکشش اور اہم علاقوں میں آباد ہو گئے۔ یہ علاقے ''عظیم نہر'' کے قریب تھے جو دریائے فرات سے شہر میں پانی لانے کا ذریعہ تھی۔ ان لوگوں نے بابل کے مختلف مقامات کے نام عبرانی میں رکھ لئے۔ مثلاً کچھ لوگ جس مضافاتی علاقے میں رہتے تھے، انوں نے اس کا نام ''تل ابیب'' رکھ لیا۔ جلا وطنوں نے یرمیاہ کی نصیحت پر صدق دل سے عمل کیا اور بابلی معاشرے کا جزو بن گئے۔ انہیں آپس میں آزادانہ ملنے، زمینیں خریدنے اور کاروبار کرنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ بہت سے بہت جلد متمول اور معروف تاجر بن گئے۔ کچھ افراد کو دربار میں منصب مل گئے۔ انہوں نے ان اسرائیلیوں کی اولاد سے میل جول بڑھالیا جن کو بابلیوں نے 722 ق م میں جلا وطن کیا تھا۔ بہت سے جلا وطن جن کا ذکر بائبل میں موجود ہے، شمالی علاقوں کے دس قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔(9)

لیکن ان سب کیلئے بابل میں قیام ایک صدمہ اور ایک چیلنج تھا۔ یہ عالیشان شہر ان تمام شہروں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ اور عروس البلاد تھا جن کو وہ ماضی میں اپنے ملک میں دیکھ چکے تھے۔ اپنے پچاس معبدوں کے ساتھ بابل ایک ایسی مذہبی دنیا تھا جو کنعان کے قدیم اصنام پرست مذہب سے زیادہ پیچیدہ تھی۔ لیکن اس کی کچھ رسوم ان کے لئے مانوس تھیں۔ یہواہ کو مردک سے شکست ہو چکی تھی اور اب وہ مردک کے علاقہ میں رہ رہے تھے چنانچہ بہت سے لوگ متاثر ہو گئے اور انہوں نے مقامی مذہب اختیار کر لیا۔ کچھ لوگ غالباً بابل کے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ساتھ یہواہ کی عبادت بھی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کے نام مقامی لوگوں کی طرح دیوی دیوتاؤں کی نسبت سے رکھنا شروع کر دیئے۔ مثلاً شامیش لیدن (شامیش دیوتا فیصلہ کرے) اور بلیادیک (بعل حفاظت کرے) وغیرہ، لیکن بقیہ لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے۔(10)

MAP (نقشہ)

معبد کی تباہی اور بابل کو جلا وطنی کے بعد یہودیوں نے قوانین موسیٰ کو خدا سے رابطہ کا ذریعہ اور

توریت کو معبد بنالیا تھا۔اس کے بعد یہودی بچوں کے لئے توریت کی تعلیم لازمی قرار دیدی گئی۔

توریت کے مولفین 586 ق م کے ازلمیہ کو اپنی اصابت رائے کا ثبوت تصور کرتے ہوں گے۔وہ بالکل درست تھے۔قدیم کنعانی دیو مالا جس نے اہل یہوداہ کے اس عقیدہ کو توانا کیا کہ صیہون نا قابل تسخیر ہے، حقیقت میں ایک سراب اور خود فریبی ثابت ہوا۔اس کے برعکس توریت کا اصرار تھا کہ حضرت موسیٰ کے قوانین پر توجہ دی جائے اور بنی اسرائیل کے ساتھ یہواہ کے اس عہد نامے کی پابندی کی جائے جو انہیں اس وقت عطا کیا گیا تھا جب ابھی کسی نے یروشلم کا نام بھی نہیں سنا تھا۔موسوی شریعت انہیں جلا وطنی اور بابل کی بھٹی میں ان کی شناخت تحلیل ہونے سے بچا سکتی تھی۔جلا وطنی کے برسوں میں مذہبی استقامت رکھنے والے لوگوں نے اپنے اصول وضوابط مرتب کئے اور وہ طرز عمل اپنایا جو انہیں اصنام پرست پڑوسیوں سے مختلف رکھ سکتا تھا۔وہ اپنے لڑکوں کے ختنے کرواتے، سبت کے دن کام کرنے سے گریز کرتے اور خورد ونوش کے خصوصی قوانین پر عمل کرتے جو انہیں عہد نامے کے لوگوں کی حیثیت سے ایک مختلف شناخت مہیا کرتے تھے۔انہیں خود کو ایک ''مقدس'' قوم ثابت کرنا تھا۔اپنے خدا کی طرح مختلف اور ممتاز۔

بقیہ جلا وطنوں نے قدیم دیو مالائی مذہب میں ہی تسکین محسوس کی۔وہ سمجھتے تھے کہ صیہون کے قدیم نشان اور داستانیں زیادہ پرشکوہ ہیں اور صورت حال کے مطابق ان کے لئے وقار کا ذریعہ ہیں۔مذہب کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ بحران اور انقلاب کے وقت لوگ مذہب کی کسی دانشمندانہ اور معقول صورت کی بجائے اساطیر اور مفروضوں کی طرف تیزی سے لپکتے ہیں۔نفسیات کی طرح اساطیر بھی لاشعور میں داخل ہو کر انسانی شخصیت پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ہمارے اپنے زمانہ میں دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک جلا وطن اپنے طور طریقوں میں محض تبدیلی سے نہیں گزرتا بلکہ کہیں زیادہ مقامی اثرات قبول کرتا ہے۔جلاوطنی ایک فرد کے روحانی ماحول کو بھی تبدیل کر دیتی ہے۔دنیا میں اپنا الگ تھلگ مقام گنوا کر جلا وطن اپنے آپ کو بھٹکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔کائنات اس کے لئے اچانک اجنبی اور نا مانوس ہو جاتی ہے۔جب ایک دفعہ ''گھر'' کا متعین مقام کھو جاتا ہے تو پھر اپنے درست ترین محل وقوع کی بنیادی کمی ہر چیز کو بے معنی اور بے مقصد بنا دیتی ہے۔اپنی ثقافت اور اپنی شناخت کی جڑوں سے کٹ کر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مرجھا رہے ہیں بے وقعت ہو گئے ہیں۔چنانچہ فرانسیسی ماہر عمرانیات آر،پی ٹرلز کا کہنا ہے کہ اپنی آبائی سرزمین سے نکلنے پر مجبور ہونے کے بعد ''کیبون بونوں'' نے محسوس کیا کہ پوری کائنات درہم برہم ہو گئی ہے۔ان کا خالق ان سے

ناراض تھا۔ دنیا ایک تاریک مقام بن چکی تھی۔ رات، رات اور مسلسل رات۔۔۔ان کی جلاوطنی نے ان کے آباواجداد کی روحوں کو بھی جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا۔ جواب دور دراز، ناقابل رسائی میدانوں میں بھٹک رہی تھیں اور ہمیشہ کے لئے دربدر ہوگئی تھیں۔''

کیا وہ روحیں زمین پر ہیں؟ کیا وہ یہاں ہیں؟
کیا وہ ان نذرانوں کی زیبائش کو دیکھتی ہیں؟
آنے والا کل عریاں اور خالی ہے
کیونکہ خالق اب مزید ہمارے ساتھ نہیں
اب وہ ہماری آگ کے پاس میزبان کی مسند پر نہیں(11)

مادر وطن سے محروم ہو جانے کا مطلب تھا کہ آسمان سے تعلق جو زندگی کو قابل اعانت بناتا ہے، ٹوٹ چکا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں جلاوطن یہودیوں نے اس کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ ان کی دنیا انجام کو پہنچ گئی ہے۔

جو لوگ یہواہ کے مذہب اور اپنے آباواجداد کی رسوم سے وابستہ رہنا چاہتے تھے انہیں ایک سنگین مسئلہ درپیش تھا۔ جب جلاوطن یہ کہتے تھے کہ۔۔۔۔۔ہم ایک اجنبی سرزمین پر یہواہ کا کوئی گیت کیسے گا سکتے ہیں؟(12) تو وہ محض وطن کی یاد کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مذہبی طور پر دہری مشکل کا بھی اظہار کرتے تھے۔ آج مذہبی لوگوں کا ایمان ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی اپنے خدا سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ جنگلوں میں، پہاڑوں میں، شہروں میں، بازاروں میں، گھروں میں، عبادت گاہوں میں کہیں بھی وہ خدا کو مخاطب کر سکتے ہیں۔ لیکن قدیم دنیا میں کی جانے والی عبادت آج کے دور سے بہت مختلف تھی۔ جلاوطنی کے دوران یہودیوں نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ یروشلم کی طرف منہ کر کے اپنے ہاتھ اٹھاتے اور یہواہ کی حمد وثنا کرتے یا اس سے عہد و پیمان کرتے۔ یہ طریقہ کار قربانی کا متبادل تھا اور قربانی کو دیوی دیوتاؤں سے رابطہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔(13) لیکن عبادت کا یہ نیا طریقہ ایک انوکھا تصور تھا اور پہلے جلاوطن ہونے والوں کا معمول نہیں تھا۔ جلاوطنی نے یہودیوں کو محوری دور کی زیادہ سے زیادہ داخلی روحانیت سکھائی ہوگی۔ جب وہ پہلے 597 قبل مسیح میں جلاوطن ہو کر بابل میں آئے تو انہوں نے صرف اتنا محسوس کیا ہوگا کہ انہیں یہواہ کی موجودگی سے دور کر دیا گیا ہے۔ اس کا گھر صیہون میں تھا اور وہ اس کے لئے بابل میں کوئی گھر تعمیر نہیں کر سکتے تھے جس طرح

آج ہم کہیں بھی چرچ، مسجد اور صومعہ بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ توریت کے مولفین کے مطابق بنی اسرائیل کا صرف ایک جائز اور قانونی معبد ہے جو یروشلم میں پایا جاتا ہے۔ گیون کے بونوں کی طرح یہودی جلاوطن بھی الجھن میں ہوں گے کہ کیا انکا خالق واقعی ان کے ساتھ اجنبی شہر میں موجود ہے؟ اس سے پہلے تو یہودی اور اسرائیلی اجتماعی عبادت کے لئے صرف ایسے مقامات پر اکٹھے ہوتے رہے تھے جن کا تعلق یہواہ کے انکشاف سے یا پھر کسی طرح کے مذہبی اسرار و رموز سے تھا۔ لیکن بابل میں کہیں بھی کوئی ایسا مقام نہیں تھا جہاں یہواہ کی رویت کا واقعہ کسی کے علم میں ہو۔

پھر یہواہ نے تل ابیب میں اپنا ظہور کیا۔ 597 ق م میں بابل میں آنے والے جلاوطنوں کے پہلے گروہ میں بنی حزقی ایل بھی موجود تھا۔ پلے پانچ سال تک وہ اپنے گھر میں اکیلا پڑا رہا۔ اس نے کسی انسان سے بات نہ کی۔ پھر یہواہ کی رویت نے حقیقی طور پر اس کو اعصاب زدہ کر دیا اور وہ پورا ایک ہفتہ مضحل پڑا رہا۔ روشنی کا ایک بادل اسے شمال سے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا جس کے اندر ایک رتھ تھا جسے چار فرشتے کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔ یہ فرشتے عجیب طرح کی مخلوق تھے اور ان شبیہوں سے قطعاً مختلف تھے جو بابل کے دروازے پر کندہ کی گئی تھیں۔ بابل میں انہیں کیریبو (کروبی) کہا جاتا تھا۔ جب حزقی ایل نے اس پیکر کو بیان کرنا چاہا تو وہ ناکام رہا۔ اس کا اظہار عام لفظوں اور تشبیہوں سے کرنا ناممکن تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ۔۔۔ تخت جیسی کوئی چیز اور اس تخت پر انسان جیسی کوئی ہستی تھی۔ طوفان، آگ اور ہنگامہ خیز شور کی مخلوط کیفیت میں حزقی ایل کو معلوم ہوا کہ اس نے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جو یہواہ کے پر شکوہ جمال جیسی ہے۔ (14) یسعیاہ کی طرح حزقی ایل نے حقیقت اعلیٰ کی جھلک دیکھی تھی جو معبد کے مقدس نشانات کے پیچھے موجود تھی عہد نامے کا صندوق۔۔۔ یہواہ کا زمینی تخت ابھی یروشلم کے معبد میں تھا لیکن اس کی تجلی اور جلال، بابل میں پہنچ گئے تھے۔ درحقیقت یہ ایک نزول، الہام اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ بہت بڑے اسرار کا بے نقاب ہونا۔ عظیم پردہ جس نے معبد سلیمانی میں خانہ اقدس (دیور) کو ہیکل سے الگ کر رکھا تھا، انسانی شعور و ادراک کی آخری حدوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اب یہ نقاب ایک طرف سرکا دیا گیا تھا۔ حزقی ایل بذات خود یہواہ اور اس کے جلال کے درمیان امتیاز کر سکتا تھا۔ جلال جو اس کی موجودگی کا اظہار تھا اور جس نے خدا کی ناقابل بیان حقیقت کو انسانوں کے لئے قابل فہم بنا دیا تھا۔ یہ رویا ایک قدیم عقیدے کی چونکا دینے والی نئی صورت تھی۔ ابتدائی دنوں میں بنی اسرائیل کے علم میں یہ بات آ گئی تھی کہ خدا حرکت کر سکتا ہے۔ وہ سینا سے کنعان میں اپنی قوم کے پاس فرشتوں کے پروں پر بیٹھ کر آیا تھا۔ اب فرشتوں نے اسے اپنے بندوں کے پاس جلاوطنی میں پہنچایا تھا۔ وہ اس علاقے کے دیگر خداؤں اور دیوی دیوتاؤں کی طرح کسی خاص مقام سے

وابستہ اور نا قابل حرکت نہیں تھا چنانچہ وہ صرف معبد یا ارض موعودہ تک محدود نہیں تھا۔

ایک اور وجہ بھی تھی جس کے لئے یہواہ نے یروشلم میں رہنے والے اہل یہوداہ کی بجائے جلاوطنوں کے ساتھ رہنے کا انتخاب کر لیا تھا۔حزقی ایل کو یہواہ کی رویت 592 ق م کے قریب ہوئی تھی۔ بنوکدنضر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی سے چھ سال پہلے۔لیکن بعد کی ایک رویا میں اسے پتہ چل گیا تھا کہ یروشلم کو تباہی کے لئے نشان زد کر دیا گیا ہے کیونکہ یہوداہ کے لوگ میثاق بنی اسرائیل سے منحرف ہو چکے ہیں اور مقدس معبد کی چار دیواری میں غیر خداؤں کی عبادت کر رہے ہیں۔ایک دن حزقی ایل، تل ابیب میں اپنے گھر میں جلاوطن یہودیوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس پر اچانک یہواہ کا ہاتھ نازل ہوا اور اس کو روحانی طور پر اٹھا کر یروشلم لے گیا۔وہاں اسے معبد کا منظر دکھایا گیا جس میں عبادت گزار غیر خداؤں کے سامنے سجدہ ریز ہو رہے تھے۔حزقی ایل یہ منظر دیکھ کر لرز گیا۔اسے بتایا گیا کہ ان ''گندی حرکتوں'' سے نالاں ہو کر یہواہ یروشلم کو چھوڑ رہا ہے۔حزقی ایل نے دیکھا کہ فرشتوں نے اپنے پر پھیلا دیئے۔مقدس رتھ (تخت) کے پہیے حرکت میں آ گئے۔اور ''یہواہ کے جلال'' کو اٹھائے ہوئے وہ یروشلم سے نکلے اور شہر کے مشرق میں کوہ زیتون کے اوپر غائب ہو گئے۔ یہواہ نے اب جلاوطنوں کی برادری میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اس رویا کا ایک ہی مطلب تھا کہ اب چونکہ یہواہ یروشلم سے ہجرت کر گیا ہے، اس لئے شہر کی تباہی کسی بھی وقت رونما ہو سکتی ہے۔(15)

لیکن یہواہ نے اسی نبی وعدہ کیا تھا کہ ایک دن وہ اپنے شہر کو واپس آئے گا۔کوہ زیتون کیا سی راستے سے واپس آئے گا اور صیہون پر اپنے مسکن کو پھر سے آباد کرے گا۔ایکنیا خروج برپا ہوگا۔منتشر جلاوطن اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے اور ایک نئی تخلیق ظہور میں آئے گی جس میں بدتہذیب ویران اور سنسان سر زمین ''باغ عدن'' میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ وقت تسکین واندمال کا ہوگا۔یہوداہ اور اسرائیل کے لوگ ''داؤدی سلطنت'' میں ایک بار پھر متحد ہو جائیں گے اور جس طرح یہواہ باغ عدن میں رہتا ہے اسی طرح یہاں اپنے لوگوں میں رہے گا۔(16) اجنبیت، کدورت اور فرقت کا خاتمہ ہو جائے گا۔اس کلیت کی طرف مراجعت ہوگی جس کی تمنا لوگوں کو ہے۔یروشلم اس رویا کا مرکز تھا۔بنوکدنضر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی کے چودہ سال بعد حزقی ایل یا اس کے شاگردوں میں سے کسی نے ایک اونچے پہاڑ پر ایک شہر کو رویا میں دیکھا۔اس کا نام ''یہواہ شم'' تھا یعنی یہواہ یہاں ہے۔(17) یہ شہر ایک جنت ارضی تھا۔قدیم اصطلاحوں میں امن اور زرخیزی کا مقام۔جس طرح دریا باغ عدن کے وسط میں پھوٹتا اور مقدس پہاڑ سے نشیب کو بہتا ہوا پوری دنیا کو سیراب کرتا ہے اسی طرح حزقی ایل نے دیکھا کہ:

''ایک دریا شہر کے معبد کے نیچے پھوٹ رہا ہے اور معبد کے احاطہ سے نکل کر مضافات کو زندگی اور شفا بخش رہا ہے۔ اس دریا کے کناروں پر ایسے درخت تھے جن کے پتے کبھی نہیں مرجھاتے اور پھل کبھی موقوف نہیں ہوتے۔ جو کھانے میں خوش ذائقہ اور تاثیر میں شفا بخش ہیں۔(18) (حزقی ایل47:12)

جلاوطن چونکہ اجنبیت اور فراق کی اذیت میں مبتلا تھے چنانچہ وہ قدیم دیومالا میں تسکین پانے لگے جو انہیں ان کی اپنی سرزمین کو مراجعت کی نوید سناتی تھی۔

لیکن حزقی ایل نے خود کو ماضی سے نہیں چپکا رکھا تھا وہ مستقبل کے لئے ایک نیا منظر تشکیل دے رہا تھا۔ چونکہ اس کے تصور میں ''یہواہ شم'' کا شہر تھا چنانچہ اس نے مقدس شہر کا ایک نیا نقشہ ترتیب دیا۔ شہر کے وسط میں معبد، معبد سلیمانی کی نقل تھا جو اب کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کے برآمدے، ڈیوڑھی ہیکل اور خانہ اقدس (دیور) تقدیس کے تدریجی مقام تھے۔ ہر درجہ پچھلے درجہ سے زیادہ مقدس تھا۔(19) جس طرح پرانے معبد میں خانہ اقدس تک مختلف درجوں سے ہو کر ہی پہنچا جاتا تھا اور ہر ایک کو اعلیٰ ترین مقام یعنی خانہ اقدس تک جانے کی اجازت نہیں تھی، یہی پابندی مجوزہ معبد کے لئے بھی تھی۔ یہ تصور حزقی ایل کے رویا کا مرکزی نکتہ تھا اور یہی اس کی مثالی دنیا کے نئے نقشہ کی بنیاد تھی۔ البتہ مجوزہ معبد، معبد سلیمانی سے دو اہم پہلوؤں سے مختلف تھا۔ بادشاہ کا محل معبد کے ساتھ نہیں تھا اور معبد کی عمارتوں کے ارد گرد دو فصیل بند صحن تھے۔(20) یہواہ کی تقدیس کو غیر مقدس دنیا سے انتہائی احتیاط کے ساتھ الگ اور ممتاز انداز میں پیش کیا جانا تھا۔ خدا اب زیادہ موارائی حقیقت اور دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہستی بن رہا تھا۔ j یعنی بائبل کے پہلے مصنف نے تصور پیش کیا تھا کہ یہواہ حضرت ابراہیم کے پاس ایک دوست کی طرح بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ لیکن حزقی ایل، محوری دور کا نبی تھا، اس کے خیال میں خدا ایک بلند و بالا اسرار تھا جو تمام تر انسانوں پر غالب ہے۔ لیکن خدا کو ضروری طور پر دوسری شے یا مدرک بنانے کے باوجود یہ اب بھی انسانوں کی دنیا کا مرکز اور ان کی زندگی اور طاقت کا ذریعہ تھا۔ ایک حقیقت، جسے حزقی ایل کی رویا میں جنت کے دریا کی صورت میں علامتی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اب حزقی ایل نے ارض موعودہ کو جس طرح پیش کیا وہ اس کے طبعی جغرافیہ میں ابہام پیدا کرتا تھا۔ مثلاً یہواہ شم، یروشلم کے برعکس زمین کے بالکل مرکز میں ہے اور اسرائیل اور یہوداہ کی مشترکہ

سلطنت سے بڑا اور شمال میں پالمیرا تک اور مغرب میں مصر کے دریا تک پھیلا ہوا۔(21) حزقی ایل حقیقی معنوں میں اپنے مادر وطن کی تفصیلات نہیں بتا تا بلکہ ایک روحانی سلطنت کا تصور تخلیق کرتا ہے۔خدائی قوت یہواہ شم کے شہر سے اسرائیل کی سرزمین اور اس کے لوگوں پر ضوفشاں ہے۔دور دراز مقامات پر یہ ضوفشانی دھیمی پڑ جاتی ہے۔معبد اس دنیا کا مرکز ہے۔اگلا درجہ یا علاقہ شہر ہے جس نے معبد کی عمارتوں کو گھیرا ہوا ہے۔ پھر معبد اور شہر کے ارد گرد خصوصی علاقہ ہے جس میں مقدس افراد رہتے ہیں۔ان میں بادشاہ، کاھن اور سرکاری عمال شامل ہیں۔ یہ علاقہ ان علاقوں سے زیادہ مقدس ہے جن میں اسرائیل کے بقیہ بارہ قبائل رہتے ہیں۔آخر میں اس مقدس علاقے کے بعد باقی تمام دنیا ہے جس میں دوسری قومیں آباد ہیں۔(22) جس طرح خدا کلی طور پر سب سے الگ تھلگ مسکن میں ہے اسی طرح بنی اسرائیل بقیہ دنیا سے الگ اور ممتاز درجہ میں ہیں۔ یہ تصور اسی طرح کی زندگی پر مبنی تھا جو جلاوطن اسرائیلی بابل میں اپنے لئے چاہتے تھے۔

ہم نہیں جانتے کہ آیا حزقی ایل اس رویا کو ارضی یروشلم کا بنیادی خاکہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بہر طور یہ واضح طور پر ایک یوٹوپیا تھی۔اس مرحلہ پر ابھی شہر،معبد اور زیادہ تر سرزمین کھنڈرات پر مشتمل تھی اور فی الوقت اس کی تعمیر نو کی کوئی امید نہیں تھی۔حزقی ایل کا ماڈل فی الحال تصوراتی بات تھی۔جب اس کے پراسرار گائیڈ نے رویا میں اسے مجوزہ معبد اور شہر کا نقشہ پوری تفصیل کے ساتھ دکھایا تو یہ نہیں بتایا تھا کہ نیا معبد اور شہر کس طرح تعمیر ہوگا چنانچہ اس رویا کا مقصد کچھ اور ہی محسوس ہوتا ہے۔

”اے آدم زاد۔تو بنی اسرائیل کو یہ گھر دکھا،تا کہ وہ اپنی بدکرداری
سے شرمندہ ہو جائیں اور اس نمونہ کو اپنائیں۔اور اگر وہ اپنے سب
کاموں سے پشیمان ہوں تو اس گھر کا نقشہ اور اس کی ترتیب اور
اس کے مخارج و مداخل اور اس کی تمام شکل اور اس کے تمام احکام
اور اس کی پوری وضع اور تمام قوانین ان کو دکھا اور ان کی آنکھوں
کے سامنے اس کو رکھ تا کہ وہ اس کا کل نقشہ اور اس کے تمام احکام کو
مان کر ان پر عمل کریں۔“ (حزقی ایل=12:43-10)

اگر وہ جلاوطنی میں اسی طرح رہنا چاہتے تھے جس طرح یروشلم میں یہواہ کی موجودگی میں رہتے تھے تو پھر انہیں اپنے آپ کو ایک مقدس علاقہ میں رکھنا تھا۔ایسی صورت میں دوسری قوموں کے ساتھ

برادرانہ اختلاط اور مردک اور دوسرے غیر خداؤں سے شناسائی خطرناک بات تھی۔ اسرائیل کے گھر کو لازمی طور پر خدا کا گھر بنایا جانا ضروری تھا کیونکہ خدا نے ان کے ساتھ رہنے کا انتخاب کر لیا تھا۔ اس مثالی مذہبی نقشہ پر غور کر کے اسرائیلی اس تقدیس کے معنی اور نوعیت کو سمجھ سکتے تھے جس کے مطابق ہر فرد اور ہر چیز کو اپنے اپنے مقام پر رہنا تھا۔ انہیں اپنی زندگیوں کے لئے نئے مرکز اور نئی فضا کی ضرورت تھی۔ جو جلاوطنوں کے لئے تسکین و اطمینان کا سبب بنتی کیونکہ وہ بابل میں مسلسل اپنے آپ کو کنارے پر محسوس کر رہے تھے۔ نئی فضا انہیں احساس دلاتی کہ وہ اپنے کافر پڑوسیوں کے برعکس حقیقت مطلق کے زیادہ قریب ہیں۔ در بدر لوگوں کے لئے مجوزہ شہر ایک ایسا مقام تھا جس میں وہ پورے افتخار کے ساتھ اطمینان بخش زندگی گزار سکتے تھے۔

اسرائیلیوں کے لئے مقدس طرز حیات کے خدوخال ہمیں بائبل کی تیسری اور چوتھی کتاب یعنی احبار اور گنتی میں نظر آتے ہیں۔ اسرائیل کی تاریخ کاہنوں کے نکتہ نظر سے مرتب کی گئی تھی اور اس میں بہت کچھ حزقی ایل سے مطابقت رکھتا ہے۔ جب اسرائیلیوں کی بیابان نوردی اور کوہ سینا پر خدا کی طرف سے عطا کئے گئے قوانین کا ذکر توریت میں کیا جاتا ہے تو تقدیس کے مختلف درجوں کی وہی مشابہت سامنے آتی ہے جو حزقی ایل مرتب کرتا ہے۔ بیابان میں اسرائیلی خیموں کے وسط میں مظلہ یعنی معبد کا شامیانہ ہوتا تھا۔ اور اس شامیانہ میں تابوت یہواہ یعنی عہد نامے کا صندوق اور یہواہ کا جلال ہوتا تھا۔ یہ مقدس ترین خیمہ یا مقام تھا جس میں صرف حضرت ہارون آ جا سکتے تھے۔ وہ کاھن اعظم تھے اور مقدسوں کے مقدس تک رسائی کی سعادت صرف انہیں حاصل تھی۔ اسرائیلیوں کے بقیہ خیمے بھی مقدس تھے اور انہیں ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھنا ضروری تھا کیونکہ ان کے درمیان مقدس ترین خیمہ موجود ہوتا تھا۔ اسرائیلیوں کی خیمہ بستی سے باہر خدا کے بغیر لق ودق صحرا تھا۔ حزقی ایل کی طرح کتاب احبار بھی یہواہ کو متحرک یعنی غیر جامد خدا کے طور پر پیش کرتی ہے۔ سفری خیمہ میں یہواہ اپنے لوگوں کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتا ہے۔ خروج، احبار اور گنتی کی کتابوں میں کہیں یروشلم کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کا سبب جزوی طور پر غالباً یہ ہے کہ اسرائیلیوں کے ارض موعودہ میں داخل ہونے اور حضرت داؤد کے یروشلم پر قبضہ سے بہت پہلے داستان ختم ہو جاتی ہے۔ توریت کی پانچویں کتاب کے برعکس تیسری اور چوتھی کتاب میں کسی ایسی ''جگہ'' کا تصور پیش نہیں کیا جاتا جہاں یہواہ اپنا نام قائم کر سکے۔ ان کتابوں کا مولف P ایک بار پھر تسکین مہیا کرتا ہے۔ جلاوطنوں کو یقین دلایا گیا کہ یہواہ اپنے لوگوں کے ساتھ رہے گا چاہے وہ کہیں بھی جائیں۔ اور خواہ جلاوطنی کی ابتری میں ہوں۔ کیا وہ صحرائے سینا کے بیابانوں میں ان کے ساتھ محو سفر نہیں رہا تھا؟

یروشلم کے کاہنوں نے غالباً ہمیشہ اپنے مخصوص اور مخفی قوانین پر عمل کیا تھا۔ P کی وقائع نگاری دراصل انہیں معقول بنانے اور عوام تک پہنچانے کی ایک کوشش تھی۔ کیونکہ ان کی قدیم دنیا تو نبوکدنضر نے تباہ کر دی تھی۔ اور جلاوطنوں کو اب ایک نئی دنیا تعمیر کرنا تھی۔ تخلیق P کی نظر میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس نے تصادم کی داستان کی تراش خراش کر دی اور ان باتوں کو خارج کر دیا جو معبدوں سے متعلق تھیں اور مقدس مقامات کا تعین کرتی تھیں۔ ان کے برعکس اس نے ان داستانوں کے جوہر کو لائق توجہ سمجھا مثلاً ابتری کو کائنات تخلیق کرنے کا حکم دیا جانا۔ P کتاب پیدائش کے پہلے باب میں تخلیق کائنات کے بارے میں بتاتا ہے کہ، یہواہ سمندری عفریت لویاتان سے کوئی خون ریز جنگ کئے بغیر دنیا کو وجود میں لایا۔ وہ کسی کشمکش کے بغیر ابتدائی عنصر ''توھو وھو'' کو دوسرے عناصر سے الگ کر لیتا ہے۔ اسی طرح وہ رات کو دن سے، روشنی کو تاریکی سے اور سمندر کو خشکی سے الگ کر لیتا ہے۔ حدود متعین کر دی جاتی ہیں اور کائنات کے ہر جزو کو اس کا مخصوص مقام دے دیا جاتا ہے۔ یہی علیحدگی اور تخلیقی احکامات توریت میں اس مقام پر دیکھے جا سکتے ہیں جب اسرائیلیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی غذاؤں میں گوشت کو دودھ سے الگ کر دیں اور سبت کے دن کو ہفتہ کے بقیہ دنوں سے الگ کر دیں۔ یہ علیحدگی ابتدا میں یہواہ کی تخلیق کے طرز عمل کی تقلید تھی۔ مذہبی رسوم کی یہ ایک نئی شکل تھی جس کے لئے کسی معبد اور تفصیلات بتانے والے کاہن کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے برعکس انہیں تمام مرد اور عورتیں اپنی روزمرہ زندگی میں سرانجام دے سکتے تھے۔ خدائی تخلیق کا اعادہ مذہبی رسوم کی صورت میں کرتے ہوئے وہ ایک نئی دنیا تعمیر کر رہے تھے اور جلاوطنی کی منتشر اور اکھڑی ہوئی زندگی میں ایک نظم اور ترتیب لا رہے تھے۔

اوامر عشرہ یعنی شریعت موسوی کے دس احکامات میں سے بیشتر، چیزوں کو ان کے درست مقام پر رکھنے سے متعلق ہیں۔ ماہر عمرانیات میری ڈگلس کہتی ہیں کہ جن چیزوں اور انسانوں کو ضابطہ قسیسی (عہد نامہ عتیق) میں ''ناپاک'' قرار دیا گیا وہ اپنی قسم یا زمرے سے باہر نکل آئیں اور ایک ایسے حلقہ میں داخل ہو گئیں جو ان کا اپنا نہیں تھا۔ ''گندگی'' سے مراد ایسی چیز ہے جو غلط جگہ پر ہو۔ چاہے یہ، یہواہ کے معبد میں کوئی غیر خدا ہو یا کپڑوں پر پھپھوندی، یعنی کوئی ایسی چیز جو عالم فطرت کو چھوڑ کر انسانوں کی اقلیم میں داخل ہو گئی ہو۔ موت عظیم ترین غلاظت ہے کیونکہ یہ دنیا کی ناپائیداری کا ڈرامائی انتباہ اور زندگی پہ اختیار رکھنے میں ناکامی کی یاد دہانی ہے۔ (24) منظّم کائنات میں زندہ رہنے کے لئے اسرائیلیوں کو ایک ایسی دنیا تعمیر کرنا تھی جس کا تصور حزقی ایل نے دیکھا تھا اور جس کا انحصار اس خدا پر تھا جو ان کے درمیان موجود ہو۔ جب معبد یروشلم میں برقرار تھا، یہ انہیں خدا سے رابطہ ورسائی کا ذریعہ مہیا کرتا تھا۔ اب اوامر عشرہ نے انہیں وہ گہرا تعلق

مہیا کرنا تھا جو خدا کے ساتھ باغ عدن میں آدم و حوا کو میسر تھا اور وہ ان کے ساتھ چہل قدمی کرتا تھا۔ان اوامر عشرہ کے ذریعے بابل میں جلاوطن اسرائیلیوں کو ایک نئی مقدس جگہ تخلیق کرنا تھی جو انتشار و ابتری کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کو قریب نہ آنے دے۔لیکن P صرف مذہبی پاکیزگی کو کافی نہیں سمجھتا تھا: اس کے مقدس ضابطہ میں سب سے ضروری وہ احکامات تھے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔مقدس سرزمین میں عبادت اور زراعت کے لئے احکامات کے ساتھ اس طرح کے سخت احکامات بھی موجود تھے۔

☆ تم چوری نہ کرنا اور نہ دغا دینا اور نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا

☆ تم فیصلہ میں ناراستی نہ کرنا۔نہ تو غریب کی رعایت کرنا اور نہ بڑے آدمی کا لحاظ کرنا بلکہ راستی کے ساتھ اپنے ہمسایہ کا انصاف کرنا۔

☆ اپنے لوگوں پر بہتان نہ لگانا اور اپنے ہمسایہ کی زندگی خطرے میں نہ ڈالنا۔

☆ اپنے دل میں اپنے بھائی سے بغض نہ رکھنا۔

☆ انتقام نہ لینا اور نہ اپنی قوم کی نسل سے کینہ رکھنا بلکہ اپنے ہمسایہ سے اپنے مانند محبت کرنا۔(25)

☆ اگر کوئی پردیسی تیرے ملک میں تیرے ساتھ بود و باش کرتا ہو تو تم اسے آزار نہ پہنچانا۔ اسے اپنے ہم وطن کی مانند سمجھنا بلکہ تو اس سے اپنی مانند محبت کرنا اس لئے کہ تم ملک مصر میں پردیسی تھے۔(26)

(احبار۔19::16--35,19)

سماجی انصاف ہمیشہ مقدس مقامات سے وابستگی اور معبد کی مذہبی رسوم کے ساتھ لازم و ملزوم رہا ہے۔کنعانی دیومالا میں، صیہون کے مذہب میں اور انبیاء کے الہام میں ہر جگہ سماجی انصاف پر زور دیا جاتا رہا ہے۔لیکن P کچھ اور آگے بڑھ جاتا ہے۔صرف انصاف نہیں محبت بھی ضروری ہے اور یہ جذبہ ایسے لوگوں کے لئے بھی ضروری ہے جن کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں اگرچہ غیر قوموں کو حزقی ایل کے مجوزہ مقدس شہر کے نقشہ میں شامل نہیں کیا جاتا لیکن انہیں اسرائیل کی محبت کے دائرہ میں سماجی انصاف کے سایہ میں ضرور رکھا جائے۔

چونکہ معبد کی یاد جلاوطنی میں ایک نصب العین بن گئی تھی چنانچہ کاہنوں کو ایک نیا وقار مل گیا۔

حزقی ایل اور P دونوں ہی اسرائیلی برادری میں مذہبی پیشوائیت کے کردار پر زور دیتے رہے۔ لیکن اسرائیل میں ابتدائی طور پر کاھن یا پروہت کی کوئی ذات اور جماعت نہیں تھی۔ لیکن معبد میں عبادت اور رسوم سرانجام دینے اور قوانین کی وضاحت کی ذمہ داری بتدریج لاوی قبیلہ کو سونپ دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ بیابان نوردی کے دوران تابوت یہواہ کو اٹھانے کی ذمہ داری اس قبیلہ کے سپرد تھی۔ حزقی ایل نے کاھن کے کردار کو اور بھی کم کر دیا کیونکہ لادیوں نے معبدوں میں بت پرستی کو جائز بنا دیا تھا۔ چنانچہ حزقی ایل نے انہیں معزول کر کے ایک ضمنی سا کردار تفویض کر دیا۔ اب انہیں نئے معبد میں معمولی فرائض سرانجام دینا تھے جن میں قربانی کے جانوروں کی تیاری، مذہبی گیت گانا اور دربانی شامل تھی۔ صرف وہ کاھن جو صدوق کی اولاد میں سے تھے ان کو معبد کی عمارتوں میں داخل ہونے اور مذہبی رسوم ادا کرنیکی اجازت دی گئی۔ (27) یہ امتیازی حکم یروشلم میں مستقبل کے نزاع کا سبب بن سکتا تھا کیونکہ اسرائیل کی مستند مذہبی رسوم کو صدوق کی اولاد کے سپرد کیا جا رہا تھا جو خود ایک یبوسی تھا۔ کاھن کے منصب کو استشنائی نوعیت دینا خدا کی بڑھتی ہوئی ماورائیت کی عکاسی کرتا ہے جس کا تقدس ناواقفوں اور غافلوں کے لئے ماضی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک تھا۔

P اور حزقی ایل دونوں ہی یہواہ کے معبد میں کاہنوں کے طرز عمل کا تعین تفصیل سے کرتے ہیں۔ مثلاً جب وہ ہیکل میں داخل ہوں تو اپنے کپڑے تبدیل کر لیں کیونکہ انہیں ایسے مقدس ترین مقام سے گزرنا ہے جو اعلیٰ ترین پاکیزگی کا تقاضا کرتا ہے۔ صرف کاہن اعظم کو خانہ اقدس (دیور) میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی اور وہ بھی سال میں صرف ایک دفعہ ایسا کرنے کا مجاز ہوگا۔ (28) نئے ضابطوں نے اسرائیلیوں کی نظر میں یہواہ کے تقدس کو مزید بڑھا دیا۔ یہواہ ایک ایسی حقیقت تھا جو تمام انسانوں سے برتر اور ان کے تصورات سے ماورا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس وقت مقدس معبد کے بارے میں اتنی تفصیلی ہدایات دی جا رہی تھیں اس وقت ان کو زیر عمل لانے کی نہ تو صورت موجود تھی اور نہ کوئی امید تھی۔ یروشلم کا معبد کھنڈر بن چکا تھا لیکن تخلیقی ذہن رکھنے والے جلاوطن پیروکار اس کو پوری طرح فعال ادارہ تصور کر رہے تھے۔ انہوں نے قانون ساز افراد کی ایک پیچیدہ مجلس بھی تشکیل دے دی تھی جو مذکورہ ہدایات کو باقاعدگی دے سکے۔ ہم اس کتاب کے آٹھویں باب میں دیکھیں گے کہ ربیوں (یہودی پروہتوں یا پادریوں) نے یہی کچھ کیا یہودی کتابیں، مقدس مقام اور یروشلم کی تقدیس کے حوالے سے جس صورت حال کا ذکر کرتی ہیں، تحریر کے وقت وہ موجود ہی نہیں تھی۔ جلاوطن اسرائیلیوں کے لئے یروشلم، اب ایک داخلی کیفیت تھی۔ یہ نجات کا ایک تصور تھا جو

ریاست یہوداہ میں اجڑے ہوئے شہر سے عملاً کوسوں دور بیٹھ کر تشکیل دیا جا سکتا تھا اور روحانی نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔ تقریباً اسی زمانے میں ہندوستان کے سدھارتھ گوتم نے جسے لوگ بدھا کے نام سے جانتے ہیں، یہی نروان حاصل کیا کہ حتمی حقیقت میں داخل ہونا ممکن ہے اور اس کا ذریعہ استغراق اور جذبہ ترحم ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ بلند تر جہت حاصل کرنے کے لئے کسی مندر، معبد یا مقدس مقام میں ذاتی طور پر پہنچا جائے۔ محوری دور کی روحانیت میں بعض اوقات یہ ممکن ہوتا تھا کہ مذہبی نشانات اور اشیاء کا سہارا لئے بغیر اپنی ذات کی گہرائیوں میں خدا سے رابطہ یا اس کی موجودگی کا تجربہ کر لیا جائے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ حزقی ایل اور P کی تحریروں کو ان کے ہم عصر کس طرح سمجھے ہوں گے۔ بلاشبہ انہیں امید تھی کہ ایک دن معبد پھر سے تعمیر ہوگا اور یروشلم ان کے اختیار میں دے دیا جائے گا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود رہتی ہے کہ جب بالآخر انہیں یروشلم واپس جانے کا موقعہ ملا تو زیادہ تر جلاوطنوں نے بابل ہی میں ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ انہیں اس بات نے پریشان نہ کیا کہ یروشلم میں ان کی جسمانی موجودگی ضروری ہے۔ دراصل اب انہوں نے صیہونی اقدار کو ایک نئے انداز میں نبھانا سیکھ لیا تھا۔ یہودیت کے نام سے جس مذہب کو ہم جانتے ہیں اس کا جنم یہودیہ یا ریاست یہوداہ میں نہیں ہوا تھا بلکہ جلاوطنی کے دوران بابل میں ہوا اور اسے نحمیاہ، عزرا اور یوایل جیسے فرستادہ مقدس سرزمین پر لائے۔

حزقی ایل اور P دونوں اس قابل تھے کہ اپنے مذہب کی ارضی علامتوں سے آگے دائمی حقیقت کو دیکھ سکیں، چنانچہ انہوں نے اس کی نشاندہی بھی کی۔ انہوں نے مستقبل کے لئے اپنی رویا میں یروشلم کا ذکر براہ راست نہیں کیا۔ P تو اپنا بیان ارض موعودہ کی دہلیز پر ختم کر دیتا ہے۔ ان کے خواب یقیناً یوٹوپیائی تھے اور غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ یہ خواب ان کے اپنے زمانے میں شرمندہ تعبیر ہو سکیں گے۔ یروشلم کے لئے ان کا رویہ آج کل عید فسح کے اجتماعات میں اس کے ذکر سے مشابہہ ہو سکتا ہے۔ جس میں "اگلے برس یروشلم" کے الفاظ ہمیشہ مستقبل کے مسیحی دور کے لئے استعمال ہوتے ہیں، زمینی شہر کے لئے نہیں۔ جب حزقی ایل نے صیہون کو مراجعت کا تصور پیش کیا تو اس نے ایک نئی روحانی قلب ماہیت کو پیش نظر رکھا" یہواہ اپنے لوگوں کو "ایک نیا دل" اور "ایک نئی روح" دے گا۔ اسی طرح یرمیاہ نبی نے پیشین گوئی کی تھی کہ "ایک دن ایسا آئے گا کہ احکام خداوندی پتھروں کی تختیوں پر نہیں لوگوں کے دلوں پر کندہ کئے جائیں گے۔"(29) اگر انہوں نے کسی نجات کو پیش نظر رکھا ہوتا تو یہودیت کو تشکیل دینے والے اس بات میں یقین نہ رکھتے کہ اس کی تکمیل محض سیاسی پروگرام سے ممکن ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ نجات کا مطلب صرف نیا معبد اور نیا شہر نہیں ہے۔ البتہ یہ آزادی کی علامتیں بن سکتے ہیں۔

پھر اچانک انہیں محسوس ہوا کہ سیاسی نجات تو سامنے ہے۔ یقیناً یہوداہ کے جلاوطنوں کے لئے بہت جلد ممکن ہوگا کہ وہ اپنے آباواجداد کی سرزمین کو لوٹ جائیں اور یروشلم کو پھر سے تعمیر کرلیں۔ بابل کے لوگ جو نبوکدنضر کے جانشین بیٹے شاہ نابونیدس کی حکمرانی سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے وہ فارس کے نوجوان بادشاہ سائرس دوم کی معرکہ آرائیوں کو انتہائی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ 550 ق م میں میدیا کو فتح کرنے کے بعد وہ اپنے لئے ایک وسیع تر سلطنت تشکیل دے رہا تھا۔ 541 ق م میں بابل پوری طرح سائرس کے مقبوضہ علاقوں میں محصور ہوگیا۔ مردک کے پروہت سائرس کے پراپگینڈہ سے متاثر ہورہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ نابونیدس نے ان کے مذہب کو نظر انداز کررکھا ہے۔ دوسری طرف سائرس وعدہ کررہا تھا کہ وہ سلطنت کے تمام معبدوں کو بحال کردے گا اور دیوتاؤں کا احترام کرے گا۔ وہ تباہ شدہ شہروں کو پھر سے تعمیر کرے گا اور اپنی سلطنت میں ایک عالمی امن بحال کرے گا۔ یہ پیغام گمنام یہودی نبی کو بھی متاثر کر گیا۔ اس نبی کو یسیعاہ ثانی کہتے تھے۔ یسیعاہ ثانی نے سائرس کو مسیحا قرار دے دیا اور کہا ''اسے یہواہ نے یروشلم اور معبد کی تعمیر نو کے خصوصی کام کے لئے مامور کیا ہے۔'' یسیعاہ ثانی جبلی طور پر صیہون کی پرانی دیو مالا اور طریق عبادت کی طرف راغب ہوا۔ اپنے آلہ کار، سائرس کے ذریعے، یہواہ ایک نئی تخلیق اور ایک نیا خروج ظہور میں لانے والا تھا۔ وہ اسرائیل کے موجودہ دشمنوں پر اسی طرح غالب آئے گا جس طرح وہ لویاتان اور رہاب پر غالب آیا تھا۔ پھر جلاوطن یہودی اس صحرا عبور کرکے صیہون میں داخل ہوں گے جو اپنی شیطانی قوت کھو چکا ہے۔(30)

یہ مراجعت تمام نبی نوع انسان کے لئے نتیجہ خیز ہوگی۔ واپس آنے والے جلاوطن ایک نئے عالمی نظام کے بانی ہوں گے۔ جب وہ ایک دفعہ یروشلم میں واپس آجائیں گے تو فوراً معبد تعمیر کرلیں گے اور یہواہ کا جلال اس کے مقدس پہاڑ پر واپس آجائے گا۔ اس کی تخت نشینی اس کے شہر میں '' تمام قوموں کی موجودگی میں'' ہوگی۔(31) یروشلم کے مذہب میں طویل عرصہ پہلے دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہواہ محض اسرائیل کا بادشاہ نہیں پوری دنیا کا بادشاہ ہے۔ اب سائرس کی وجہ سے یہ تصور عملی حقیقت میں تبدیل ہونے والا تھا۔ دیگر دیوتا خوف سے لرز رہے تھے۔ بابل کے اہم ترین دیوتا بیل اور بنو جھک تھے۔ ''ان کے بت جانوروں اور چوپایوں پر لدے ہیں۔ جو چیزیں تم اٹھائے پھرتے تھے، تھکے ہوئے چوپایوں پر لدی ہیں۔''(32) (یسیعاہ=46:1) دیگر دیوتا جو یہواہ سے برتر محسوس ہوتے تھے۔ اب دنیا کی تمام قومیں اسرائیل کی اطاعت پر مجبوری کردی جائیں گی انہیں زنجیروں میں جکڑ کر یروشلم کی طرف لایا جائے گا۔ پھر وہ مجبور ہوکر تسلیم کریں گی کہ:

'' تمہارے ساتھ خدا ہے جس کا کوئی حریف نہیں

اس کے سوا کوئی معبود نہیں'' (33) (یسیعاہ= 45:14)

صیہونی مذہب نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا تھا کہ یہواہ اکلوتا خدا ہے۔ اب یسیعاہ ثانی کی بصیرت نے توحید کو نئے انداز میں روشناس کرایا تھا۔ اس عالمی فتح کے حصول کے ساتھ یروشلم کی شان وشوکت ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ اس میں قیمتی پتھر جگمگائیں گے۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ اور تیری بنیاد نیلم سے ڈالوں گا۔

میں ترے کنگروں کو لولوں اور تیرے پھاٹکوں

کو شب چراغ اور تیری فصیلوں کو بیش قیمت

پتھروں سے بناؤں گا۔ (34)

(یسیعاہ 54:13-12)

539 ق م کے موسم خزاں میں یہ امیدیں برآنے کا امکان ایک قدم اور قریب آ گیا جب سائرس نے بابلیوں کو دریائے دجلہ کے کنارے آبیس کے مقام پر شکست دی۔ ایک ماہ بعد سائرس بابل میں داخل ہو گیا۔ مردک کے نمائندے کی حیثیت سے اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ یہ رسم ایساغ الہ کے معبد میں سرانجام پائی۔ پھر اس نے وہ سب کچھ کر دکھایا جس کا وہ وعدہ کرتا رہا تھا۔ اگست اور ستمبر 538 ق م کے دوران آشوریوں کیدیوی دیوتاؤں کے وہ سب بت ان شہروں کو واپس بھیج دیئے گئے جنہیں بابلی اپنی فتوحات کے دوران اٹھا لائے تھے۔ ان شہروں میں دیوتاؤں کے معبد پھر سے تعمیر کر دیئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی سائرس نے ایک فرمان جاری کیا کہ یروشلم کا معبد دوبارہ تعمیر کیا جائے گا اور اس کا مذہبی ساز وسامان اور فرنیچر واپس کر دیا جائے گا۔ سائرس کی فارسی سلطنت آشوریوں اور بابلیوں سے مختلف انداز میں چلائی گئی۔ سائرس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو ایک مخصوص دائرے میں خودمختاری دے دی۔ یہ انداز حکمرانی آسان اور موثر تھا اس طرح بغاوتوں اور سرکشی کا خطرہ کم ہو گیا۔ دیوتاؤں کے معبدوں کی تعمیر کسی بادشاہ کے بنیادی فرائض میں شامل سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح سائرس غالباً یہ سمجھتا تھا کہ محکوم قومیں اس کی احسان منداور شکر گذار ہو جائیں گی اور اسے دیوتاؤں کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی۔

اپنے وعدہ کے مطابق بابل میں تخت نشینی کے چند ماہ بعد سائرس نے سونے چاندی کے وہ تمام

برتن اور قیمتی اشیاء جو نبوکدنضر یروشلم سے لوٹ لایا تھا یہوداہ کے ایک امیر شیس بضر کے حوالے کر دیں۔ اسرائیل اور یہوداہ کے 42360 اسیروں کو ان کے غلاموں اور دوسو گویوں کے ساتھ یروشلم کی طرف روانہ کیا۔(35) اگر جلاوطنی سے واپس آنے والے اسیروں کے کانوں میں یسیعاہ ثانی کی پیشن گوئیاں گونج رہی تھیں تو یہوداہ میں واپس آ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو جلاوطنی میں پیدا ہوئے تھے۔ اور بابلیوں کی شان وشوکت اور اعلیٰ طرز حیات میں پروان چڑھے تھے۔ انہیں یہوداہ کا علاقہ اور وہاں کی زندگی بے کیف اور اجنبی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے تو واپس آنے والے جلاوطنوں کو اجڑے شہر بسانا تھے۔ چنانچہ نئے معبد کی تعمیر کا سوال ابھی بہت دور تھا۔ کچھ لوگ تو واقعی یروشلم میں مقیم ہو گئے جو ابھی تک کھنڈر تھا۔ بقیہ لوگوں کی اکثریت یہوداہ اور سامرینہ کے آرام دہ علاقوں میں آباد ہوگئی۔ یروشلم میں لوگ زیادہ تر جنوب کے مضافاتی علاقے میں آباد ہوئے جو 586 ق م تک بے آباد تھا۔ صرف چند ایک نے پرانے شہر کا انتخاب کیا۔

جلاوطنوں کے بارے میں فارس کے بادشاہ دارا کے دوسرے سال یعنی 520 ق م تک مزید کچھ سننے کو نہیں ملتا۔ یہوداہ میں اب شیس بضر واپس آنے والے جلاوطنوں کا نگران نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا، تاریخ کچھ نہیں بتاتی۔ تعمیراتی کام رک چکا تھا۔ لیکن یہ جوش وخروش دارا کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد پھر سے زندہ ہوگیا۔ شاہ یہواکین کا پوتا زربابل یروشلم میں آ گیا۔ اس کے ساتھ یروشلم کے معبد کے آخری کاھن کا پوتا یشوع بھی بابل سے واپس آیا۔ زربابل کو ریاست یہوداہ میں دارا کی طرف سے ناظم مقرر کیا گیا۔ وہ دارا کا نمائندہ اور داؤد خاندان کا رکن تھا۔ اس کی شخصیت نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی۔ تمام مہاجرین یروشلم میں جمع ہو گئے۔ اور قربان گاہ کو اس کی پرانی جگہ پر تعمیر کیا گیا۔ جب یہ مکمل ہوگئی تو وہاں قربانی پیش کی جانے لگی اور روایتی تہوار منعقد کئے جانے لگے۔ لیکن عمارت بن جانے کے باوجود یروشلم میں زندگی ابھی تک ایک جدوجہد سے کم نہ تھی۔ فصلیں اچھی نہیں تھیں۔ معیشت ناگفتہ بہ تھی۔ چنانچہ بھوکے پیٹ معبد کی تعمیر کے لئے جوش وجذبہ سرد رہا۔ اگست 520 ق م میں نبی حجی نے لوگوں کو بتایا کہ ان کی ترجیحات بالکل غلط ہیں۔ فصلیں اس وقت تک بارآور نہیں ہوں گی جب تک مکمل معبد تعمیر نہیں ہو جاتا۔ یہواہ کا گھر ارض موعودہ کی زرخیزی کا ذریعہ ہے۔ اپنے لئے گھروں کی تعمیر اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک یہواہ کا گھر نہیں بنا دیا جاتا۔(36) چنانچہ مہاجرین ایک بار پھر یروشلم کے معبد کی تعمیر کے لئے سرگرم ہو گئے۔

520 ق م کے موسم خزاں میں دوسرے معبد کی بنیادیں رکھ دی گئیں سکوتھ کے تہوار پر ضیافت

کے دوران خصوصی حلف اٹھایا گیا۔ کاہنوں نے مقدس علاقے میں جلوس نکالا۔ لاوی ان کے پیچھے تھے اور مقدس گیت گا رہے تھے اور جھانجے بجا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ بوڑھے تھے اور انہیں معبد سلیمانی کی شان وشوکت یاد تھی۔ جب انہوں نے معبد کے مقام کو چٹیل میدان کی صورت میں دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔(37)

MAP (نقشہ)

تعمیراتی کام شروع ہوا لیکن یہ کام آغاز ہی سے مایوس کن تھا۔ بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھے۔ حجی نے ان کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ نیا معبد پرانے معبد سے اعلیٰ تر ہوگا۔ بہت جلد یہواہ یہاں سے ساری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔ یسعیاہ ثانی نے جس نے طرح بتایا تھا۔ سب کچھ اسی طرح ہوگا۔ زربابل مسیح بنے گا۔ وہ یہواہ کی طرف سے گوئم یعنی ساری دنیا پر حکومت کرے گا۔(38) حجی کا ساتھی ذکریا بھی اسی بات کی تائید کرتا تھا۔ وہ بھی اس دن کی پیشین گوئی کر رہا تھا جب یہواہ صیہون پر رہنے کے لئے آئے گا۔ اور اپنے دو مسیحاؤں کے ذریعے اپنی بادشاہت قائم کرے گا۔ ذکریا کا کہنا تھا کہ یہواہ کے مسیحا زربابل بادشاہ اور یشوع کاھن ہیں۔

تعمیر نو کے ضمن میں ضروری تھا کہ یروشلم کی دیواریں دوبارہ نہ تعمیر کی جائیں تاکہ شہر ان لوگوں کو اپنی آغوش میں لے سکے جو بہت جلد جوق در جوق وہاں آنے والے تھے۔(39) لیکن سب لوگ کھلے شہر کے حق میں نہیں تھے۔ ادھر سامرینہ (اسرائیل کی پرانی ریاست) کے لوگوں نے جب سنا کہ یہواہ کے نئے معبد کی تعمیر کا کام پوری سنجیدگی سے جاری ہے تو وہ زربابل کے پاس آئے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ بائبل کے مولفیں ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ان بیرونی آبادکاروں کی اولاد تھے جنہیں آشوریوں نے 722 ق م میں وہاں آباد کیا تھا۔ ان میں سے کچھ واقعی بنی اسرائیل سے بھی تعلق رکھتے ہوں گے اور بارہ قبیلوں میں سے ہوں گے اور بقیہ وہ یہودی ہوں گے جن کے باپ دادا 586 ق م کے بعد بھی وہیں آباد تھے۔ فطری بات ہے کہ یہواہ کے یہ عقیدت مند صیہون کی تعمیر نو میں دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن زربابل نے سختی کے ساتھ ان کی پیش کش مسترد کر دی(40) اور کہا کہ "مہاجرین خود ہی" "حقیقی اسرائیل" تعمیر کریں گے۔ شاہ سائرس (بائبل اسے خورس کے نام سے یاد کرتی ہے) کی طرف سے تعمیر نو کی ذمہ داری صرف انہیں سونپی گئی ہے۔

چنانچہ بعد میں یہواہ کے مذکورہ عقیدت مند، بھائی نہیں بلکہ دشمن قرار دیئے گئے۔ان سب کو’ ملک کے لوگ‘‘ کہا گیا۔ بابل میں حزقی ایل اور P کی نظر میں بنی اسرائیل کے بارہ قبائل ایک خاندان اور مقدس لوگ تھے۔صرف غیر یہودی اور غیر خدا پرستوں کو اجنبی قومیں قرار دیا گیا تھا اور نئے معبد اور نئے شہر کے نقشہ میں انہیں سب سے الگ اور باہر رکھا گیا تھا۔لیکن واپس آنے والے جلاوطنوں نے تنگ نظری کا مظاہرہ کیا اور ملک کے لوگوں کو اجنبی قرار دے کر انہیں اپنا دشمن بنالیا۔ چنانچہ ملک کو امن اور ہم آہنگی ملنے کی بجائے یروشلم ارض مقدس میں ایک متنازعہ معاملہ بن گیا۔ بائبل کے مصنفین ہمیں بتاتے ہیں کہ’’ملک کے لوگوں‘‘ نے یہوداہ کے لوگوں کی مخالفت شروع کردی اور تعمیراتی کام میں رکاوٹیں ڈالنے لگے۔(41) انہوں نے فارس کے حکام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی اور 486 ق م میں انہوں نے فارس کے بادشاہ اخسویرس (Xerxes) کو شکایت کی کہ یہودی، یروشلم شہر کی دیواریں اجازت کے بغیر تعمیر کررہے ہیں۔قدیم دنیا میں شہر کی دیواریں تعمیر کرنے کا مطلب شہنشاہ وقت کے خلاف بغاوت کا اقدام ہوتا تھا۔ملک کے لوگوں نے سامرینہ کے حاکم کے ذریعے بادشاہ اخسویرس کو لکھا:

اگر یہ شہر بن جائے اور فصیل تیار ہو جائے تو
وہ خراج چنگی یا محصول نہیں دیں گے اور آخر
بادشاہوں کو نقصان ہوگا۔۔۔۔

(عزرا 4-14)

بادشاہ نے فوراً کام رکوادیا۔اور پھر یہ کام اس وقت تک رکا رہا جب تک اخمتا کے محل (بابل کے تاریخی کتب خانے) سے شاہ خورس (سائرس) کا وہ حکم نامہ نہ مل گیا جس کے تحت یروشلم شہر اور معبد کی تعمیر کی اجازت دی گئی تھی۔

اگرچہ دوسرے یعنی نئے معبد کی تعمیر بتدریج جاری رہی۔لیکن ملک کے لوگوں سے مخاصمت کے بعد زربابل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ غالباً حجی اور ذکریا کی طرف اس اسے ’’مسیحا‘‘ قرار دیئے جانے کی باتوں نے اہل فارس کو چونکا دیا ہوگا۔ممکن ہے جب شاہ فارس، دارا 519 میں اس ملک سے گزرا تو اس نے زربابل کو معزول کردیا۔اس کے بعد خاندان داؤد کے کسی اور رکن کو یہوداہ کا ناظم نہ بنایا گیا۔مسیحا کا خواب پورا نہ ہونے کے باوجود مہاجرین 23 مارچ 515 ق م کے معبد مکمل کرنے میں کامیاب رہے۔ اسے معبد سلیمانی کے مقام پر ہی بنایا گیا تھا تاکہ مقدس مقام کی روایت برقرار رہے۔ یہ پرانے نقشے کے

مطابق تین حصوں یعنی علام (ڈیوڑھی) ہیکل اور دیور (خانہ اقدس) پر مشتمل تھا۔ البتہ اب اسے ایک پتھریلی دیوار کے ذریعے شہر سے الگ کر دیا گیا۔ پھاٹک سے بیرونی صحن تک دو رویہ راہداری تھی۔ صحن کے اردگرد دفاتر، گودام اور کاہنوں کے گھر تھے۔ ایک اور دیوار صحن کو اندرونی حصے سے الگ کرتی تھی جہاں قربان گاہ بنائی گئی تھی۔ اس دفعہ صیہون پر کوئی محل نہ بنایا گیا کیونکہ یہوداہ کا کوئی بادشاہ نہ تھا ایک اور اہم فرق یہ تھا کہ اب دیور (خانہ اقدس) خالی تھا۔ تابوت یہواہ غائب ہو چکا تھا اور اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ لیکن یہ خلا بے معنی نہیں تھا اور یہواہ کی ماورائیت کی علامت تھا۔ اب لوگ جان چکے تھے کہ یہواہ کو کسی زمینی علامت اور انسانی تصور میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کچھ لوگ اس عدم موجودگی کو منفی انداز میں دیکھتے تھے۔ یسیعاہ ثانی کی پرشکوہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ اگر یہواہ کا جلال یہاں ظہور کرتا ہے اور خانہ اقدس میں رہائش اختیار کر لیتا ہے تو کسی کو خبر ہی نہ ہو گی۔ اب غیر خدا پرست لوگوں کے بارے میں کوئی ڈرامائی الہام نہیں تھا چنانچہ غیر قوموں کو پابہ زنجیر لائے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اب خدا اور دنیا کے درمیان ایک وسیع فاصلے کا نیا تصور رائج ہو گیا اور نئے معبد کی تعمیر کے ابتدائی برسوں میں کسی ماورائی قوت کا یہاں آنا ایک مضحکہ خیز بات محسوس ہوتی تھی۔

یہواہ کہتا ہے
آسمان میرا تخت ہے
اور زمین میرے پاؤں کی چوکی
تم میرے لئے کیسا گھر بناؤ گے
اور کون سی جگہ میری آرام گاہ ہو گی؟ (42)

(یسیعاہ 66:2-1)

سبھی لوگ صرف امید ہی کر سکتے تھے کہ کسی روز یہواہ آسمانوں سے اتر آئے گا اور ان سے ملاقات کرے گا۔ ماضی میں پرشکوہ معبدوں کے طرف کھنچے چلے آنے کے برعکس اب یہواہ سادگی اور حزن و ملال کی فضا کا رسیا تھا۔ (43) پرانے معبد میں عبادت پرشور، مسرت انگیز اور ہنگامہ پرور ہوا کرتی تھی۔ لیکن نئے معبد میں خاموشی اور سنجیدگی غالب آ گئی۔ جلاوطنی کے دوران مہاجروں میں احساس جرم پیدا ہو چکا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یروشلم کی تباہی کے ذمہ دار وہ خود ہیں چنانچہ نئے معبد میں عبادت کا انداز دل شکستگی اور ندامت کا مظہر تھا۔ اس کا اظہار خاص طور پر یوم کفارہ کو دیکھنے میں آتا جب کاہن اعظم علامتی انداز میں

لوگوں کے گناہ ایک بکری پر ڈال دیتا پھر اسے صحرا میں دھکیل دیا جاتا۔ لیکن اس عمل نے ایک بار پھر اسرائیلیوں کو روح القدس سے رابطہ کے قابل بنا دیا۔ یوم کبر یا یوم کفارہ سال میں ایک دن تھا جب کاھن اعظم لوگوں کا نمائندہ بن کر دیور میں داخل ہوتا۔ کفارے کا عنصر معبد کے صحن میں روزانہ پیش کی جانے والی قربانیوں میں بھی شامل تھا۔ لوگ اپنے گناہوں کے کفارے کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق بیل، بھیڑیں، بکریاں یا کبوتر لاتے اور معبد میں قربانی کے لئے پیش کرتے۔ وہ اپنا ہاتھ جانور کے سر پر رکھتے جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے یہواہ کی نذر کر رہے ہیں۔ جب جانور کو ہلاک کر دیا جاتا تو اس کے جسم کے کچھ حصے قربانی پیش کرنے والے فرد کو دے دیئے جاتے اور پھر قربانی پیش کرنے والا فرد (مرد یا عورت) انہیں اپنے گھر والوں یا دوستوں کے ساتھ مل کر استعمال میں لا سکتا تھا۔ اجتماعی ضیافت زمین پر آسمانی ہم آہنگی کا عکس ہوتی تھی۔

لیکن جس طرح یسیعاہ ثانی نے پیشین گوئی کی تھی۔۔۔ یہواہ کبھی صیہون پر نہ آیا۔ لوگ مسلسل اس دن کا خواب دیکھتے رہے جب وہ یروشلم میں ''ایک نئی جنت اور ایک نئی دنیا'' تخلیق کرے گا۔ پرانی امیدوں نے دم توڑا اور یروشلم آخری نجات کی علامت میں واپسی پر ہوگا۔ یروشلم تمام شہروں سے مختلف ہوگا جہاں ہر فرد ایک طویل اور آسودہ زندگی بسر کر سکے گا۔ ہر فرد اپنی متعین جگہ پر ہوگا۔ تب شہر میں کوئی گریہ نہیں ہوگا اور ماضی کے تمام مصائب بھلا دیئے جائیں گے۔ غیر قومیں اس شہر کے امن پر حیرت کریں گی کیونکہ یہاں ایسی زندگی ہوگی جو جنت میں ہو سکتی ہے۔(44) لیکن دوسرے لوگ کچھ زیادہ ہی پراگندہ خیال تھے۔ شہر میں سماجی مسائل تھے۔ بہت سے لوگ کافروں کی رسوم ادا کر رہے تھے۔ انبیاء اس غلط روش کی نشاندہی کر رہے تھے۔ (45) مہاجروں کے طرز عمل سے الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ سوال یہ تھا کہ کیا ''خدا کا شہر'' سب کے لئے کھلا نہیں ہونا چاہیے۔ زکریا نے تو یہی کہا تھا۔ ''یروشلم کے دروازے اجنبیوں، اچھوتوں اور ہیجڑوں کے لئے بھی کھلنے چاہئیں جنہیں کاھن ''ناپاک لوگ'' قرار دیتے تھے۔ یہواہ نے اعلان کیا تھا کہ۔۔۔ میرا گھر سب لوگوں کے لئے عبادت کا گھر ہوگا۔۔'' ایک دن وہ باہر کے لوگوں کو شہر میں لائے گا اور انہیں کوہ صیہون پر قربانی پیش کرنے کی اجازت دے گا۔''(46)

پانچویں صدی قبل مسیح میں یروشلم یہودیوں یا غیروں کے لئے مکمل طور پر مذہبی مرکز بن سکا۔ شہر میں ابھی تک کھنڈروں اور بے آباد مکانوں کی اکثریت تھی۔ 458 قبل مسیح میں فارس کے شاہ اخسویرس کی معزولی کے موقع پر سلطنت فارس میں پیدا ہونے والے خلفشار نے یروشلم کو بھی متاثر کیا۔ 445 ق م میں شہر کی حالت زار کی خبریں فارس کے دارالحکومت سوسا (سوسن) میں پہنچیں تو وہاں رہنے والی یہودی برادری کو سخت صدمہ ہوا۔ یہودی برادری کا ایک دانشمند نحمیاہ فارس کے بادشاہ ارتخششتا اول کا ساقی تھا۔ یروشلم کی بری حالت کی خبر سن کر وہ بہت دل گرفتہ ہوا اور کئی دن تک اپنی قوم

اور لوگوں کے گناہوں پر کڑھتا اور روتا رہا پھر اس نے شاہ فارس سے درخواست کی کہ اسے یہوداہ جانے اور اپنے آباداجداد کا شہر تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے اجازت دے دی اور نحمیاہ کو یہوداہ کا ناظم مقرر کر دیا۔ اس کی مدد و اعانت کے لئے علاقے کے دوسرے حکام اور گورنروں کو خطوط ارسال کر دیئے۔(47) ارتخششتاہ کا خیال تھا کہ نحمیاہ یہوداہ میں استحکام لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ مصر کے اس قدر قریب فارس کا لائق اعتماد ''برج'' سلطنت کے تحفظ میں اضافہ کرے گا۔

عزرا اور نحمیاہ کی کتابیں متحدہ غیر متعلقہ باتوں پر مشتمل میں جنہیں مولف نے ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عزرا اور نحمیاہ ہم عصر تھے۔ اس نے عزرا کے آمد یروشلم میں نحمیاہ سے پہلے دکھا دی ہے۔ لیکن ایسے ٹھوس شواہد موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ عزرا بہت بعد میں اور 398 ق م میں بادشاہ ارتخششتاہ دوم کے زمانے میں یروشلم میں آیا۔(48) جب کہ نحمیاہ اس سے نصف صدی پہلے 445 ق م میں فارس مے دارالحکومت سوسن سے روانہ ہوا۔ مولف نے نحمیاہ کے منصف کو مذہبی نوعیت دی ہے کیونکہ اس زمانے میں مشرق قریب میں شہر کے قلعہ بندی جیسا تعمیراتی کام مقدس فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ جب نحمیاہ یروشلم پہنچا تو پہلے تین دن تک مضافاتی بستی میں ٹھہرا اور پھر ایک رات خاموشی سے شہر کی دیواروں کی خستہ حالی کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً وہ ٹوٹی ہوئی دیواروں اور جلے ہوئے پھاٹکوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اس دوران گھوڑے پر سوار تھا اور ایک مقام پر اسے آگے بڑھنے کے لئے راستہ نہ ملا۔(49) اگلے روز وہ قوم کے بزرگوں سے ملا اور انہیں شہر کی شرمناک حالت کو ختم کرنے اور صورت حال بہتر بنانے کا مشورہ دیا۔ پورے شہر نے اس کام میں شرکت کے لئے خود کو پیش کیر دیا۔ کاھن اور عام آدمی سب شانہ بشانہ کام کرنے لگے اور محض 52 دنوں میں شہر کی نئ دیواریں ایستادہ ہوگئیں۔ یہ ایک خطرناک کام تھا۔ اس دفعہ ''ملک کے لوگوں'' (ایم۔ ھا۔ آرز) سے تعلقات میں مزید خرابی آئی۔ نحمیاہ کو مسلسل مقامی حکام کی فتنہ پروازیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان میں سامرنیہ کا گورنر سعبلط، اس کے افسروں میں سے ایک طوبیاہ اور ادوم کا گورنر جشم عربی شامل تھے۔ صورت حال اتنی کشیدہ تھی کہ معماروں کو ہر وقت دشمنوں کے حملہ کا خطرہ رہتا تھا۔ لوگوں نے اس طرح کام کیا کہ مسلسل ایک ہاتھ میں تلوار یا ہتھیار سنبھالے رکھا۔ معمار اپنے پاس ہی تلوار رکھتے۔(50) مغربی پہاڑی پر مشنہ محلّہ (مضافاتی بستی) کو مستحکم اور قلعہ بند کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔ نحمیاہ نے (حضرت) داؤد کے وقت کے شہر کو ہی دوبارہ تعمیر کیا۔ جو اوفیل کی پہاڑی اور وادی پر آباد تھا۔ بائبل بتاتی ہے کہ شہر کی مغربی دیوار کے ساتھ بازار بنایا گیا اور شہر کو کس انداز میں مرتب کیا گیا۔ کاھن اور معبد کے خادم معبد کے پاس ہی پرانے اوفیل قلعے کے مقام پر بسائے گئے۔ دستکار اور ہنرمند جنوب مشرقی حصہ میں مقیم تھے جب کہ سپاہ کو شمالی علاقہ میں رکھا گیا۔ کیونکہ یہ سمت سب سے زیادہ خطرے کی زد میں رہتی تھی۔ نحمیاہ نے ایک شہر پناہ یا گڑھی بھی تعمیر کروائی۔ غالباً یہ معبد کے شمال مشرق میں بنائی گئی۔

25 عیلل (ابتدائی ستمبر) 445 ق م کو نئی دیواریں مکمل ہوئیں۔ چنانچہ شہر پناہ کی تقدیس کی رسم ادا کی گئی۔ قرب وجوار کے دیہات سے تعلق رکھنے والے لادیوں اور بھجن منڈلیوں'' کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا گیا جو شہر کی دیواروں کے باہر مختلف سمتوں سے مذہبی گیت گاتے ہوئے جلوس کی صورت میں معبد کے صحن میں پہنچے۔ مذہبی گیتوں اور خوشی کے نعروں کی آوازیں میلوں دور سنی گئیں۔

نحمیانہ یروشلم کے لئے ایک نئی امید لے کر آیا تھا۔لیکن ابھی شہر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا تھا۔ وہاں نئے خاندان نہیں آرہے تھے دراصل لوگ ابھی شہر میں ہونے سے ہچکچا رہے تھے۔ کیونکہ شہر پر ''ملک کے لوگوں'' (ایم۔ ھا۔ آرز) کے حملے کا خطرہ برقرار تھا۔

MAP (نقشہ)

جو لوگ شہر میں مقیم تھے انہیں نئے پھاٹکوں (دروازوں) پہ مسلسل پہرے کے لئے انتظام کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد نحمیاہ نئے لوگوں کو شہر میں لانے میں بالاخر کامیاب ہو گیا۔اس نے قرعہ کے ذریعے ہر دسویں آدمی کو شہر میں مقیم ہونے کی اجازت دی۔اور دس ہزار نئے افراد کو شہر میں آباد کیا۔(51) یہ سب لوگ بنی اسرائیل کے مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یروشلم نحمیاہ کے بارہ برسوں کے دوران صوبے کے دارالحکومت مصفاہ سے بڑا ہو گیا۔ چنانچہ یروشلم میں صوبے کے حاکم کی رہائش گاہ تعمیر کی گئی۔ بتدریج یہ شہر ریاست یہوداہ کے لوگوں کا مرکز بن گیا۔لیکن خود یروشلم کے اندر اقتدار کی کشمکش چل رہی تھی۔ کچھ کاہنوں کے ذاتی مراسم ''ملک کے لوگوں'' کے ساتھ تھے جن میں سنبلط شامل تھا۔ وہ نحمیاہ کے خطرناک ترین مخالفوں میں سرفہرست تھا۔نحمیاہ کو شہر کے دولت مند افراد کے حرص وطمع کو بھی دبانا پڑا جو غریبوں کے کھیتوں اور باغوں کے ساتھ ساتھ ان کے بیٹے اور بیٹیوں کو بھی خرید لیتے تھے۔ جب لئے گئے قرضے اور ان کا سود نہ ادا کر پاتے تو دولت مند لوگ ان کی املاک اور اولاد اپنے تصرف میں لے لیتے۔نحمیاہ نے عوامی حمایت کے ساتھ کاہنوں اور سرداروں کو ایک حلف کے ذریعے مجبور کیا کہ وہ سود لینا چھوڑ دیں۔ (52) یہ اقدام یروشلم کو غریبوں کی پناہ گاہ بنانے کی کوشش تھی۔لیکن اس کوشش نے اشرافیہ کو نالاں کر دیا۔طبقہ اشرافیہ نے پڑوسی شہروں اور دیہات کے سرداروں کو اپنا حلیف بنانا شروع کر دیا۔ پورے علاقے میں زبردست کشیدگی ابھر آئی۔سنبلط ،طوبیاہ اور جشم کا موقف تھا کہ شہر کی قلعہ بندی کے پیچھے سیاسی عزائم اور ذاتی اقتدار کی منصوبہ بندی کارفرما تھی۔

اپنے منصب کے دوسرے دور میں جو 432 ق م میں شروع ہوا نحمیاہ نے ایسے قوانین نافذ کئے جن کے تحت

یہودیوں کو مقامی لوگوں کی بیٹیوں سے شادی کرنے سے روک دیا گیا۔ اس نے الیاسب کاھن کے بیٹے یویدع کو یہودی برادری سے خارج کر دیا کیونکہ وہ سنبلط کا داماد تھا۔ الیاسب کاھن نے سامرینہ میں پناہ لے لی جہاں اس نے دوسرے ناراض لوگوں سے اتحاد کر لیا۔ مخلوط شادیوں کا سوال یروشلم میں سنگین مسئلہ بن گیا۔ نحمیاہ کی اس قانون سازی کے پیچھے نسلی تطہیر کا کوئی جدید تصور نہیں تھا بلکہ اس نئے مقدس جغرافیہ کی تشکیل تھی جس کا تصور جلاوطنی کے دوران حزقی ایل نے پیش کیا تھا۔

'' خدا کے مقدس لوگوں کو دوسرے لوگوں سے الگ رہنا چاہئے۔''(53)

جلاوطنی کے دوران بابل میں یہوداہ کے لوگوں کے پیش نظر اسرائیل میں یہواہ کی موجودگی میں اپنی الگ شناخت کا تحفظ تھا۔ یہی تناؤ ان کی سماجی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ توریت انہیں اپنے خاندان سے باہر شادی کی اجازت تو دیتی تھی لیکن بہتر یہی سمجھا گیا تھا کہ ایسے لوگوں میں شادیاں کی جائیں جو قریبی عزیز ہوں۔ خاندان کے اندر شادی کو پسندیدہ جب کہ اجنبیوں سے شادیوں کے بندھن کو ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا تھا۔ خاندان سے باہر شادی کا مطلب اپنے آپ کو اس مقدس حلقہ سے خارج کر دینے کے مترادف تھا جو خدا سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ حلقہ سایہ خداوندی سے محروم وہ بیابان تھا جس میں یوم کفارہ کو گناہوں سے لدے جانور کو دھکیل دیا جاتا تھا۔ نحمیاہ کا یہ قانون بنی اسرائیل کو پاک اور دوسری قوموں سے مختلف بنانے کا اقدام تھا۔ اس طرح اجنبی لوگوں کو دور رکھ کر یہودی شناخت کی تکمیل کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہوداہ میں مہاجرین کو کہا جا رہا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو مسترد کر دیں جو کبھی اسرائیلی خاندانوں کے رکن تھے۔ اب انہیں اجنبیوں اور دشمنوں کا کردار دیا جا رہا تھا۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران بابل میں یہودی جلاوطن ایک اہم مذہبی اصلاح میں مصروف تھے جو یروشلم کے مذہب کی صورت میں سامنے آئی۔ ان دنوں بھی شناخت کا مسئلہ درپیش تھا۔ جلاوطنوں نے اپنے بچوں کو بابلیوں کے نام دینے کی بجائے اپنے روایتی اور خاندانی ناموں کی طرف رجوع کر لیا۔ توریت نے جلاوطنی کے دوران نیا کردار ادا کرنا شروع کر دیا اور لوگوں کی نظر میں معبد کی جگہ اپنا مقام بنا لیا۔ توریت کے احکام اور قوانین پر عمل درآمد کر کے بابل کے یہودی اپنے آپ کو ایک مقدس برادری بنا سکتے تھے جو زمین پر مصدقہ خدا کے نظام کی پناہ میں تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تھا کہ عام یہودیوں کی مذہبی پیچیدگیاں سمجھنے کے لئے علما کی ضرورت تھی۔ ان علما میں سے ایک عزرا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو یہواہ کے قوانین سمجھنے کے لئے وقف کر دیا تھا تاکہ بنی اسرائیل کو اس کے مذہبی قوانین اور آداب سکھا سکے۔(54) ممکن ہے اسے فارس کے دربار میں یہودیوں کے امور کا وزیر بنایا گیا ہو۔ اسے

398 ق م میں شاہ ارتخششتاہ دوم نے یہوداہ میں خصوصی مشن کے تحت بھیجا تھا۔ اس کو اپنے ساتھ یہودیوں کی طرف سے یروشلم کے معبد کے لئے تحائف بھی لے جانا تھے۔ یروشلم پہنچنے پر اسے ایک انکوائری کرنا تھی جس کا مقصد یہوداہ اور یروشلم میں ان کے خدا کے قوانین کی بنیاد پر صورت حال کا تجزیہ اور پھر یہاں کے یہودیوں کو خدا کے قوانین کے مطابق ہدایات دینا تھیں۔ (55) سلطنت فارس کی دیگر محکوم قوموں کے قوانین بھی اس وقت زیر غور تھے۔ ارتخششتاہ یہودی معبد کے طرز عبادت کا حامی تھا۔ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ یہ مذہب اس کی سلطنت کے مفادات اور سلامتی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ بابل میں ایک قانونی ماہر کی حیثیت سے عزرا نے توریت اور فارس کے قانونی نظام کے درمیان کوئی ارتباط پیدا کر لیا ہوگا اور ارتخششتاہ کی خواہش ہوگی کہ اسے یہوداہ میں نافذ کر کے اس کے عملی صورت دیکھ لی جائے۔ عزرا نے یروشلم میں توریت کے قوانین کا نفاذ کرنا تھا۔ اور اسے ملک کا قانون بنانا تھا۔ (56)

بائبل کے مصنفین کی نظر میں عزرا کا مشن اس کی قوم کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ یہوداہ کی طرف عزرا کے سفر کو ایک نیا خروج اور قانون دہندہ کے طور پر اسے نیا موسیٰ بنا دیا گیا۔ وہ ایک فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں آیا لیکن ان باتوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا جو کاہنوں اور لادیوں کی مقامی لوگوں کے ساتھ چپقلش کی صورت میں اور یہودیوں کی طرف سے اجنبی قوموں میں شادیوں کی صورت میں اس کے سامنے آئیں۔ یروشلم کے لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ کا نمائندہ اپنے بال نوچ کر کسی ماتم گسار کی طرح سارا دن گلی میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے مہاجروں کے تمام ارکان کو ایک بڑے اجلاس میں طلب کیا۔ ''جو یہودی اس اجلاس میں شرکت نہیں کرے گا اسے برادری سے خارج کر دیا جائے گا اور اس کی جائیداد ضبط کر لی جائے گی۔'' نئے سال کے دن عزرا توریت اٹھائے ''پانی کے پھاٹک'' پر پہنچا اور لکڑی کے ایک منبر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اردگرد شہر کے ممتاز لوگ تھے۔ اس نے اجتماع کے سامنے قوانین پڑھے اور ان کی وضاحت کی۔ (57) ہم ٹھیک طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے لوگوں کے سامنے کیا پڑھا۔ محض چند ایک قوانین یا پوری کتاب توریت، لیکن اس نے جو کچھ بھی لوگوں کو سنایا، ان کے لئے حیران کن تھا کیونکہ انہوں نے یہ سب کچھ پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ اس قدر ملول اور افسردہ ہوئے کہ عزرا کو انہیں یاد دلانا پڑا کہ آج تہوار کا دن ہے۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ توریت حکم دیتی ہے کہ سکوتھ کے مہینے میں جھونپڑیوں میں رہا کریں اور اپنے اجداد کی چالیس برس تک بیابان نوردی کو یاد کریں۔

> ''۔۔۔۔ اور اپنے سب شہروں میں اور یروشلم میں یہ اعلان اور منادی کرائیں کہ پہاڑ پر جا کر زیتون کی ڈالیاں اور جنگلی زیتون کی ڈالیاں اور مہندی کی ڈالیاں اور کھجور کی ڈالیاں اور کھجور کی شاخیں اور گھنے درختوں کی ڈالیاں جھونپڑیاں بنانے کو لاؤ جیسا لکھا ہے۔

سولوگ جا جا کر ان کو لائے اور ہر ایک نے اپنے گھر کی چھت پر

اور اپنے احاطہ میں اور پانی پھاٹک کے میدان میں اپنے لئے

جھونپڑیاں بنائیں۔'' (نحمیاہ 8:16-17)

اس نئے تہوار نے یبوسیوں کے قدیم سکوتھ کے میلے کی جگہ لے لی۔ اب اس تہوار کو جس انداز میں منایا گیا وہ خروج کی یاد دلاتا تھا۔ اگلے سات روز تک شہر میں میلے کا سماں رہا۔ ہر شام کو لوگ اکھٹے ہو کر عزرا کی تفسیر سنتے۔

اگلا اجتماع زیادہ ملول کر دینے والا ثابت ہوا۔(58) یہ معبد کے سامنے چوک میں منعقد ہوا۔''مہینہ نواں تھا اور اسی کی بیسویں تاریخ تھی اور سب لوگ اس معاملہ اور بڑی بارش کے سبب سے خدا کے گھر کے سامنے کے میدان میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ تب عزرا کاہن کھڑا ہوا اور ان سے کہنے لگا کہ تم نے خطا کی ہے اور اسرائیل کا گناہ بڑھانے کو اجنبی عورتیں بیاہ لی ہیں۔'' عزرا نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اجنبی بیویوں کو واپس بھیج دیں۔ ہر فرد کے معاملے کو جانچنے کے لئے خصوصی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ عورتوں اور بچوں کو مہاجرین کے گھروں سے نکال کر ''ملک کے لوگوں'' کے پاس واپس بھیج دیا گیا۔ اب بنی اسرائیل کی رکنیت صرف اور صرف ان افراد تک محدود کر دی گئی جو بابل کو جلاوطن ہونے والے افراد کی اولاد تھے یا پھر ان افراد کو خانوادہ اسرائیل میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی جو توریت کی اطاعت پر تیار تھے۔ توریت اب یروشلم کا سرکاری قانون بنا دی گئی۔ جو لوگ برادری سے خارج کر دیئے گئے۔ ان کی گریہ زاری کتاب یسعیاہ میں ہمارے لئے محفوظ کر دی گئی۔

ابراھام ہمیں قبول نہیں کرتا

اور اسرائیل ہمیں پہچانتا نہیں

لیکن اے یہواہ، اے خداوند

تو ہمارا باپ ہے

ہم عرصہ دراز سے ان لوگوں کی طرح ہیں

جن پر تو نے کبھی حکومت نہیں کی

ہم ایسے لوگ ہیں جو تمہارے نام کی نسبت نہیں رکھتے(59)

(یسیعاہ۔ 63:19 -17)

MAP (نقشہ)

''اسرائیل ہمیں تسلیم نہیں کرتا'' یروشلم سے نکالے گئے یہودی فرقہ ایم ھارعارز (ملک کے لوگوں) نے کوہ گرزیم پہ اپنا معبد تعمیر کرلیا یہ لوگ ایک مختلف قسم کی یہودیت پر عمل پیرا ہیں۔

''اجنبی لوگوں'' کو نکال باہر کرنے کی بے رحم پالیسی یروشلم کی تاریخ کا نمایاں حصہ بن گئی۔ اگرچہ یہ اسرائیل کی انتہائی اہم روایات کے برعکس اور منافی تھی لیکن زیرِ عمل رہی۔ بہت سے لوگوں نے اس طرزِ عمل کی مخالفت کی۔ وہ اس تصور کے ہی خلاف تھے۔ وہ سامرینہ اور اردگرد کے علاقوں کے لوگوں سے قطع تعلق نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ اس طرح یروشلم الگ تھلگ اور تنہائی کا شکار ہو جائے گا اور اسے زبردست اقتصادی نقصان پہنچے گا۔ لیکن بقیہ لوگوں نے اس نئے قانون کا پر جوش خیر مقدم کیا اور پوری مذہبی عقیدت کے ساتھ اس پر عمل درآمد کیا۔ عزرا کے بعد یروشلم میں آنے والی نسلوں کے بارے میں ہم بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن یہ جانتے ہیں کہ اگلی آٹھ نسلوں میں یہ قانون معبد کی طرح مرکزی حیثیت اختیار کئے رہا۔ یہوداہ کے لوگوں نے اسے پوری مذہبی تکریم کے ساتھ اپنائے رکھا۔ جب یہ دونوں مقدس اقدار خطرے میں پڑیں تو یروشلم میں بحران آگیا جس نے شہر کی نئی یہودی شناخت کو دھندلا دیا۔

حوالہ جات

1۔ یرمیاہ 4:23-26

2۔ زبور 74:3-7

3۔ زبور 137:9

4۔ زبور 79:4

5۔ یرمیاہ 41:4-6

6۔ نوحہ 4:5-10

7۔ نوحہ 1:8-9

8۔ 2۔ سلاطین 25:27-30

9۔ عزرا 2

10. ELIAS J. BICKERMANN, The Jews in the Greek age. (CCAMBRIDGE, MASS & LONDON, 1988), PP.47-48.

11. JONATHAN Z. SMITH, Earth & Gods, pp. 119.

12۔ زبور 137:4

13. BICKERMAN-The Jews in the Greek age-pp.241-242

14۔ حزقی ایل 1:26-28

15 ۔ حزقی ایل 43:1-6

16۔ حزقی ایل 31:34-36

17۔ حزقی ایل 40:2, 48:35

18۔ حزقی ایل 47:11-12

19۔ حزقی ایل 41:4, 40:48

20۔ حزقی ایل 40:28-31, 40:17-19

21۔ حزقی ایل 47:13-23

22۔ حزقی ایل 48:9-29

23۔ حزقی ایل 43:11

24. MARYDOUGLAS, Purity and Danger (LONDON,1966).

25 ۔ احبار 19:11-18

26۔ احبار 19;33-34

27۔ حزقی ایل 44:11-16

28۔ حزقی ایل 44:16-31

29۔ یسیعاہ 31:31-34 ‘حزقی ایل36:27-27

30۔ یسیعاہ 40:3-4, 44:20, 41:19-20

31۔ یسیعاہ 52:10

32۔ یسیعاہ 46:1

33۔ یسیعاہ 45:14

34۔ یسیعاہ 54:13-15

35 ۔ عزرا 2:64

36۔ حجی 2:6-9

37۔ عزرا 3:12-13

38۔ حجی 20:3, 2:6-9

39۔ زکریا 8:3, 4:14, 2:9

40۔ عزرا 4:1-3

41۔ عزرا 4:4

42۔ یسیعاہ 66:1

43۔ یسیعاہ 66:2

44۔ یسیعاہ 65:16-25

45۔ یسیعاہ 65:1-10, 56:9-12

46 ۔ یسیعاہ 56:7

47۔ نحمیاہ 2:8, 1:3

48۔ نحمیاہ، یروشلم کے تمام سابقہ گورنروں کی مذمت کرتا ہے۔ لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کیونکہ ان میں عزرا بھی شامل ہے۔ جب عزرا شہر میں آیا تو یہ خوب آسودہ اور گنجان آباد تھا۔

49۔ نحمیاہ 2:3

50۔ نحمیاہ 4:11-12

51۔ نحمیاہ 7:4-5

52۔ نحمیاہ 5

53. SETH KUNIN, Judaism, in Jean Holm with John Bowker, eds, Saered places (LONDON 1994) pp. 121-22.

54۔ عزرا 7:6

55۔ عزرا

56۔ عزرا (JEWS in Greek Age, P. 154) ' 7:21

57۔ نحمیاہ 8

58۔ عزرا 10

59۔ یسیعاہ 63:10-19

===========

چھٹا باب

انطاکیہ

333 قبل مسیح میں جب مقدونیہ کے سکندر نے فارس کے شاہ دارا سوم کو دریائے اسوس کے کنارے شکست دی تو یروشلم کے یہودیوں کو سخت صدمہ ہوا کیونکہ وہ گزشتہ دوسو سال سے فارس کے وفادار غلام تھے۔ پہلی صدی عیسوی کا یہودی مورخ جوزیفس فلیوس بتاتا ہے کہ ابتدا میں کاہن اعظم نے سکندر کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس نے آخری شاہ فارس کے ساتھ وفاداری کا عہد کیا ہوا تھا لیکن ایک رویا اور پھر سکندر کے وعدہ کے بعد کہ اس کی تمام تر سلطنت میں یہودیوں پر ان کے اپنے قوانین کے مطابق حکومت کی جائے گی، کاہن اعظم نے اطاعت قبول کر لی۔(1) لیکن حقیقت یہ ہے کہ سکندر کبھی بھی یروشلم میں نہیں آیا۔ پہلے پہل یونانیوں کے تسلط نے یہوداہ کے لوگوں کی زندگی کو بہت کم متاثر کیا۔ توریت ہی ان کے صوبے کا سرکاری قانون رہی اور انتظامیہ بھی وہی رہی جو فارس کی حکومت کے دوران کام کر رہی تھی، لیکن پھر یہودی یونانی تہذیب سے متاثر ہونے لگے۔ کاہن اعظم کے ساتھ سکندر کے طرز عمل کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ کچھ یہودی فطری طور پر یونانیوں کی ثقافت سے گریزاں رہے۔ وہ اپنے مذہبی رسم رواج سے وابستہ رہنا چاہتے تھے۔ لیکن بقیہ لوگوں کو یونانی تہذیب نے مسحور کر لیا اور یہ انہیں اپنی روایات کے قریب محسوس ہوئی۔ ان دونوں

گروہوں کے درمیان کشمکش پیدا ہوگئی جو اگلے تین سو برسوں تک یروشلم کی تاریخ میں نمایاں رہی۔

یونانی تہذیب سکندر کی فتوحات سے کئی عشرے پہلے مشرق قریب میں بتدریج داخل ہو رہی تھی۔ علاقے کی پرانی ثقافتیں دم توڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ لینے والی ثقافتوں میں یونانی اثرات غالب تھے۔ لیکن یروشلم کے یہودیوں کا غالباً یونانیوں کے ساتھ براہ راست کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یونانی تہذیب کے جو عناصر ان تک پہنچے تھے وہ فونیقیا کے ساحل پر واقع شہروں کے توسط سے پہنچ پائے تھے۔ یروشلم ایک بار پھر دور افتادہ مقام بن گیا۔ اس کی حیثیت بند کھاڑی جیسی ہوگئی۔ یہ کسی بھی مرکزی تجارتی شاہراہ پر واقع نہیں تھا جو تجارتی قافلے قریبی شہروں غزہ اور پیترہ میں ٹھہرتے تھے انہیں یروشلم میں کبھی کوئی کشش محسوس نہ ہوئی۔ دراصل یہ ایک غریب شہر تھا اور پھر یہاں سے کوئی خام مال بھی دستیاب نہیں تھا جو کسی صنعت کے کام آسکے۔ اپنے آپ میں مگن اس شہر کی زندگی معبد اور قدیم توریت کے گرد گھومتی تھی۔ یروشلم نے کبھی بین الاقوامی سیاست میں دلچسپی نہیں لی تھی اور علاقے میں مغرب سے آنے والی جدیدیت سے بے نیاز خود کو اپنے ماضی میں گم کر رکھا تھا۔

یہ سب کچھ اس وقت بدل گیا جب 13 جون 323 ق م کو سکندر بابل میں موت سے شکست کھا گیا۔ اس کا ممکنہ وارث بہت چھوٹا بچہ تھا۔ چنانچہ سکندر کی موت کے فوراً بعد سلطنت پر قبضہ کرنیکے لیے جرنیلوں کے درمیان تصادم شروع ہو گیا۔ اگلے دو عشروں تک سکندر کے مفتوحہ علاقوں میں اس کے چھ جانشینوں کی لڑائیوں کہ وجہ سے کھلبلی مچی رہی۔ اہم درمیانی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہودیہ (ریاست یہوداہ) پر مسلسل ان فوجوں کے حملے ہوتے رہے جو ایشیائے کوچک یا شام سے مصر کا رخ کرتی رہیں۔ ان کے ساتھ ساز و سامان اسلحہ، بیویاں اور غلام ہوتے تھے۔ یروشلم ان برسوں کے دوران کم از کم چھ مرتبہ مفتوح ہوا۔ اس کے باشندوں کو شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ امن و سکون کی تنہائی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ یروشلم کو پہلی دفعہ یونانیوں سے ایک تباہ کن، تشدد پسند اور جنگجو قوم کی حیثیت سے واسطہ پڑا۔ مقدونی جانشین پورے کنعان میں آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے، انہیں مقامی لوگوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ ان کی تاخت و تاراج سے صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو ان کے کسی کام آسکتے تھے۔ یونانی فلسفی، آرٹ، ادب اور جمہوریت جس نے مغربی دنیا کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا، ابتلا کے ان برسون میں یروشلم کے لوگوں کو قطعاً متاثر نہ کرسکے۔ وہ بھی یقیناً ہندوستانی دانشوروں کی طرح یہ رائے رکھتے تھے کہ ''یونانی طاقتور مگر بدطینت ہیں۔''

301 قبل مسیح میں یہودیہ، امرینہ، فونیقیہ اور پورا ساحلی علاقہ سکندر کے جانشین بطلیموس اول ساٹر نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس نے مصر کو اپنی قوت و اقتدار کا مرکز بنایا۔ اگلے ایک سو برس تک یروشلم بطلیموسیوں کی گرفت میں رہا۔ انہوں نے شام کے صوبہ کو شمال سے ہونے والے حملوں کی راہ میں ایک رکاوٹ کے طور پر استعمال کیا۔

زیادہ تر قدیم حکمرانوں کی طرح بطلیموسیوں نے بھی مقامی امور میں زیادہ دخل نہ دیا۔ انہوں نے ایک لچکدار لیکن موثر سیاسی نظام متعارف کرایا تاکہ سلطنت کے مختلف حصوں سے وہاں کی ضرورت کے مطابق مختلف انداز میں نمٹا

جائے۔صوبے کے کچھ علاقے شاہی جاگیریں تھیں اور یہ براہ راست شاہی خاندان کے تصرف میں تھیں۔

یونانیوں نے روم کے ساحل پر نئی بندرگاہیں تعمیر کیں جن میں یافہ اور ''میناریسٹر تیو'' شامل ہیں۔ بیت شان، فلوتیرہ اور پیلا میں نئی چھاؤنیاں بھی بنائی گئیں۔ بقیہ تمام صوبہ اپنے معاملات میں خودمختار بنا دیا گیا۔ الصور، صیدا، تریپولی اور ببلوس کے فونیقی شہر وسیع تر آزادی اور مراعات سے نوازے گئے۔ یونانی آبادکار شام میں آئے اور انہوں نے یہاں یونانی طرز کی شہری جمہوریتیں قائم کیں۔ غزہ، سیکم، مریسہ اور عمان جیسے شہروں کو بالاخر آزاد مقامی حکومتوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ یونانی سپاہی، تاجر اور مہم جو مشرق سے حاصل ہونے والے مفادات کو براہ راست حاصل کرنے کے لیے ان شہروں میں سیلاب کی طرح اُمڈ آئے۔ جن مقامی لوگوں نے یونانی زبان بولنا اور لکھنا سیکھ لیا انہیں ہیلنی قرار دے کر فوج اور انتظامیہ کے کم تر مناصب پر فائز ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

یونان کی سیاسی اور جمہوری ''اکائیاں'' اس علاقے کی قدیم اور گہری جڑیں رکھنے والی روایات کے لیے بالکل نئی اور اجنبی تھیں۔ یونانی ثقافت سیکولر تھی۔ یہ ایک ایسے روشن خیال طبقہ پر انحصار کرتی تھی جو مذہب اور سیاست دونوں سے آزاد تھا۔ یہ لوگ نہ تو کسی معبد کے زیر اثر ہوتے تھے اور نہ محل کے مفادات کو خاطر میں لاتے تھے۔ خدا یا کسی ماورائی قوت کے مقرر کردہ حکمران یا کاہنوں کی اشرافیہ کے کسی فرد کی مطلق العنانیت کی بجائے یونانی جمہوریائیں حکومت کو مذہب سے بالکل الگ رکھتی تھیں۔ نئے یونانی شہروں میں جمنازیم بھی بنائے گئے جن میں نوجوانوں کو یونانی نظریات کے مطابق ذہنی اور جسمانی تربیت دی جاتی۔ یہاں نوجوان یونانی ادب پڑھتے اور سخت قسم کی عسکری اور جسمانی تربیت سے گزرتے۔ ان تربیت گاہوں کو جنبازہ یا جمناسٹک گھر کہا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جو یونانیوں کو اپنی وسیع تر سلطنت کے دور افتادہ مقامات سے مربوط رکھتا۔ اس ادارے کے اپنے مذہبی نظریات تھے۔ اولمپک کھیلوں کی طرح نوجوانوں کے درمیان اتھلیٹک مقابلے ایک مذہبی فریضہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن یہ ہرکولیس اور ہیرمیس جیسے دیوتاؤں کی یاد میں منعقد کئے جاتے تھے۔ عام طور پر مقامی لوگوں کو جمناسٹک گھروں میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں ہونے والی سرگرمیاں صرف مراعات یافتہ لوگوں تک محدود تھیں اور یہ لوگ ظاہر ہے صرف یونانی النسل ہوا کرتے تھے۔ لیکن بطلیموسی حکمران ''دوسرے لوگوں'' کو بھی قبول کرلیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سکندریہ کے یہودیوں کو یہاں کے جمناسٹک گھروں میں تربیت دی جاتی تھی اور وہ یونانی اور یہودی ثقافت کا ایک خوبصورت امتزاج اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یونانی مادہ پرست تھے چنانچہ بعض اوقات پریشان کن ثابت ہوتے تھے لیکن بہت سے مقامی لوگوں کو اس نئی ثقافت میں تسکین ملتی تھی۔ کچھ لوگوں کے لئے یہ ثقافت اسی طرح ناقابل مزاحمت تھی جس طرح آج ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کے لیے مغربی ثقافت ہے۔ یہ پرکشش بھی تھی اور پسندیدہ بھی۔ اس نے بہت سی ممنوعات کو ختم کر دیا۔ اور اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لیے یہ پسندیدہ اور آزادی سے ہمکنار کرنے والی تھی۔

آغاز میں یروشلم ان نئے تصورات سے متاثر نہ ہوا۔ یہ یونانیوں کی جمہوریہ نہیں تھی۔ یروشلم کے بہت سے شہری اس بات سے خوف زدہ تھے کہ یہواہ کے شہر میں ہیرمیس کو توقیر دی جارہی ہے اور نوجوان بے لباس ہو کر ورزشیں کرتے ہیں۔ بطلیموسیوں کو یہودیہ میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہودی خود کو ایک ممتاز قوم سمجھتے تھے جن کی عنان حکومت گیروزیا ''بزرگوں کی ایک مجلس'' کے پاس تھی۔ یہ مجلس یروشلم میں بیٹھ کر امورِ مملکت چلاتی تھی۔ توریت بدستور اس قوم کا سرکاری قانون تھی۔ یہ صورت حال وہی تھی جو اہل فارس کے اقتدار کے دنوں میں پائی جاتی تھی۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ یہودیہ ایک معبد کی ریاست تھی جس پر کاہنوں کی حکومت تھی۔ بطلیموسی یہاں کسی مقامی ایجنٹ (اوئیکونوموس) کو اپنا نمائندہ مقرر کر دیتے تھے جو یہودیہ کے معاملات پر نظر رکھتا، یہ انتظام خاص طور پر جنگ کے دنوں میں ہوتا تھا۔ تب سپاہیوں کی ایک نفری بھی شہر میں متعین کر دی جاتی لیکن ریاست کے دیگر علاقوں میں یہودیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ بطلیموسیوں یا یونانیوں کی مصری حکومت کے ساتھ یہودیہ کا واحد رابطہ ہر سال بیس ٹیلنٹ (یونانیوں اور رومیوں کا زر حساب) خراج کی ادائیگی کی صورت میں ہوتا تھا۔

لیکن یروشلم کا بالآخر یونانی دنیا میں دھکیل دیا جانا ناگزیر تھا۔ پورا علاقہ یونانی اثرات کی لپیٹ میں آ رہا تھا چنانچہ یروشلم کب تک خود کو مقفل رکھ سکتا تھا۔ یونانی حکمران بطلیموس دوم (246-282 ق م) کے دور اقتدار میں یروشلم کا ایک شہری جوزف (یوسف) حکومت کی طرف سے پورے صوبہ شام کے محاصل کی وصولی کے لیے منصب دار بننے میں کامیاب ہو گیا۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک وہ ملک کا طاقتور ترین فرد تھا۔ جوزف کا تعلق طوبیاں قبیلہ سے تھا۔ یہ ایس طوبیاں منصب دار کی اولاد تھا جس نے نحمیاہ کے لیے مسائل پیدا کئے تھے۔ طوبیون نے اپنی زندگیاں توریت کی حدود میں رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اب بھی غیر ملکیوں سے رابطوں کو پسند کرتے تھے اور یروشلم کی ''مذہبی اشرافیہ'' کے سامنے سر جھکانے سے گریزاں تھے۔ ماورائے اردن میں عمان کی طوبیائی جاگیر بطلیموسیوں کی ایک اہم عسکری کالونی تھی۔ جوزف یونانی دنیا میں خود کو توانا محسوس کرتا تھا۔ اس نے یروشلم میں یونانیوں کا اقتصادی اور مالیاتی نظام متعارف کرایا اور پہلا یہودی ساہوکار یا بنکار بن گیا۔ بہت سے یہودی جوزف کی کامیابی پر نازاں تھے۔ مورخ جوزیفس کا کہنا ہے کہ جوزف ایک عیار، حیلہ ساز اور ماہر ساہوکار تھا۔ (2) لیکن وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو غربت سے نکالا اور اسے اس معاشی آسودگی کا حصہ دار بنانے میں کامیاب ہوا جو یونانی یہاں لائے تھے۔

طوبیاہ قبیلے کے لوگ یروشلم میں یونانی تہذیب وتمدن کے بانی بن گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا شہر ان قدیم روایات سے جان چھڑا لے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ اور محدود مذہبی دائرے میں لوگوں کو باندھے ہوئے تھیں۔ اس معاملے میں وہ اکیلے نہیں تھے۔ یونانی سلطنت کے مختلف حصوں میں لوگ آباؤ اجداد کے رسم و رواج سے چھٹکارا پانے کی خواہش رکھتے تھے۔ انہیں یہ رسم و رواج اب اچانک

ظالمانہ نظر آنے لگے تھے۔انہیں اپنی دنیا ایک ایسے حصار میں پسند نہیں تھی جو انکی شناخت کی حدود و قیود کا تعین کرے۔اب وہ نئے افق اور نئی وسعتیں چاہتے تھے۔اب لوگوں کو جمہوریائیں بھی محدود دنیائیں محسوس ہو رہی تھیں۔خود یونانی بھی اپنے آپ کو بین الاقوامی شہری سمجھتے تھے۔اپنی مادر وطن کو مقدس ترین سرزمین سمجھ کر وہاں رہنے کی بجائے یونانی استعمار پسند اور عالمی سیاح بن گئے تھے۔سکندر کی فتوحات نے ان پر دنیا کے دروازے کھول دیئے تھے۔چنانچہ شہری جمہوریائیں یا سیاسی اکائیاں انہیں ناکافی اور محدود لگتی تھیں۔اپنی جغرافیائی حدود سے نکلنا یونانیوں کے اجداد کو انتشار و افتراق میں اترنا محسوس ہوتا تھا لیکن اب انہی یونانیوں کی اولاد کو یہ عمل آزاد فضاؤں اور نئی دنیاؤں کا راستہ دکھاتا تھا۔یونانی سلطنت میں یہودی بھی ایک جگہ بندھے رہنے کو پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بنی نوع انسان کے رکن بنیں اور عالمی شہریت اختیار کریں۔ اب انہیں ایسی منتخب قوم کے ارکان بنے رہنا قبول نہیں تھا جسے ایک فرسودہ اور استبدادی قانون بھیڑوں کی طرح ہنکار رہا تھا۔تیسری صدی قبل مسیح کے اختتام پر متعدد یہودی یونانی زبان سیکھ چکے تھے اور اپنے بچوں کو یونانی نام دے رہے تھے۔

لیکن اب بھی بہت سے یہودیوں کو یہ سب کچھ انتہائی خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔وہ مسلسل اپنی روایات سے بندھے ہوئے تھے جن کا مرکز ومنبع معبد تھا۔بالخصوص نچلے طبقات جو نئی خوشحالی کے حصہ دار نہیں بن سکتے تھے وہ ماضی کے مقابلے میں زیادہ جوش وخروش کے ساتھ مذہبی قوانین کی پابندی کر رہے تھے۔یہ مذہبی قوانین سکھاتے تھے کہ ہر چیز اپنی متعین جگہ پر رہنی چاہیے۔سماجی نظام اسی وقت تک برقرار رہ سکتا ہے جب تک لوگ اور چیزیں ان مقامات پر اور ان حدود و قیود میں رہیں جن سے ان کا تعلق ہے۔قدامت پسند یہودی فطری طور پر کاہنوں کی طرف کھنچے چلے گئے کیونکہ یہ توریت اور معبد کے محافظ تھے۔ان کے قائدین اونائی تھے جو صدوق کاہن اعظم کی اولاد میں سے تھے۔ اونائی بذات خود یونانی نظریات کے گرویدہ ہو رہے تھے۔ان میں سے کئی ایک کے نام یونانی تھے۔لیکن وہ قدیم نظریات و روایات کو چھوڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ انہی کی وجہ سے وہ قوت واختیار اور مراعات واستحقاق کے مالک تھے۔

صدی کے اختتام کے قریب حالات کا رخ بتا رہا تھا کہ شام کا صوبہ بطلیموسیوں کی گرفت سے نکل کر سیلوکس بادشاہوں کی جھولی میں گرنے والا ہے۔سکندر کی موت کے بعد اس کے ایک سپہ سالار بطلیموس نے مصر پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ دوسرے سپہ سالار سیلوکس نے قدیم ایرانی سلطنت کا انتظام سنبھالا اور میسوپوٹیمیا کا اپنا مرکز بنایا۔ 219 قبل مسیح میں نوجوان مہم جو سیلوک بادشاہ انطیوکس سوم نے سامرینہ اور فونیقی ساحل کے شہروں پر یلغار کر دی۔وہ چار برس تک اس علاقے کو اپنی تحویل میں رکھنے میں کامیاب رہا۔اگرچہ اسے چوتھے بطلیموسی، فیلو پیٹر نے پسپائی پر مجبور کر دیا لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ وہ پھر واپس آئے گا۔چونکہ طوبیائی قبیلہ جوزف کی منصب داری کی وجہ سے بطلیموسیوں کا وفادار تھا چنانچہ یروشلم کے قدامت پسند یہودی، سیلوکس حکمرانوں کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔وہ خواہش اور توقع رکھتے تھے کہ انطیوکس ضرور واپس آئے گا۔طوبیائی اچانک خاندانی تنازعے میں الجھ گئے چنانچہ اونائی قبیلہ کا کاہن اعظم سائمن دوم شہر

میں اثر ورسوخ حاصل کر گیا اور سیلوکس حکمرانوں کی راہ ہموار کرنے لگا۔ جب 203 قبل مسیح میں انطیوکس نے اس علاقے پر حملہ کیا تو اس کے حامی یہودی بھرپور انداز میں سرگرم ہوگئے۔ ان کی مدد سے انطیوکس نے یروشلم کی شہر پناہ پر قبضہ کرلیا۔ اگرچہ اگلے برس اس کے سپاہیوں کو شہر سے باہر دھکیل دیا گیا لیکن 200 قبل مسیح میں انطیوکس نے ایک بار پھر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ طویل محاصرے اور شدید نقصان کے بعد بالآخر وہ شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس دفعہ سیلوکسی فوجیں پورے علاقے کو زیر کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ سیلوکسی اسے جوف شام اور فونیقیا کا صوبہ کہتے تھے۔ مختلف سیاسی اکائیوں کے لیے ایک بار پھر مختلف قسم کے انتظامات کئے گئے۔ فونیشین اور یونانی شہروں، چھاؤنیوں اور شاہی جاگیروں کا انتظام از سر نو کیا گیا۔ یہودی محروروں کی مدد سے انطیوکس نے یہودیہ کے لیے ایک خصوصی ضابطہ تشکیل دیا اور ایک معاہدہ کے تحت معبد کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھانے کے علاوہ اپنے حامیوں کو یروشلم میں مراعات سے نوازا۔ سائمن دوم کو یہودیہ کی مذہبی اشرافیہ کا سربراہ بنایا گیا۔ اب قدامت پسند کاہنوں کی جماعت کو یونان کے حامی طوبیائی قبیلہ پر بالادستی حاصل ہوگئی۔ توریت کو مسلسل سرکاری قانون کا درجہ حاصل رہا۔ یہودی بزرگوں کی مجلس گیروزیا مقتدر رہی۔ نئے ضابطہ کے تحت معبد کے لیے بھی نئے انتظامات متعارف ہوئے۔ اسے نحمیاہ اور عزرا کے دور سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت دی گئی۔ معبد کے تقدس کو تحفظ دینے کے لیے یروشلم شہر کو ہر طرح کی آلائش سے اور نجاست سے پاک کر دیا گیا۔ شہر کے دروازوں پر یہ حکم آویزاں کر دیا گیا کہ ناپاک جانوروں کی پرورش اور قربانی ممنوع ہے۔ یہودی مردوں کو معبد کے داخلی صحن میں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ مردوں کو اس صورت میں داخلے کی اجازت تھی کہ وہ انہی پابندیوں کا احترام کریں اور مذہبی طہارت حاصل کریں جن کی پابندی کاہن کرتے ہیں۔ ''کافروں'' کو بھی داخلی صحن میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ ایک اختراع تھی جس کی بنیاد توریت میں موجود نہیں تھی۔ اس طرح کی پابندیاں دراصل قدامت پسند یہودیوں کی غیر یہودی دنیا کے لیے نفرت کا اظہار تھیں۔ علاوہ ازیں یہ قدغن شہر میں آنے والے یونانی سیاحوں کو ایک زبردست تاثر دیتی تھی۔ قدیم مذاہب میں معبد غیر مقلدین کے لیے ایک ممنوعہ علاقہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی یہ بات فطری محسوس ہوتی تھی کہ اغیار کو معبد میں نہ داخل ہونے دیا جائے۔ یونان میں البتہ آزاد فضا تھی وہاں کوئی بھی فرد کسی مندر یا معبد میں جا سکتا تھا۔ اسے صرف طہارت کا مرحلہ طے کرنا ہوتا تھا۔ اب یروشلم میں آنے والے یونانیوں کو داخلی صحن کے باہر روک دیا جاتا تھا ان کے ساتھ ساتھ عورتیں اور عام یہودی بھی داخل ہونے کے مجاز نہیں ہوتے تھے جو مذہبی طہارت کے حامل نہیں ہوتے تھے۔ یہ سب چونکہ توریت کی نظر میں ''ناپاک'' تھے چنانچہ ان کو مقدس مقام سے دور رکھنا ضروری

تھا۔

جو یہودی مذہبی تقاضے پورے کرتے تھے وہ معبد کے زائرین میں شامل تھے اور خدا سے رابطہ کے تجربے و احسا

س کے بعد ایک نئی قسم کی پاکیزگی اور
آسودگی سے ہمکنار ہوتے تھے۔ بن سراح ایک محرر اور مورخ تھا۔ وہ ابتدائی سیلوکسی دور میں یروشلم میں موجود تھا اور وقائع نگاری کر رہا تھا۔ اس کی تحریریں ہمیں اس دور کی مذہبی صورتحال سے آگاہ کرتی ہیں۔ اس نے سائمن کی مذہبی سرگرمیوں اور یوم کفارہ کی رسوم کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے۔ یہی ایک دن ایسا ہوا کرتا تھا جب تمام خدا پرستوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کاہن اعظم کو دیور (خانہ اقدس) میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔ بن سراح ایک یوم کفارہ کا احوال بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''جب کاہن اعظم خانہ اقدس سے اس کی تقدیس اور جلال لے کر نمودار ہوا تو ایسے جگمگا رہا تھا۔ جیسے سورج کی کرنوں میں معبد کی سنہری چھت ضوفشاں ہوتی ہے۔ جیسے چمکدار بادلوں میں قوس قزح ہوتی ہے۔
وہ ایک ایسا زیتون کا پیڑ نظر آ رہا تھا جو پھل سے لدا ہوا ہو اور ایک ایسا سرو تھا جو آسمانوں کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ (3) حقیقت مطلق سربلند اور اس کا ادراک وجدان انگیز تھا۔'' سائمن کے دور میں کاہن اعظم کا منصب ایک نیا درجہ حاصل کر چکا تھا۔ یہ یہودیت کی یک جہتی کی علامت تھا اور یروشلم کی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کر رہا تھا۔ بن سراح کا خیال ہے کہ صرف کاہن اعظم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ توریت کی حتمی تفسیر و ترجمانی کر سکے۔ (4) وہ تسلسل کی علامت بھی تھا کیونکہ (حضرت) داؤد کا خاندان صرف چند پشتوں تک برسر اقتدار رہا تھا لیکن (حضرت) ہارون کی اولاد میں کاہن کا منصب ہمیشہ کے لیے تھا۔ (5) اس دور میں یہواہ کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں اتنا مقدس اور ماورائے ادراک ہو چکا تھا کہ اس کا نام لینا بھی بے حرمتی اور توہین کے مترادف تھا۔ توریت کے متن میں عبرانی لفظ یہواہ اب یہودیوں کے نزدیک ''آقا'' اور ''برتر و بالا'' کے مترادف تھا۔ صرف کاہن اعظم خدا کا نام اپنی زبان پر لا سکتا تھا اور صرف اور صرف سال میں ایک دن، یوم کفارہ کے موقعہ پر ایسا کر سکتا تھا۔ بن سراح نے یروشلم میں تعمیراتی کام کے لیے بھی سائمن کی بہت تعریف کی ہے۔ اس نے شہر کی دیواروں اور معبد کی ڈیوڑھیوں کی بھی مرمت کی جو 200 قبل مسیح میں محاصرہ کے دوران ٹوٹ پھوٹ کی شکار ہو چکی تھیں۔ اس نے ایک ''تالاب'' بھی بنوایا جو معبد کے شمال میں تھا اور ایک ''سمندر'' دکھائی دیتا تھا۔ اس کو بیت حمدا یعنی رحم کے گھر کا تالاب کہا گیا۔ روایتی طور پر عمارتیں تعمیر کرنا ایک بادشاہ کا فریضہ ہوا کرتا تھا لیکن انطیوکس نے تعمیر و مرمت کے کاموں کے لیے شاہی خزانے سے کچھ بھی دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سائمن نے از خود بادشاہ اور کاہن کے فرائض سنبھالتے ہوئے یروشلم میں ضروری تعمیراتی کام مکمل کروائے۔ (6)

بن سراح قدامت پسند تھا۔ وہ اس مادہ پرستی کی مذمت کرتا ہے جو اب شہر کے لوگوں میں سرائیت کر رہی تھی اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ یونانیوں جیسی تاجرانہ سوچ اپنا رہے تھے۔ یونانی اس کا الزام بحر روم کے ساحلی مکینوں کی زر پرستی کو دیتے تھے حالانکہ وہ اس قباحت کو خود مخرب سے یہاں لائے تھے۔ ابتدائی دنوں میں صیہونی عقائد کا اصرار تھا کہ یروشلم غریبوں کے لیے پناہ گاہ ہے لیکن اب بن سراح متاسف تھا کے یروشلم کے شہری غربت کو ذلت سمجھتے ہیں اور غریب کو

دولت کی دوڑ میں بے رحمی کے ساتھ کچلا جا رہا ہے۔(7) اگر چہ بن سراح ایسے یہودیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے جو یونانی ثقافت کو اپنا رہے ہیں لیکن وہ خود بھی یونانیوں کی تہذیبی چمک دمک سے محفوظ نہ رہ سکا۔سوال یہ تھا کہ آخر یہودی نوجوان (حضرت) موسیٰ کی تعلیمات کا اس طرح مطالعہ کیوں نہیں کرتے جس طرح یونانی نوجوان جمنا سٹک گھروں میں ہومر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ایک انقلابی تجویز سامنے آئی۔چنانچہ طے ہو گیا کہ اب عام آدمی توریت کے کچھ حصے بہر طور حفظ کرے گا،لیکن ان کی تلاوت بر سر عام اور از خود نہیں کرے گا۔کیونکہ قوانین کی توضیح و تفسیر صرف کاہنوں کا کام تھا لیکن بن سراح پروہت یا کاہن نہیں تھا۔وہ ایک یہودی دانشور تھا۔اس کا ایمان تھا کہ توریت تمام مرد یہودیوں کے لیے آزادانہ تعلیم کی بنیاد فراہم کر سکتی ہے۔پچاس سال بعد بن سراح کے پوتے نے توریت کا ترجمہ یونانی میں کیا۔(8) اب اسے ہر کوئی پڑھ سکتا تھا۔اب پورے مشرق قریب میں پرانے مذاہب جو یونانی تہذیب کے مخالف تھے،اب یونانیوں سے ربط وضبط کی وجہ سے تبدیلیوں سے گزر رہے تھے۔یہی حال یہودیت کا تھا۔بن سراح جیسے یہودیوں نے بہت پہلے سے یونانی تعلیمی نظریات کو اپنی روایت میں مدغم کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اب ربانوی یا ربی یہودیت کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔یہودیوں میں ربی کا منصب خالصتاً یونانی تصور تھا۔بعد میں سوال و جواب کا جو طریقہ کار ربیوں نے اپنایا وہ بھی سقراط کے اثرات کا نتیجہ تھا۔

کچھ یہودی مزید آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ مکمل یونانی تعلیم حاصل کریں۔وہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ یہودیت سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔بہت جلد یروشلم میں ان کا تصادم قدامت پسندوں سے ہو گیا۔کشاکش کے ابتدائی آثار 180 ق م میں نمودار ہوئے،جب سائمن دوم کے پوتے کاہن اعظم اونیاس سوم پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے معبد کے خزانے میں ایک خطیر رقم جمع کر رکھی ہے۔بادشاہ سیلوکس چہارم نے فوراً اپنا وزیر بیلیو ڈورس انطا کیہ سے یروشلم روانہ کیا۔سیلوکس کا حکم تھا کہ کاہن نے جو دولت معبد میں جمع کر رکھی ہے وہ سیلوکی سلطنت کی ملکیت ہے چنانچہ اسے فوراً ضبط کر کے شاہی خزانے میں لایا جائے۔اس واقعہ کے بعد سیلوکی حکمرانوں کے لیے یروشلم میں اطاعت و اعانت کا جذبہ سرد پڑ گیا۔دراصل 192 ق م میں انطیوکس سوم کو پیش قدمی کرتی ہوئی رومن فوجوں کے ہاتھوں شرم ناک شکست کی ذلت اٹھانا پڑی تھی۔رومنوں نے یونان اور اناطولیہ کا بہت بڑا حصہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔انطیوکس سوم کو ایک شرط پر اپنا تخت برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ بھاری تاوان ادا کرنے کے بعد ہر سال ایک بڑی رقم خراج میں ادا کیا کرے گا، چنانچہ اس کے جانشینوں کو خراج ادا کرنے کے لیے ہمیشہ ہی شاہی خزانے میں دولت کی کمی کا مسئلہ درپیش رہتا تھا۔سیلوکس چہارم غالباً یہ سمجھتا کہ چونکہ یہودیوں سے ہونے والے معاہدہ کے مطابق معبد کے مذہبی اور انتظامی اخراجات شاہی خزانے سے ادا کئے جاتے ہیں چنانچہ معبد کی آمدنی پر بادشاہ کا پورا پورا حق ہے۔لیکن اس نے معبد کے بارے میں یہودیوں کی حساسیت کو مدنظر نہ رکھا۔اس کا اندازہ بھی غالباً اسے پہلی بار ہوا۔جب بیلیو ڈوریس یروشلم میں پہنچا اور معبد کا خزانہ ضبط کرنے پر

اصرار کیا تو لوگ دہشت زدہ ہو گئے۔ معبد کے خزانے کو تحویل میں لینا ان کے نزدیک معبد کے تقدس کو مجروح کرنا تھا۔ اونیاس کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔ وہ رعشہ زدہ مریض کی طرح کانپنے لگا۔ عورتیں ٹاٹ کے کپڑے پہن کر گلیوں میں آ گئیں۔ نوجوان لڑکیاں گھروں کی کھڑکیاں کھول کر خدا سے مدد کی فریاد کرنے لگیں۔ پھر ایک معجزے نے معبد کے تقدس کو بچا لیا۔ جونہی بیلیوڈورس معبد کے خزانے میں پہنچا، اس پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ فرش پر اوندھے منہ گر گیا۔ بعد میں اس نے تصدیق کی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے یہودیوں کے خدا کو وہاں دیکھا تھا۔

یہ واقعہ ایک نیا سنگ میل تھا۔ اب معبد کی حرمت پر ہونے والا کوئی حملہ یروشلم میں فسادات کا باعث بن سکتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معبد یہودیوں کی روح کا اظہار بن گیا تھا۔ یہ یہودیوں کی جذباتی دنیا کا مرکزی مقام اور ان کی شناخت کا ذریعہ تھا۔ اسے وہ قوم کا مرکزہ سمجھتے تھے جو ان کی زندگی تخلیقی امور اور بقا کا سرچشمہ تھا۔ یروشلم کا معبد ابھی تک ان یہودیوں کے لیے مرکزی کشش کا حامل تھا جو توریت کو سرچشمہ ہدایت سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ وطن سے دور یہودی عبادت کے وقت اپنا رخ یروشلم کی طرف کر لیتے تھے اور مذہبی تہواروں کے موقعہ پر معبد پہ حاضری کے لیے یروشلم کے لیے رخت سفر باندھ لیا کرتے تھے۔ زبور کے گیت، دعائیں اور مذہبی تحریریں یروشلم کو جنت ارضی قرار دیتی تھیں، جہاں خود خدا رابطے کے لیے موجود تھا۔ دنیا یہودیوں کو جذب کرنے پر مائل تھی اس میں اپنی شناخت اور بقا کی جدوجہد ضروری تھی۔ معبد اور اس کا شہر انہیں ایک حیات بخش تحفظ مہیا کر رہا تھا۔ چنانچہ کافروں کو معبد کی کسی عمارت کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مقدس فاصلے کو ختم کرنے کی کوشش بے حرمتی کا ایسا اقدام تھا جسے یہودی غیر یہودیوں کی طرف سے زنا کے مترادف سمجھتے تھے۔ یہ عقل و استدلال کی بات نہیں، مذہبی جذباتیت اور جبلی ردعمل کا بے ساختہ اظہار تھا۔

180 ق م میں بیلیوڈورس کے واقعہ کے ساتھ یونانی تہذیب کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش ختم نہ ہو سکی۔ سرگوشیاں جاری تھیں کہ بیلیوڈورس کی بیماری میں اونیاس کا کوئی حربہ ضرور موجود ہے چنانچہ اسے سیلوکسی دربار میں جا کر اپنی برأت کا اظہار کرنا تھا۔ لیکن وہ بڑی سادگی سے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل گیا۔ جب وہ انطاکیہ پہنچا تو اس کے طالع آزما بھائی جوشوا یا جیسن (اسے خود یہ نام پسند تھا) نے سازش کرتے ہوئے بادشاہ کو ایک خطیر رقم رشوت میں دی اور کاہن اعظم کے منصب کے لیے بادشاہ سے حکم نامہ حاصل کر لیا۔ اس حکم نامے کا مطلب تھا کہ اونیاس کو مجرم سمجھ لیا گیا ہے۔ اونیاس کو دربار سے فرار ہونا پڑا۔ لیکن بعد میں اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ جیسن اپنے بھائی کی طرح قدامت پسند نہیں تھا۔ اس کے نزدیک توریت ایک بے معنی چیز تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ یونانی طرز حیات اپنا کر آزادانہ زندگی بسر کریں۔ لیکن ابھی اس نے کاہن اعظم کا منصب سنبھالا ہی تھا کہ شاہ سیلوکس بھی اپنے بھائی انطیوکس اا ایپی فینس کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ جیسن نے نئے بادشاہ کو مزید رشوت کی پیش کش کی اور 200 ق م کا معاہدہ منسوخ کرنے کی درخواست کی تاکہ شہر خود مختار ہو سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہودیہ ایک قدیم اور فرسودہ معبد سے وابستہ پسماندہ ریاست بنی رہے۔ وہ یروشلم کو یونان

کی شہری ریاست جیسا بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے شاہی سرپرستوں کی نسبت سے اس کا نام بھی انطاکیہ تجویز کیا۔ دولت کا ضرورت مند انطیوکس فوراً راضی ہو گیا۔ اس نے جیسن کا پروگرام قبول کر لیا۔ انطیوکس کا خیال تھا کہ یہ اقدام یہودیہ میں اس کے اقتدار کو استحکام مہیا کرے گا۔

یروشلم راتوں رات یونانی شہری ریاست نہیں بن سکتا تھا۔ شہر کا مزاج صدیوں سے ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھل چکا تھا۔ اب شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو یونانی معاشرت سے مانوس کر کے ہی وہاں جمہوری نظریات نافذ کیے جا سکتے تھے۔ عبوری اقدام کے طور پر جیسن کو شاہ پرستوں (انطیوکیوں) کا ایک طبقہ منظم کرنا پڑا جو شہر کو یونان کے رنگ روپ میں ڈھالنے کا عزم رکھتے تھے۔ ایک جمنیزیم بالخصوص اشتعال انگیز انداز میں معبد کے پاس بنایا گیا جس میں نوجوان یہودی ہومر کا مطالعہ کرتے، یونانی فلسفہ سمجھتے، موسیقی سیکھتے اور یونانی روایت کے مطابق بے لباس ہو کر کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے۔ لیکن جب تک یروشلم مکمل طور پر ایک شہری جمہوری ریاست نہ بن جاتا، تب تک توریت ہی سرزمین کا قانونی ضابطہ تھی، چنانچہ جمنیزیم میں ہیرمیس اور ہرکولیس سے عقیدت مندی کا اظہار نہ کیا جا سکا۔ پہلے مرحلے میں جیسن کو خوب عوامی تعاون ملا۔ بائبل ہمیں جمنیزیم کی مخالفت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ جونہی اتھلیٹک ورزشوں کے لیے گانگ بجتا کاہن تیزی سے معبد کے پہاڑ سے اترتے اور ان ورزشوں میں شریک ہو جاتے۔ کاہن، زمیندار، تاجر اور ہنرمند سبھی یونانی آداب و رسوم میں کشش محسوس کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ طرز حیات یروشلم میں آزاد معاشرے اور بہتر معیشت کا ذریعہ ہے۔ اب نحمیاہ اور عزرا کی الگ تھلگ رہنے کی پالیسیوں کی مخالفت توانا ہو گئی۔ یروشلم کے زیادہ تر یہودی عالمی شہریت کے یونانی تصور کے قائل ہو چکے تھے۔ اب انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ یہودیت یونانی دنیا سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ اب (حضرت) موسیٰ کو لائی کرگس جیسا قانون دہندہ سمجھا جانے لگا۔ توریت کو بھی اب مقدس درجہ نہیں دیا جا رہا ہے۔۔۔ ''ابرہم نے بھی تو احکام الٰہی کی پابندی نہیں کی تھی۔ اور کیا اس نے ممرے میں خدا کی دعوت کے دوران گوشت اور دودھ ایک ساتھ استعمال نہیں کیا تھا۔'' نوجوان کھلم کھلا کہتے تھے کہ یہودیوں کو غیر یہودیوں سے جنونیوں کی طرح الگ رہنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے پڑوسی ممالک سے دوستی کر کے اور ان سے ثقافتی اور معاشی روابط رکھ کر یہودی اس ابتدائی اتحاد کی طرف جا سکتے تھے جو بابل کا مینار بننے کے بعد اور بنی نوع انسان کے مختلف قبیلوں اور مذاہب میں تقسیم ہونے سے پہلے موجود تھا۔ جب شاہ انطیوکس اپی فینس نے 173 ق م میں یروشلم کا دورہ کیا تو اس کا زبردست استقبال کیا گیا۔ جیسن نے یروشلم کے لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے ان کے نئے آقا کی پذیرائی کے لیے گلیوں میں مشعل بردار جلوس نکالا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا جب یروشلم رسمی طور پر شہری جمہوریہ کے روپ میں سامنے آیا۔ یہ ایسی پیش رفت تھی جس پر زیادہ تر مقامی لوگ بہت خوش تھے۔

لیکن یونانی کروفر سے متاثر یہودی گروہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔ 172 ق م میں جیسن نے وعدہ کے مطابق

انطیوکس کو خراج ادا کرنے کے لیے اپنا ایک ساتھی کاہن مینیلاس انطاکیہ بجھوایا۔مینیلاس نے بھی وہی کچھ کیا جو جیسن نے اونیاس کے ساتھ کیا تھا۔مینیلاس نے شاہ انطیوکس کو ایک بھاری رقم کے وعدہ پر جیسن کو معزول کروا کر اس کی جگہ اپنی تقرری کا حکم نامہ لے لیا۔مینیلاس کاہن اعظم بن کر یروشلم واپس آیا۔جیسن کو جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔اس نے اردن کے پار عمان کے قریب طوبیاہ قبیلے کی ایک جاگیر میں پناہ لے لی۔لیکن یروشلم کے لوگوں نے مینیلاس کو کاہن اعظم کی حیثیت سے قبول نہ کیا۔وہ اگرچہ ایک کاہن خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن صدوق کا ہنکی اولاد میں سے نہیں تھا۔ چنانچہ لوگوں کی نظر میں وہ اس منصب کے لائق نہیں تھا۔مینیلاس نے شاہ انطیوکس کو معاہدہ کے مطابق رقم ادا کرنے کے لیے معبد کا خزانہ ہڑپ کرلیا۔ یونانی سحر میں گرفتار بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔یہ شاہ پرست طبقہ ان گنتی کے چند افراد تک محدود ہوگیا۔ ظاہر ہے ان کا انحصار سیلوکس بادشاہ کی اعانت وسرپرستی پر تھا۔

انطاکیہ نواز عناصر نے کئی گھٹیا قسم کی حرکتیں کیں جو تباہ کن ثابت ہوئیں۔وہ یونان جیسی اچھی اور تن آسان زندگی چاہتے تھے۔ان میں سے کچھ پورے خلوص کے ساتھ نسبتاً نرم یہودیت کے خواہش مند تھے۔خود ہمارے زمانے میں یہودیوں نے جدیدیت اپنانے کے لیے اپنی روایات میں اصلاحات لانے کی کوشش کی ہے جسے بہت سے یہودیوں نے خوش دلی سے قبول کرلیا ہے۔ لیکن اس دور میں

انطاکیہ نواز مصلحین کی بڑی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے انطیوکس کو یروشلم کے لوگوں کی سوچ سے آگاہ نہ کیا۔ چنانچہ اسے بروقت علم ہی نہ ہوسکا کہ یروشلم کو یونانی شہر بنانے کا منصوبہ غیر مقبول ہو چکا ہے۔مینیلاس بادشاہ کو یقین دلاتا رہا کہ یروشلم یونانی شہر بن رہا ہے۔چنانچہ اس نے یروشلم کا نیا نام یہودی انطاکیہ (اصل الفاظ: یہودیہ میں انطاکیہ) رکھ دیا۔وہ جمنیزیم جیسے دیگر اداروں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ان میں ایفی بیٹ (نوجوانوں کو عسکری تربیت اور ثقافتی آداب سے روشناس کرانے والا ادارہ) اور یونانی کھیلوں کا اہتمام کرنے والا ادارہ بھی شامل تھے لیکن ان کوششوں کو 170 ق م میں شدید دھچکا پہنچا جب

افواہ پھیل گئی کہ رومنوں کے ساتھ لڑائی کے دوران انطیوکس مصر میں مارا گیا ہے۔اس افواہ کے پھیلتے ہی جیسن نے علم بغاوت بلند کردیا۔وہ شہر میں داخل ہوگیا اور مینیلاس اور دوسرے یونان نواز عناصر کو شہر پناہ میں دھکیل دیا۔لیکن انطیوکس زندہ تھا۔اس نے مشتعل ہوکر فوراً یروشلم پر دھاوا بول دیا اور جیسن کو ایک بار پھر راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔انطیوکس نے باغیوں کا ساتھ دینے پر یروشلم کو سزا دیتے ہوئے معبد کو لوٹ لیا۔اس نے معبد کے خزانے،سونے کی قربان گاہ،شمع دان،خانہ اقدس کا پردہ،سونے چاندی کے برتن اور جو کچھ ہاتھ لگا سمیٹ لیا۔مقدس مقام کی بے حرمتی اور لوٹ مار کو لوگ نظر انداز نہ کرسکے اور اس واقعہ کے بعد یونانیوں اور انطاکیہ نواز یہودیوں کو کھلا دشمن سمجھا جانے لگا۔یروشلم اب شہری ریاست کی بجائے ایک چھاونی میں تبدیل ہوگیا۔اس پر مینیلاس کی حکومت برقرار رکھی گئی جس کے تحفظ کے لیے شامی سپاہیوں کا ایک رسالہ موجود رہتا

تھا لیکن شہر میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے یہ انتظام کافی نہ تھا۔ اگلے برس انطیوکس کو ایک اور رجمنٹ وہاں بھیجنا پڑی جس نے سبت کے دن یروشلم پر حملہ کیا اور شہر کی دیواروں کو شدید نقصان پہنچایا۔ اب شامیوں نے ایک نیا قلعہ تعمیر کیا جو معبد کے ملحقات سے فاصلہ پر تھا۔ اسے عکرہ کا نام دیا گیا۔ عکرہ یروشلم میں سیلوکسی حاکموں کا صدر دفتر بن گیا۔ دراصل عکرہ ایک الگ آبادی یا بستی تھی جس میں غیر خدا پرست سپاہی اور انطاکیہ نواز یہودی رہتے تھے یہاں یونانی دیوتاؤں کی عبادت بھی ہوتی تھی۔

MAP (نقشہ)

دیوار گریہ کے سائے میں موجود صومعہ صحائف توریت کے نئے جزدان کی رسم تبریک کا منظر۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہ ہوئی۔ غالباً مینیلاس اور اس کے انطاکیہ نواز ساتھیوں کے اشارہ پر انطیوکس نے ایک فرمان جاری کیا جس نے یہودیوں کی اکثریت کو برہم کر دیا اور ان کے لیے اب کافر لوگوں کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا۔ اس فرمان کے تحت 200 ق م کا معاہدہ منسوخ کر کے یہودیہ میں یہودیت پر پابندی نافذ کر دی گئی۔ تاریخ میں یہ سب سے پہلا مذہبی جبر اور اذیت رسانی کا اقدام تھا۔ معبد میں مذہبی رسوم کی ادائیگی سبت کے دن کا احترام، ختنہ اور طہارت غیر قانونی قرار دے دیئے گئے۔ جو شخص اس فرمان کی خلاف ورزی کرتا اسے موت کی سزا دی جاتی۔ جو عورتیں اپنے بیٹوں کا ختنہ کرواتیں انہیں شہر کے گرد چکر لگانے کا حکم دیا جاتا اور ان کے بچوں کو شہر کی دیوار سے نیچے وادی میں پھینک دیا جاتا۔ ایک ماں کو اپنے سات بچے موت کے گھاٹ اترتے ہوئے دیکھنا پڑے۔ اپنے مذہبی جوش وخروش میں اس نے ہر بچے کو خوشی کے ساتھ موت کے حوالے کیا اور پھر خود پھانسی کے پھندے پر جھول گئی۔ ایک نوے سالہ بوڑھے ایلی زیر نے سور کا گوشت کھانے کی بجائے مرنے کو ترجیح دی۔ جب لوگوں نے توریت کے لیے مرنا شروع کر دیا تو یہ کتاب ان کے لیے تقدس کے ایک نئے روپ میں ڈھل گئی۔

انطیوکس کے فرمان کے نتیجہ میں معبد کو بھی تختہ مشق بنایا گیا۔ وہ دروازے اور دیواریں مسمار کر دی گئیں جو مقدس مقام کو بقیہ شہر سے الگ کرتی تھیں۔ توریت کی ممانعت کی قصداً خلاف ورزی کرتے ہوئے مقدس مقام پہ درخت لگا کر اسے یونانی طرز کا مقدس کنج بنا دیا گیا۔ معبد کی دیگر عمارتیں جنہیں دو سال پہلے انطیوکس کے سپاہیوں نے لوٹ مار کا نشانہ بنا

یا تھا، مسلسل خالی اور ویران پڑی تھیں۔ 25 کسلیف (دسمبر) 167 ق م کو قدامت پرست یہودی یہ سن کر دہشت زدہ ہوگئے کہ معبد میں قربان گاہ کے مقام پر ایک پتھر ایستادہ کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے پتھر ''بت پرست کافر'' اپنے مقدس مقامات کی نشاندہی کے لیے نصب کیا کرتے تھے۔ اب کھلی قربان گاہ اور درختوں کے جھنڈ اسے قدیم ''باماہ'' بنا رہے تھے۔ اس طرح کے معبد اب بھی ممرے اور کوہ کارمل پر پائے جاتے تھے لیکن یہودی انہیں غیر شرعی عبادت گاہیں قرار دیتے تھے۔ یروشلم میں صیہون کے معبد کو اب یونانی دیوتا زیوس اولمپیس سے منسوب کر دیا گیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہودیوں کو یونانی دیوتا کی عبادت کے لیے بھی مجبور کیا جاتا تھا۔ اولمپیس مقدونیہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں یونانیوں کے اساطیر کے مطابق تمام دیوی دیوتا رہتے تھے۔ اس کا مطلب مجازاً عرش الٰہی یا بہشت بھی تھا۔ جنت کا دیوتا زیوس تھا اور یہ خطاب یہواہ جیسے کسی اعلیٰ و برتر معبود کے لیے استعمال ہوسکتا تھا۔

انطاکیہ نواز یہودی سمجھ رہے تھے کہ اس طرح وہ (حضرت) ابراہیمؑ کے سادہ ترین مذہب کی طرف پلٹ رہے ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی توریت کی پیچیدگیاں آنے سے پہلے موجود تھا اور ممرے اور کوہ کارمل پر موجود معبدوں میں خدا کی عبادت کا ذریعہ تھا۔(10) ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے کہ دیگر توحید پرستوں نے بھی یروشلم میں اسی ابتدائی مذہب کو بحال کرنے کے منصوبے بنائے۔ اپنے آسمانی خدا کی عبادت کرتے ہوئے وہ چاہتے تھے کہ ایسی مذہبی رسوم تخلیق کریں جو عقل و شعور پر مبنی ہوں اور خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والے تمام انسانوں کو اپنی طرف راغب کرسکیں۔۔۔ جن میں عکرہ کے یونانی اور انطاکیہ نواز یہودی سبھی شامل ہوں۔ یہ پروگرام اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلاسفروں کے اس پروگرام سے مختلف نہیں تھا جو یورپ میں ذہنی بیداری کے لیے مرتب کیا گیا تھا لیکن یہ تصورات یہودیوں کی اکثریت کے لیے ناقابل قبول تھے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہودیت میں ایک الہامی خدا پرستی داخل ہوئی جس کا مطمح نظر انجام کار راست بازی کی حتمی فتح تھا۔ بعد میں دنیا کے تینوں توحید پرست مذاہب کی روایات میں اسی قسم کا عقیدہ ابھرا جو انطیوکس اپی فینس کے دور میں یروشلم میں نمودار ہوا تھا لیکن اس وقت یونانیوں کے سیکولر نظام جیسی عقلیت پسندی کو اپنانے کی بجائے الہامی مصنفین نے قدیم دیو مالائی اقدار پر زور دیا۔ جب کاہن مایوس دکھائی دیتے تھے تب بہت سے یہودی ایک کامیاب مستقبل کے تصور سے بہت مطمئن تھے۔ نئی ''الہامی پیشین گوئیوں'' کو مستند بنانے کے لیے انہیں ماضی کے روحانی بزرگوں سے منسوب کر دیا گیا جن میں پیغمبر دانیال اور حنوخ (ادریس) شامل تھے جنہیں ان کی زندگی کے اختتام پر آسمانوں پہ اٹھا لیا گیا۔

آخری دنوں کا منظر جس طرح یہ لوگ پیش کرتے تھے وہ سب کے ہاں ایک جیسا ہی تھا۔ مثلاً خدا بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو مختلف جگہوں سے لا کر ایک جگہ اکٹھا کرے گا اور یہ مقام یروشلم ہوگا۔ پھر وہ ایک خوفناک جنگ میں ان کی قیادت کرے گا۔ تخلیق کائنات کے وقت سے جاری برائی اور شیطنت کے خلاف جدوجہد اس جنگ کی صورت میں مکمل ہوگی۔ بنی اسرائیل اپنے تمام دشمنوں کو نابود کر دیں گے۔ ان دشمنوں نے انتشار اور تباہی کے عفریتوں کو اپنا معبود بنا رکھا

ہے۔ چنانچہ کامیاب جنگ کے بعد دنیا جنت بن جائے گی۔ البتہ کچھ یہودی کہتے تھے کہ مذکوری جنگ کے بعد تمام کافر دنیا یہواہ کا دین اپنا لے گی۔ نجات کا حتمی مرحلہ سب کی نظر میں یروشلم میں طے ہونا تھا۔ اب چونکہ مقدس کوہ صیہون کو کافروں اور مرتد یہودیوں نے ناپاک کر دیا تھا چنانچہ دانیال، ادریس اور مراجعت کی کتابوں کے مصنفین کے اس تصوراتی مستقبل کا انحصار تھا جس میں شہر کو پاک کیا جائے گا اور خدا ایک نیا معبد تعمیر کرے گا۔ تب کوئی مقامی بادشاہ یونانی سلطنت میں موجود نہیں ہوگا، تب یہودی مسیحا آئے گا اور انہیں آخری فتح سے ہمکنار کرے گا۔ یہ مفروضے یا تصورات ایک ایسے وقت میں کئے جا رہے تھے جب یہودیت پوری طرح خطرات میں گھری ہوئی تھی چنانچہ مخالفین کے نزدیک اس طرح کے دعوے اشتعال انگیزی تھی۔ دراصل یہ باتیں مایوس کن حالات میں یہودیوں کا ایمان متزلزل ہونے سے بچانے کے لیے تھیں۔ الہامی پیشین گوئیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں بہت سی مذہبی تحریکوں کو جنم دیا اور کئی سنجیدہ قسم کے یہودی دانشمندوں مثلاً بن سراح اور انقلابیوں کو متاثر کیا۔ مستقبل کے تصورات میں صرف یہودی ہی مگن نہیں تھے بلکہ یونانی بھی مصری پروہتوں کے صوفیانہ دعوؤں سے متاثر تھے۔ اس طرح کی ب تیں ہندوستان کے برہمن اور ایران کے مجوسی بھی کر رہے تھے۔ ان باتوں نے مشرق قریب کے محکوم عوام کو ایک حوصلہ اور خود پسندی مہیا کر رکھے تھے۔ یونانی یقیناً بہت عیار تھے۔ ان کی گفتگو محض تکبر اور رعونت تھی۔ وہ کھوکھلے تصورات تراشنے میں ماہر اور دلائل وضع کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے انداز میں مستقبل پہ گرفت کا تصور بنا رکھا تھا لیکن حقیقت میں یونانی فلسفہ محض لفظوں کی گھن گرج تھی۔ ان کی مقامی روایات کے یہ دعوے برخود غلط فاتحین کو آپے سے باہر ہونے سے بچانے کے لیے تھے۔ (11)

اس طرح کے خواب دیکھنے والوں میں سے کچھ خود کو آسمان کی بلندیوں میں اڑتا ہوا دیکھتے تھے۔ کسی معبد میں خدا کے رہنے کا تصور مشرق قریب کے کئی حصوں میں اب اپنی طاقت کھو رہا تھا۔ مصر اور ایران میں دوسری اور پہلی صدی قابل مسیح کے تخیل پرست اب ارضی دیوتاؤں کو ترک کر کے آسمانی خداؤں پر ایمان لا رہے تھے۔ یہ صوفیانہ سفر اپنے وقت کی سطحیت کا مظہر تھا۔

اب روحانیت کی جڑیں زمین میں نہیں تھیں۔ چنانچہ کوئی مخصوص مقام ماورائی قوت کا بسیرا نہیں تھا۔ کچھ لوگ۔۔۔ بوجوہ سب نہیں۔۔۔ ایک ایسی آزادی کے متلاشی تھے جو اس دنیا میں نہیں پائی جاتی تھی اور ایک مختلف قسم کا روحانی اظہار تھی۔ یہودی صوفیا نے بھی یہ تصوراتی پروازیں شروع کر دی تھیں۔ لفظ الہام یا کشف کا مطلب تھا بے نقاب ہونا یا ظاہر ہونا۔ پیغمبروں کی طرح یہ تخیّل پرست دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے وہ کچھ دیکھا ہے جو خانہ اقدس کے پردے کے پیچھے ہے۔ عاموس، یسیعاہ اور حزقی ایل کی طرح ان کی رویت خدا یروشلم کے مذہبی عقائد کا بھرپور عکس تھی۔ خانہ اقدس میں ایک زمانہ میں تابوت یہواہ یعنی عہد نامے کا صندوق رکھا گیا تھا جو زمین پر خدا کا تخت تھا۔ اب دوسری صدی قبل مسیح میں تخیّل پرست آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ جو خدا کا ازلی و ابدی محل تھا اور جس میں وہ اپنے ملکوتی تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ان ابتدائی خوابوں

میں سے ایک کا ذکر ''ادریس کی پہلی کتاب'' (150 قبل مسیح) میں موجود ہے۔ اس نے رویا دیکھنے کے لیے یروشلم کے معبد میں جانے کی بجائے تصور کیا کہ '' وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ ہوائیں اسے اٹھا کر جنت میں خدا کے مرمریں محل میں لے گئیں جس کے اردگرد آگ کے شعلے اور فرشتے نگہبانی کر رہے تھے۔'' یہ تخیّل کی انوکھی پروازیں نہیں تھیں۔ بعد میں یہودی صوفیا اپنے آپ کو اس طرح کے روحانی سفر کے لیے باقاعدہ تربیت کے تحت تیار کیا کرتے تھے۔ یہ تربیت یوگا کی ورزشوں جیسی ہوا کرتی تھی۔ یہ ورزشیں وقت کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں پھیل گئیں۔ یہودی صوفیا اس تربیت کے لیے روزہ رکھتے۔ اپنا سر دونوں زانوؤں کے درمیان رکھ کر دھیمی آواز میں خدا کی حمد وثنا کرتے۔ یہ انداز یوگیوں کے منترا لاپنے جیسا ہوتا تھا۔ ان مذہبی ورزشوں کے نتیجہ میں صوفی اپنے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا تھا اور یہ عمل خدا کے محل (کے سات درجوں) میں جھانکنے کے مترادف تھا۔ صوفی اپنی آنکھوں سے محل مے ساتوں درجے دیکھ لیتا تھا۔(12) حقیقی استخراق یا گیان دھیان کی طرح یہ ''داخلی معراج'' ہوتا تھا۔

اگرچہ تخیّل پرست محسوس کرتا تھا کہ وہ خدا کے نقلی زمینی محل سے پہلوتہی کر سکتا ہے لیکن یہ محل (معبد) ابھی تک اس انداز پہ غالب تھا جس میں تخیّل پرست خدا سے رابطہ کرتا تھا۔ یہ بات ثابت کرتی تھی کہ معبد کی عمارت لوگوں کے نزدیک ایک روحانی حقیقت رہ چکی ہے۔ اس نے ان کی داخلی دنیا کی تجسیم کی تھی اور اپنی بربادی کے بعد بھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں کی یہ ضرورت پوری کرتا رہا تھا۔ جس طرح عبادت گزار یروشلم میں تقدس کے مختلف درجوں سے گزر کر خدا سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اسی طرح حضرت ادریسؑ کو خدا سے رابطہ کے لیے آسمانی محل کے مختلف درجوں سے احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ سب سے پہلے انہیں اس نجس اور ناپاک دنیا کو چھوڑنا تھا اور پھر مقدس کرہ میں داخل ہونا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یروشلم کے زائرین کو معبد کے صحن میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ بہت سی ذی روحوں کو وہاں رک جانا پڑتا تھا لیکن حضرت ادریسؑ اپنے آپ کو روحانی کاہن اعلیٰ سمجھتے تھے۔ پہلے انہیں ایک ایسے گھر میں لے جایا گیا جو ہیکل کی مانند تھا۔ اس میں فرشتے جمع تھے۔ پھر ان کو ایک اگلے بالاتر درجے کے محل میں لے جایا گیا جو تقدیس کے لحاظ سے دیور (خانہ اقدس) کے مساوی تھا وہاں انہوں نے تخت اور اس پر موجود عظیم جلال کو جلوہ افروز دیکھا۔ جس کے اردگرد نور لہروں کی طرح بل کھا رہا تھا۔(13) یہاں (حضرت) ادریس کو خدا نے اپنے لوگوں
کے لیے ایک پیغام دیا اور پھر جس طرح یوم کفارہ کو کاہن اعظم خانہ اقدس سے لوٹ کر آتا تھا اسی طرح (حضرت) ادریس خدا کی مسند گاہ سے واپس آئے تاکہ خدا کی تقدیس یہودی پیروکاروں تک پہنچائیں۔ اس قسم کا مکاشفہ اور تصور یہودی صوفیا میں قرون وسطیٰ تک جاری رہا اور پھر قبالاہ کی باطنی تعلیم کی ریاضت میں تحلیل ہو گیا۔

کچھ یہودیوں نے یونانیوں کا مقابلہ ان ہی خوابوں اور مکاشفہ سے کیا جبکہ بقیہ یہودیوں نے تلوار کا سہارا لیا۔ جب سلوکسی سپاہی اپنی رہائش عکرہ میں لے گئے اور معبد کو پامال کر دیا گیا تو راسخ العقیدہ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد نے محسوس کیا کہ اب وہ

یروشلم میں مزید قیام نہیں کر سکتے۔ اب ان کا یہاں رہائش اختیار کیے رکھنا بے معنی ہے۔ چنانچہ یہودی وہاں سے ہجرت کرنے لگے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں حسمونی خاندان بھی شامل تھا۔ یہ خاندان معمر کاہن متھاتھیاس اور اس کے پانچ بیٹوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے پہلے تو مدائن کے گاؤں میں تحکانہ بنایا لیکن جب شاہی حکام آسمانی خدا کے نئے عقلیت پسند مذہب کے قیام کے لیے وہاں پہنچے تو متھاتھیاس اور اس کے بیٹے پہاڑوں میں جا چھپے۔ ان کی تقلید میں کئی اور پارسا یہودی اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں چلے آئے۔ اب وہ وہاں جانوروں کی طرح رہ رہے تھے۔(14) انہوں نے دشمنوں سے بچنے کے لیے جنگلی جڑی بوٹیوں اور گھاس پھونس کو خوراک بنالیا تا کہ باہر کی دنیا سے رابطہ کی ضرورت نہ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو انہوں نے ان یہودیوں کے خلاف تصادم کی راہ اپنالی جو انطیوکس کے احکامات پر سر تسلیم خم کر گئے تھے۔ انہوں نے یونانیوں کی نئی قربان گاہیں مسمار کرنا شروع کر دیں اور زبردستی لڑکوں کے ختنے کرنے لگے۔ جب متھاتھیاس 166 ق م میں مرا تو اس کے بیٹے یہودا نے اپنے باپ کی تحریک کی قیادت سنبھال لی۔ یہودا کا لقب میقابیس (ہتھوڑے کے نر والا) تھا۔ اس نے یونانی اور شامی سپاہیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ان دنوں سیلوکسی، میسوپوٹیمیا میں الجھے ہوئے تھے۔ وہاں پارتھی انہیں علاقے سے باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ یہودا کو غیر متوقع طور پر جلد ہی کامیابی حاصل ہوگئی۔ (15)164

ق م میں انطیوکس کو اپنا بدنام زمانہ فرمان واپس لینا پڑا۔ یہودا نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ تاہم وہ عکرہ سے یونانیوں اور یونان نواز یہودیوں کو نہ نکال سکا۔

جب یہودا میقابیس اور اس کے ساتھیوں نے کوہ صیہون پر معبد کے جلے ہوئے دروازے اور مقدس کنج دیکھے تو وہ صدمے سے نڈھال ہوگئے۔ انہوں نے سوگ منانے کے لیے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور خاک بہ سر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے معبد کی عمارتوں کو پاک صاف کیا۔ شمعیں روشن کیں اور ہیکل کو مزین کیا۔ ماہ کسلیف کی 25 تاریخ کو جب ٹھیک اسی روز تین سال پہلے سیلوکسی سپاہیوں نے مقدس مقام کی بے حرمتی کی تھی، تقدیس کی رسم سرانجام دی گئی۔(16) عبادت گزار جلوس کی شکل میں کھجور اور زیتون کی ڈالیاں اٹھائے ہوئے معبد کے صحن میں داخل ہوئے۔ آخر میں اعلان کیا گیا کہ اب ہر سال تمام یہودی تقدیس کا تہوار منایا کریں گے۔

میقابیوں کی بغاوت اس لیے کامیاب ہوئی تھی کہ سیلوکسی صفوں میں انتشار پھیلا ہوا تھا اور سبھی سردار اقتدار کی جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔ اقتدار کے دعویداروں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر کے یہودا اور اس کے جانشین استحکام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ 161 ق م میں یہودا میقابیس نے روم کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ اس اتحاد نے بلا شبہ یہودا کے ہاتھ مضبوط کئے۔(16) بالآخر 152 ق م میں حسمونی تحریک کو سیلوکسی حکام نے تسلیم کر لیا۔ سیلوکسی سلطنت کے ایک دعویدار نے یہودا کے بھائی اور جانشین، جوناتھن کو علاقے کا گورنر مقرر کر دیا۔ دوسرے سیلوکسی حریف نے جوناتھن

کو کاہن اعظم بنانے کا اعلان کر دیا۔ 152 ق م میں سکوتھ کے تہوار کے موقعہ پر جوناتھن نے پہلی مرتبہ مقدس پوشاک پہنی۔لوگ اس حیران کن انحراف پر دم بخود رہ گئے۔(18) قبل ازیں زرق برق چوغے یروشلم کے کاہن استعمال نہیں کیا کرتے تھے وہ سوتی، سادہ اور مختصر لباس پہنتے تھے۔لیکن جوناتھن اپنی من مانیاں کرتا رہا۔ 143 ق م میں سلوکسی تخت کے ایک نئے دعویدار نے جوناتھن کو اغوا کر کے قتل کر دیا۔ جوناتھن کا بھائی شمعون حسمونی وراثت کا جائز دعویدار تھا چنانچہ اس نے خود کو نئے سلوکسی بادشاہ سیمیطرس دوم کے توسط سے علاقے کا خود مختار حاکم بنوالیا۔اب یہودیہ، یونانی سلطنت سے آزاد ہو گئی اور ان صدیوں میں پہلی مرتبہ یہودیہ کے لوگ کافروں کے سایہ سے باہر نکل آئے۔ اگلے برس عکرہ میں موجود یونانیوں اور انطا کیہ نواز یہودیوں نے شموعون کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔شہر پناہ کو زمین بوس کر دیا گیا ۔ مورخ جوزیفس کے مطابق اس کام میں تین سال لگے۔اس کی تسخیر کی سالگرہ قومی تہوار کے طور پر منعقد کی گئی۔(19)

حسمونی انقلاب ایک عوامی بغاوت کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ بغاوت سامراجی طاقت اور یونانی ثقافت کے خلاف عوامی جذبات کا اظہار تھی لیکن شمعون اور اس کے جانشینوں کی قیادت میں معرض وجود میں آنے والی ریاست کے خدو خال وہی تھے جن کے خلاف بغاوت منظّم ہوئی تھی۔ جب مینیلاس نے کاہن اعظم کا منصب حاصل کیا تھا تو لوگوں نے اسے اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ صدوق کاہن اعظم کی اولاد میں سے نہیں تھا۔اب حسمونی حکمران کاہن اعظم بن رہے تھے۔ یہ اگرچہ کاہن خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن صدوق کی اولاد نہ تھے۔ان یہودیوں کے اقتدار اور کافروں کے اقتدار میں فرق بھی بہت کم تھا۔البتہ اس بات کو ترجیح دی جاسکتی تھی کہ حسمونی اچھے سپاہی اور چالاک سفارت کار تھے اور پھر یہ کافر نہیں تھے۔شمعون کو اس کے اپنے بیٹوں نے قتل کر دیا لیکن صدیوں کی ذلت اور تاریکی کے بعد زیادہ تر یہودی مطمئن اور حسمونیوں کی کامیابیوں پر نازاں تھے۔ جب شمعون کے بیٹے جان ہرکانس (104-134 ق م) نے مضافات کے علاقے فتح کرنا شروع کئے تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ بادشاہ داؤد کا پرشکوہ دور واپس آ رہا ہے لیکن 125 ق م کے قریب سلوکسی اپنے داخلی انتشار اور پارتھیوں کے ساتھ آئے دن کی لڑائیوں سے اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ ہرکانس کو سامریہ پر قبضہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ سیکم کے قریب کوہ گرزیم پر یہواہ کے لیے بنایا گیا معبد مسمار کیا۔ ہرکانس نے اپنی سرحدیں ادوم تک پھیلا دیں اور وہاں کے باشندوں کو یہودیت قبول کرنے اور لڑکوں کے ختنے کرانے پر مجبور کیا۔جس طرح متعدد انقلابوں میں ہوتا ہے یہاں بھی ہوا اور بغاوت کر کے اقتدار میں آنے والوں کا طرز عمل سابقہ حکمرانوں جیسا ہو گیا۔سلوکسیوں کی طرح حسمونی بھی سامراجی انداز میں اپنے محکوموں کے مذہب کو جبر کے ساتھ ختم کرنے پر اتر آئے۔

یہودیہ کی ریاست بھی بدقسمتی سے یونانی ریاست میں تبدیل ہونے لگی۔ ہرکانس کے دور میں یروشلم کو معبد کے پہاڑ سے آگے مغربی پہاڑی تک وسیع کر دیا گیا۔ یہ حصہ دولت منداشرافیہ اور کاہن خاندانوں کا مسکن بن گیا جوزیریں علاقہ

کے پرانے غریب باشندوں کے برعکس پرتعیش زندگی گزار رہے تھے۔شہر کا مغربی علاقہ ایک یونانی شہر بنتا چلا گیا۔حسمونی دور کے آثار بہت کم دریافت ہوئے ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہاں ایک اگورا (متمول بازار) موجود تھا جو مغربی پہاڑی کے اردگرد تعمیر کیا گیا تھا۔حسمونیوں نے جیسن کا جمنیزیم بند کر دیا۔لیکن شہر کے مغربی حصہ میں ''زسٹاس'' موجود رہا۔ یہ ایک چوگوشہ میدان تھا جس کو یونانی شہری ریاست کی روایت کے مطابق اتھلیٹک مقابلوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔لیکن یروشلم میں اس کا مصرف عوامی اجتماعات تھا۔ حسمونی

عمارتوں کی باقیات میں سے ایک وادی قدرون میں بن حاضر کا ہن خاندان کا مقبرہ موجود ہے جو یونانی اور مقامی طرز تعمیر کا ایک دلچسپ امتزاج تھا۔مغربی پہاڑی کی مشرقی ڈھلوان پر حسمونیوں نے اپنے لیے ایک شاندار محل تعمیر کیا۔(20) وادی الوعد پر ایک پل بنا کر محل اور معبد کو آپس میں مربوط کر دیا گیا۔

شہر کے یونانی خدوخال کے باوجود معبد اب تک روحانی، سیاسی اور طبعی طور پر غالب حیثیت رکھتا تھا۔مصر کے یونانی حکمران بادشاہ بطلیموس دوم کے دور کا ایک مورخ یروشلم کے معبد سے بہت متاثر تھا۔آرستیاس نامی یہ مورخ لکھتا ہے کہ معبد کوہ صیہون کی چوٹی پر ایستادہ ہے۔

MAP (نقشہ)

اس کے نیچے گھر اور گلیاں اس طرح بے ترتیبی سے بنی ہوئی نظر آتی ہیں جس طرح بیضوی تھیٹر میں نشستیں۔ہیکل کے مدخل پر کھنچے ہوئے بڑے بڑے پردوں کے منظر نے اسے بہت مسحور کیا۔''یہ مدخل ہر طرح سے ایک دروازے کی مشابہت رکھتا ہے لیکن جب ان پردوں کے نیچے سے ہوا گزرتی ہے تو یہ چوٹی تک اس طرح سرسراتے ہوئے ملتے ہیں کہ منظر بیان نہیں کیا جا سکتا۔''(21) آرستیاس نے معبد کے ملحقات کی پگڈنڈیوں کے نیچے پانی کے نظام کی بھی بہت تعریف کی ہے۔جس کے ذریعے قربانی کے جانوروں کا خون صاف کیا جاتا ہے۔اس نے زمین کے ساتھ کان لگا کر نیچے بہتے ہوئے پانی کی آواز سنی اور بہت حیران ہوا۔کاہنوں کے برتاؤ اور مہارت سے آرستیاس بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔وہ مسلسل اور انتھک محنت کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا جانور قربان کرتے ہیں لیکن بے زاری یا عدم توجہی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔انہیں یقیناً بہت زیادہ جسمانی طاقت کی ضرورت رہتی تھی (22) کیونکہ انہیں ذبیحوں کے بھاری بھرکم جسم ایک ہاتھ سے اٹھا کر کافی دیر تک ہوا میں معلق رکھنا پڑتے تھے۔پھر ذبیحوں کے ٹکڑے کرنا ہوتے تھے۔ان کا زیادہ تر کام

ناخوشگوار ہوتا تھا۔پورا کام انتہائی خاموشی سے سرانجام دیا جاتا۔معبد کے صحنوں میں بھی سکوت طاری رہتا تھا، خاموشی اتنی

گہری ہوتی تھی کہ لگتا تھا معبد میں کوئی ذی روح موجود نہیں۔ آرستیاس لکھتا ہے کہ اگر چہ کاہنوں کی تعداد سات سو کے قریب تھی اور قربانی کے جانور لانے والے بھی بہت زیادہ ہوتے تھے لیکن سب کام انتہائی وقار، احترام اور خاموشی سے کیئے جاتے تھے۔(23)

لیکن یہودیہ کے سبھی یہودی اس توصیف میں شامل نہیں تھے۔ اگر چہ وہ سب جذباتی طور پر معبد سے وابستہ تھے لیکن ان کی ایک بڑی تعداد محسوس کرتی تھی کہ حسمونیوں نے یک جہتی کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان تکلیف دہ برسوں میں

یہودیہ میں تین فرقے ابھر آئے۔ وہ اگر چہ مجموعی آبادی کا انتہائی معمولی تناسب تھے لیکن زبردست اثرات کے حامل تھے۔ ان کے باغیانہ خیالات کے مطابق مستقبل میں یہودیہ کے یہودیوں کے لیے یہ بات تقریباً ناممکن ہوگئی کہ اپنے خارجی دشمن کے مقابلے میں متحد رہ سکیں۔ لیکن ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ ایک معاملہ ایسا تھا جو انہیں فوراً متحد کر سکتا تھا اور یہ معبد کے تقدس کو درپیش کوئی بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ صدوقی حسمونیوں کے حامی تھے۔ یہ فرقہ قیامت میں روحوں کے وجود اور سنت قدیمہ کی پابندی کا قائل نہیں تھا۔ صدوقی مغربی پہاڑی پر واقع بالائی شہر میں رہنے والے دولت منداور کاہن طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قدیم صدوق کاہن کی اولاد نہیں تھے بلکہ یونانی اثرات سے مخلوب تھے اور کافر پڑوسی ریاستوں سے اچھے تعلقات کے خواہش مند تھے۔ البتہ وہ اپنی قوم کی قدیم شناخت یعنی بادشاہ، معبد اور مذہب کی رسوم سے بھی وابستہ رہنا چاہتے تھے۔ مشرق قریب میں اس وقت کی قومی تحریکوں کی طرح یہودیت بھی قدامت پسندی کا میلان رکھتی تھی۔ تصوراتی ماضی سے پیوستگی نئے یونانی جوش وخروش کو اپنی روایت کے ساتھ منتھی کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ صدوقی تحریری توریت میں کسی طرح کاردوبدل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حسمونی بادشاہ داؤد جیسے ہیں جس نے مذہبی پیشوائیت اور بادشاہت کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے یہودی حسمونیوں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ انہوں نے بیابانوں کی طرف نئے خروج کے لیے خود کو یہودی سماج سے نکال لیا تھا۔ ان کا قائد

''راستبازی کا استاذ'' کہلاتا تھا۔ ممکن ہے یہ وہی کاہن اعظم ہو جسے جوناتھن کے تقرر کے وقت منصب سے معزول کر دیا گیا تھا۔ یہ اعلیٰ منصب صرف صدوق کاہن اعظم کی اولاد کا حق تھا، چنانچہ جوناتھن کے تقرر نے معبد کی تقدیس کو مجروح کر دیا تھا۔ مزکورہ فرقے کے کچھ پیروکاروں کو صوفیا کہا جاتا تھا، یک نسلی معاشرے کی صورت میں یہ لوگ بحر مردار کے قریب قمران میں رہتے تھے۔

اسی فرقہ کے بقیہ لوگ کم انتہا پسند تھے۔ یہ لوگ یہودیہ کے شہروں اور قصبوں میں رہتے تھے اور معبد میں عبادت بھی کرتے تھے لیکن انکا ایمان تھا کہ اسے بری طرح ناپاک کر دیا گیا ہے۔ صوفیا مکاشفہ کے تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ ایک دن حتمی نجات کا دور شروع ہوگا اور پھر خدا مقدس شہر کو نئے سرے سے پاک صاف کر کے ان کے

لیے نیا معبد تعمیر کرے گا۔ جان ہر کانس کے دور میں اس فرقے کو خوب فروغ ملا اور ان کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی۔ یروشلم میں بھی ''صوفیا برادری'' نشو ونما پانے لگی۔

تیسرا گروہ فریسیوں کا تھا جو سب سے زیادہ با اثر تھا۔ یہ لوگ توریت کے احکام پر سختی سے عمل کرنے کے قائل تھے۔ ان کا موقف تھا کہ حسمونی حکمرانوں کو کاہن اعظم کا منصب اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان برے یہودیوں کی بجائے غیر ملکی حکمرانوں کے اقتدار میں لوگ زیادہ خوشحال رہتے تھے۔ فریسی فرقہ ہی غالباً اس بغاوت کے پس پردہ تھا جو یروشلم میں جان ہر کانس کے ابتدائی دور میں پھوٹ پڑی تھی لیکن اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا تھا۔ (24) انہوں نے ہر کانس کے بیٹے سکندر جنایوس (76-105 ق م) کے اقتدار کی بھی مخالفت کی تھی۔ سکوتھ کے تہوار کے ایک موقعہ پر معبد میں بادشاہ پر حملہ کیا گیا۔ اس حملے میں بھی غالباً یہ لوگ شامل تھے۔ جلوس میں اپنے ساتھ لائے گئے ترش پھلوں کی انہوں نے بادشاہ پر بوچھاڑ کر دی۔ اس واقعہ کے فوراً بعد سکندر نے انتقامی کاروائی میں چھ ہزار افراد کو قتل کرا دیا۔ (25) اس نے یروشلم میں آٹھ سو باغیوں کو مصلوب اور ان کے سامنے ان کی بیویوں اور بچوں کو بے رحمی سے ذبح کروایا۔ باغی صلیبوں پر لٹکے ہوئے تھے، ان کے بیوی بچوں کو ذبح کیا جا رہا تھا اور سکندر وہاں ایک چبوترے پر اپنی داشتاؤں کے جلو میں مے نوشی میں مصروف تھا۔ (26) اس خوفناک واقعہ نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ اپنی بادشاہت جس سے انہوں نے حیات بخش امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں یونانی طرز کے استبداد کے سوا کچھ نہیں۔

سکندر جنایوس نے نئے علاقوں کو تسخیر کرنے کا عمل جاری رکھا اور دریائے اردن کے دونوں طرف ایک وسیع سلطنت کا حکمران بن گیا۔ جب اس نے نئے علاقے فتح کئے تو غیر یہودی باشندوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ یہودیت کو قبول کر لیں۔ جن لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ سکندر کو علم تھا کہ اس کا اقتدار ہمہ گیر مقبولیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ بستر مرگ پر اس نے اپنی بیوی سلومی کو وصیت کی کہ حکومت فریسیوں کو دے دی جائے۔ وہ ان کے اثرات سے آگاہ تھا اور سمجھتا تھا کہ فریسی ہی اس کی جانشین یعنی اس کی بیوی کو قوم کی پشت پناہی دلا سکتے ہیں۔ (27) سلومی۔ ایسا ہی کیا لیکن یہ اقدام حسمونی خاندان کے اقتداز کو نہ بچا سکا۔ سلومی کی موت (67 ق م) کے بعد اس کے دونوں بیٹے ہر کانس دوم اور آرسیتو بولس دوم بادشاہت اور کاہن اعظم کے مناسب کے لیے مختلف بیرونی طاقتوں کی مدد سے خون ریز خانہ جنگی میں الجھ گئے۔ ان کے بیرونی حلیفوں میں سب سے اہم ادومیہ کا اینٹی پیٹر تھا جو سکندر جنایوس کے زمانے میں علاقے کا گورنر رہ چکا تھا اور اب ہر کانس دوم کا حامی تھا۔ ہر کانس اور آریستو بولس دونوں نے رومن جرنیل پومپئی سے مدد کی درخواست کی۔ پومپئی 64 ق م میں انطاکیہ میں داخل ہوا۔

MAP (نقشہ)

اس نے آخری سیلوکسی بادشاہ کومعزول کر کے انطاکیہ کورومن سلطنت میں شامل کرلیا۔ فریسیوں نے بھی ایک وفد پومپئی کے پاس بھجوایا اور درخواست کی کہ ان کے ملک سے بھی بادشاہت ختم کر دی جائے کیونکہ یہ ان کی مذہبی تعلیمات کے منافی ہے۔

MAP (نقشہ)

نئے یہودی سال کے موقعہ پر ایک ربی دیوار گریہ کے سائے میں ناقوس بجا رہا ہے۔
قدیم معبد کی یہ رسم اب نجات کا دور لانے کے لئے ادا کی جاتی ہے۔

یروشلم متحارب گروہوں کا میدان جنگ بن گیا۔ آریستوبولس اور اس کے
حامیوں نے خود کو معبد میں جمع کر کے ناکہ بندی کر دی۔ انہوں نے وادی الوعد کے اوپر بنے پل کو جلا دیا۔ ہرکانس اور اینٹی پیٹر کے قبضہ میں بالائی شہر تھا۔ انہوں نے رومن فوج کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ رومی سپاہی حسمونی محل میں متعین کر دیئے گئے خود پومپئی نے معبد کے پہاڑ کے شمال میں اس جگہ اپنا خیمہ نصب کر دیا جو شہر کا سب سے غیر محفوظ مقام سمجھا جاتا تھا۔ آریستوبولس تین ماہ تک ڈٹا رہا۔ مورخ جوزیفس بتاتا ہے کہ رومن جرنیل معبد کے کاہنوں کی عقیدت پر انگشت بدنداں تھا جو معبد کے صحن میں برستے ہوئے پتھروں اور تیروں کی ذرہ برابر پروا کیئے بغیر قربانی کے جانور لے کر صحن میں سے گزرتے۔ کاہنوں نے اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے میں اس وقت بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جب رومن سپاہی تمام دفاعی رکاوٹیں توڑتے ہوئے ستمبر 63 ق م میں ہرکانس کے سپاہیوں کے ساتھ معبد کے صحن میں داخل ہو گئے۔(28) اس موقع پر شہر میں بارہ ہزار یہودیوں کا قتل عام کیا گیا۔ لیکن یہودی اس وقت ششدرہ گئے جب پومپئی معبد کی عمارتوں میں داخل ہوا اور پھر ہیکل میں سے گزرتا ہوا خانہ اقدس کی تاریکی کا مشاہدہ کرنے لاگا۔ پھر اس نے پلٹ کر اعلان کیا کہ معبد سے سپاہیوں اور غیر متعلقہ لوگوں کو فوراً نکال دیا جائے اور اس کی طہارت اور تقدیس کا انتظام کیا جائے۔ یہ اعلان غالباً لوگوں کو خوش کرنے کے لیے تھا۔ لیکن ملک پر رومنوں کا تسلط بھی عدم اطمینان کا سبب بنا۔ رومن اس ملک کو فلسطینیہ کہتے تھے۔ انہوں نے فلسطینیہ اور معبد کے تقدس کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ یہودی بے بسی کے ساتھ اپنے نئے آقاؤں کے ہاتھوں ایک بار پھر

معبد کی بے حرمتی دیکھنے پر مجبور تھے۔

============

حوالہ جات

==========

1. JOSEPHUS, Antiquities of the Jews 11:7.

2. IBID 12: 175-85

3۔ بن سیرا 50:5-12

4۔ بن سیرا 45:17

5۔ بن سیرا 45:17

6۔ بن سیرا 50:1-4

7۔ بن سیرا 13:20-27

8۔ بن سیرا تعارف۔ V. 12

9۔ کتاب دانیال میں ممنوعات سے متعلق استعمال کی گئی اصطلاحیں بعل اور شمیش دیوتاؤں کے حوالے سے رائج تھیں۔

10. HARTIN HENGEL, Judaism and Hellenism, Studies in their encounter in Palestien During the Early Hellenistic Period (London) 1974- pp. 294-300.

- BICKERMAN, From Ezra to the Last of The Maccabees (New York- 1962) pp.286-89.

- The Jews in Greek Age- pp. 294-96.

11. CORPUS HERMETICUM 16: 12.

LA Revelatio d'Hermes Trismegiste (Paris - 1954) 1: 26

12. HAI GAON (939- 1038)

- The Jewish Mystics (Jerusalem 1076, London 1990).

13۔ اینوخ 4

14۔ 1۔ میکابیز 5:27

15۔ 1۔ میکابیز 2:44-48

16۔ 1۔ میکابیز 4:36-61

17۔ 1۔ میکابیز 8:17-32

18۔ 1۔ میکابیز 10:17-21

19۔ 1۔ میکابیز 13:49-53

20۔ 1۔ جوزیفس 2:190

21. Historia de Legis Divinae (London- 1895, New York- 1971)

22. Ibid- p. 3.

23. Ibid- p.4

24۔ جوزیفس، دی جیوش وار 1:67-69

25۔ جوزیفس، اینسیلیٹیز 13:372

26۔ جوزیفس، اینسیلیٹیز 13:38 ، جیوش وار 1:97

27۔ جوزیفس، اینسیلیٹیز 13:401

28۔ جوزیفس، جیوش وار 1:148

29. LATINIZATION OF pHILISTIAN.

===============

ساتواں باب

تباہی

پومپئی نے اپنی فتح کے بعد شکست خوردہ حسمونی ریاست پر کڑی شرائط عائد کر دیں۔ یہودیوں کو یہودیہ، ادومیہ، بیرئ اور گلیلی پر حکومت کرنے کی اجازت دی گئی جبکہ سامریہ کے یہواہ پرستوں اور ساحلی علاقوں کے بت پرستوں کو اپنے علاقوں میں نیم خودمختاری دے دی گئی۔ اسی طرح یونانی شہروں (فونیشین ساحل کے شہروں) کو اپنے معاملات خودنمٹانے کے لیے کہہ دیا گیا۔ جن لوگوں کو یہودیت قبول نہ کرنے کی پاداش میں علاقہ بدر کر دیا گیا تھا انہیں اب واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ آریستوبولس کو زنجیروں میں جکڑ کر روم بھجوا دیا گا۔ رومیوں کے حلیفوں کو مناصب مل گئے۔ پومپئی نے اینٹی پیٹر کو فوج کا سربراہ بنانے کے ساتھ ساتھ یہودیہ کا حکمران بنایا لیکن اسے دمشق میں رومی لیگیٹ (گورنر) کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کا پابند بنا دیا گیا۔ ہرکانس دوم کو کاہن اعظم کا منصب ملا۔ اس تقرر سے وہ لوگ مطمئن ہو گئے جو ابھی تک حسمونی اقتدار کے حامی تھے۔ لکین اب یروشلم سیاسی اہمیت سے محروم ہو گیا۔ پومپئی نے اس کی دیواریں زمین بوس کر دیں۔ اب یہ محدود سے ذیلی صوبے کا دارالحکومت تھا۔ اور صوبہ گلیلی سے انتظامی طور پر کاٹ دیئے جانے والے اس علاقے میں شامل تھا جس میں سامریہ کے لوگ اور بت پرست رہتے تھے جنہیں اپنے یہودی پڑوسیوں سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

حسمونیوں نے ایک دفعہ پھر اپنی طاقت منظّم کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ آریستوبولس روم سے فرار ہو کر یروشلم پہنچ گیا اور اپنا اقتدار بحال کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا۔ اس نے شہر کی دیواروں کی تعمیر شروع کر دی۔ 57 قبل مسیح میں شام کے رومی لیکیٹ نے حسمونیوں کی بغاوت کچل دی۔ آریستوبولس اور اس کے بیٹے سکندر کو قید کر کے پھر روم پہنچا دیا گیا لیکن فلسطین رومیوں کے لیے عسکری ضرورت کے تحت بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی

یہودی رعیت کو غیر ضروری طور پر برہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آریستو بولس کے دوسرے بچوں کو فلسطین میں قیام کی اجازت دے دی گئی۔ ہر کانس مسلسل کاہن اعظم رہا اور حسمونیوں کو ملک میں اپنی نمایاں موجودگی برقرار رکھنے کی بھی اجازت رہی۔ البتہ اینٹی پیٹر کو اب بھی سب سے زیادہ قوت واختیار حاصل تھا۔ وہ ایک زیرک اور مکار حکمران تھا اور یہودی اس کا احترام کرتے تھے حالانکہ اس کا خاندان کچھ دیر پہلے یہودی ہوا تھا اور ادومی ہونے کی وجہ سے مختلف نسلی شناخت رکھتا تھا۔ اینٹی پیٹر اور اس کے بیٹے یہ بات کبھی نہ بھولے کہ انکا اقتدار رومیوں کا مرہون منت ہے چنانچہ وہ رومی سلطنت کی ہنگامہ خیز داخلی سیاست پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ 49 ق م میں جب جولیئس سیزر نے پومپئی کو شکست دی تو اینٹی پیٹر حالات کا رخ دیکھ کر بہت پہلے ہی جولیئس سیزر کی صفوں میں خود کو شامل کر چکا تھا۔ جولیئس سیزر نے اینٹی پیٹر کو اس کی وفاداری کا صلہ دیتے ہوئے یہودیہ کا حاکم مطلق (پریفیکٹ) بنا دیا اور یروشلم کی دیواریں دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ یافہ کی بندرگاہ اور یزریل کی وادی یہودیوں کو واپس دے دی گئی۔ اینٹی پیٹر کے دو بیٹوں کو ضلعی حاکم بنا دیا گیا۔ ایک بیٹے ہیرودیس کو گلیلی اور دوسرے بیٹے فازائیل کو یہودیہ کا ضلعی حاکم (ٹیٹرارکس) بنا کر اپنے باپ کے ماتحت کر دیا گیا۔ انہیں وراثت میں اپنے باپ کی سیاسی عیاری ملی تھی۔ خلفشار کے دنوں میں انہیں اس کی بہت ضرورت تھی۔ 15 مارچ 44 ق م کو روم میں جولیئس سیزر کو قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے پیچھے سینیٹروں کی سازش تھی اور سازش کے سرغنہ کارکوس بروٹس اور گائس کیشئس تھے۔ اسی برس اینٹی پیٹر کو ایک پرانے خاندانی دشمن نے قتل کر دیا۔ ہیرودیس اور فازائیل، کیشئس کے کلائینٹ بن گئے لیکن وہ روم میں بدلتے ہوئے حالات پر نظریں جمائے رہے۔ جب سیزر کے بھتیجے اور لے پالک بیٹے اوکٹاوین اور مارک انٹونی نے بروٹس اور کیشئس کے خلاف جنگ چھیڑی تو ہیرودیاس اور فازائیل اپنی وابستگی تبدیل کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ 42 ق م میں فلپی کی جنگ کے بعد بروٹس اور کیشئس کو شکست ہوگئی تو ہیرودیس اور فازائیل انٹونی کے وفاداروں کی فہرست میں نمایاں تھے۔ رومی سلطنت کے تمام مشرقی صوبے اب مارک انٹونی کے ماتحت تھے۔ روم امن وخوشحالی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا اور ہیرودیس اور فازائیل کو اس کی سرپرستی حاصل تھی۔

40 ق م میں رومنوں کے ہاتھوں سے فلسطین عارضی طور پر نکل گیا۔ میسوپوٹیمیا کے پارتھیوں نے ان کا دفاع توڑ کر کنعان کا علاقہ اپنی عملداری میں لے لیا۔ رومی کنعان کے علاقہ کو فلسطین کہا کرتے تھے۔ پارتھیوں نے ایک حسمونی شہزادے اینٹی گونس کو یروشلم میں اپنا کلائنٹ بنا دیا۔ قدیم رومن دولت مند شخص کے رذیل حاشیہ نشین کو کلائنٹ کہا کرتے تھے۔ بعد میں یہ لفظ سیاسی وانتظامی نمائندگی کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ یروشلم پر پارتھیوں کے قبضہ کے بعد فازائیل کو قیدی بنا لیا گیا۔ اس نے قید کے دوران خودکشی کر لی۔ لیکن ہیرودیس جنگ کے دوران فرار ہو کر روم پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں اس نے روم کی سینٹ کو قائل کر لیا کہ وہ ایک قابل یہودی ہے اور روم کی طرف سے فلسطین کو سنبھال سکتا ہے۔ روم کے سینٹروں نے ہیرودیس کو یہودیوں کے بادشاہ کا خطاب دے کر بھاری فوج کے ساتھ فلسطین واپس بھیجا۔ ہیرو

دیس نے 39 ق م میں انٹونی کی اعانت سے گلیلی فتح کر لیا۔ 37 ق م میں اس نے یروشلم کا محاصرہ کیا اور 4 ماہ کے بعد ایک خوفناک قتل عام کے ساتھ شہر پر قبضہ کر لیا۔ یروشلم کی تنگ گلیوں کے ساتھ ساتھ معبد کے صحن میں بھی ہزاروں یہودیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جہاں یہواہ کے حضور قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ اینٹی گونس،

حسمونی کو اینٹونی نے ہیرودیس کی درخواست پر پھانسی دے دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب رومنوں نے اپنے کسی ماتحت بادشاہ کے اشارے پر وسیع قتل و غارت گری کی۔

ہیرودیس کو یروشلم میں فلسطین کا یہودی بادشاہ بنانے کے بعد علاقے کے کلی اختیارات سونپ دیئے گئے۔ رومنوں کو اطمینان تھا کہ ہیرودیس حالات پر قابو پالے گا۔ چنانچہ رومی فوجیں واپس چلی گئیں۔ یروشلم کی خون ریز تسخیر کے باوجود ہیرودیس کے حامی یہودیوں میں موجود تھے۔ فریسی اب بھی حسمونیوں کے دشمن اور ہیرودیس کے حلیف تھے۔ ہیرودیس نے ایک سیاسی چال چلی اور حسمونی شہزادی ماریہ سے شادی کر لی۔ اب وہ حسمونی خاندان کے ہمدردوں کی نظر میں بھی یروشلم کا جائز حکمران بن گیا۔ 36 ق م میں اس نے ماریہ کے چھوٹے بھائی جوناتھن کو کاہن اعظم بنا دیا۔ لیکن یہ اقدام ایک سنگین غلطی ثابت ہوا۔ سکوتھ کے تہوار پر جب نوجوان حسمونی کو کاہن اعظم کا خصوصی لباس پہنایا گیا تو لوگ جذباتی ہو گئے اور روتے ہوئے گلیوں میں نکل آئے۔ انہوں نے جوناتھن کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ یہ ایک خطرناک علامت تھی۔ ہیرودیس نے جوناتھن کو قتل کرا دیا اور کاہن اعظم کے منصب پر اپنے ایک بااعتماد آدمی کو بٹھا دیا۔ اپنے اقتدار کے لیے خطرہ بننے والے ہر شخص کو ہیرودیس نے ہمیشہ سفاکی سے ختم کر دیا۔ لیکن مجموعی طور پر وہ ایک لائق اور خداداد صلاحیت رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے ایک ایسی ریاست میں امن و امان برقرار رکھا جو بنیادی طور پر غیر مستحکم تھی۔ اس کے اقتدار کے آخری دنوں کے علاوہ کبھی کوئی شورش برپا نہ ہوئی۔

کاہن اعظم کے منصب پر اپنی مرضی سے کسی کو فائز یا معزول کرنا اور کسی بغاوت کا جنم نہ لینا ہیرودیس کی طاقت کا مظہر تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ عہدہ طاقتور قسم کے اثرات مرتب کرتا تھا چنانچہ کاہن اعظم بننے والا فرد بعد میں ساری عمر اس منصب پر رہتا تھا۔ ہیرودیس کے دور میں یہ عہدہ سیاسی تقرر بن گیا۔ اس کے باوجود اس کی چمک دمک اور شان و شوکت ختم نہ ہوئی۔ کاہن اعظم کو محض سیاسی مہرہ سمجھا جاتا تھا۔ ہیرودیس نے مناسب سمجھا کہ اس مذہبی عہدیدار کی خلعت و پوشاک کو کم سے کم استعمال میں لایا جائے تاکہ یہ زرق برق لباس پہننے والا لوگوں کی نظروں میں زیادہ اہمیت نہ حاصل کر سکے چنانچہ اس لباس کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور صرف مذہبی تہواروں پر نکالا جاتا۔ کاہن جب یہ لباس پہنتا تو لوگوں کی نظر میں وہ آسمانی پیکر بن جاتا اور انسانوں کی طرف سے یہواہ سے رابطہ کرنے کی طاقت اسے میسر آجاتی۔ یروشلم میں اس لباس کی تحویل کا معاملہ سیاسی ترجیح بن گیا۔ صرف شنشاہ ہی کاہنوں کو مستقل طور پر اس لباس کی تحویل کی اجازت دے سکتا تھا۔ شہنشاہ یہ اجازت بہت سوچ سمجھ کر دیا کرتا تھا کیونکہ جو آدمی یہ لباس پہنتا اسے آسمانی قوتوں کا ارضی مظہر سمجھا جاتا تھا اور تخت کے

لئے ایک خطرہ ثابت ہوسکتا تھا۔

ہیرودیس اگرچہ اپنے انداز کا ایک راسخ العقیدہ یہودی تھا لیکن اس نے فلسطین کے اندر اور باہر دوسرے مذاہب کے لئے کسی تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کیا۔ حسمونیوں کے برعکس اس نے ملک کے کسی شہری کی مذہبی زندگی میں دخل نہ دیا۔ وہ حسمونیوں کی طرف سے لوگوں کو زبردستی یہودی بنانے کی پالیسی کو سیاسی حماقت قرار دیتا تھا۔ ہیرودیس نے رومی اور یونانی دیوتاؤں کے معبد نہ صرف اپنی سلطنت کے غیر یہودی علاقوں میں تعمیر کئے بلکہ اپنی سلطنت کے باہر بھی ایسے معبدوں کی تعمیر میں مدد دی۔ جب رومی شہنشاہ اوکٹاوین نے خود کو خدائی قوت قرار دینے کا اعلان کیا تو ہیرودیس پہلا شخص تھا جس نے سامریہ میں اس کے نام کا معبد تعمیر کیا ہیرودیس نے اسے سیباسٹ کا نام دیا جو رومیوں کے شہنشاہ کے نئے خطاب آکستس کے مساوی تھا۔ اوکٹاوین کے ہاتھوں مارک انٹونی کی شکست کے بعد ہیرودیس نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لی تھیں۔ 22 ق م میں ہیرودیس نے سٹر ٹیوز ٹاور کی قدیم بندرگاہ کے مقام پر آکستس (قیصر روم) کے احترام میں قیصریہ شہر کی تعمیر شروع کی۔ اس شہر میں رومن دیوتاؤں کے معبد بیضوی تھیٹر اور ایک بندرگاہ بنائے گئے۔ ہیرودیس کی طرف سے اپنی غیر یہودی رعایا کے لئے یہ ایک تحفہ تھا۔ انہی باتوں کی وجہ سے یہودیوں کا یہ بادشاہ غیر یہودی دنیا میں بھی احترام و وقار رکھتا تھا۔ اس کا آخری اعزاز یونانی اور رومن روایت کے تحت منعقدہ اولمپک کھیلوں کی ایک تقریب کی صدارت ہے۔

لیکن اس سب باتوں کے باوجود ہیرودیس بہت محتاط تھا اور یہودیوں کو نالاں کرنے سے گریزاں رہتا۔ چنانچہ اس نے یروشلم میں کبھی کوئی غیر یہودی معبد تعمیر کرنے کا خواب نہ دیکھا۔ خوبصورت عمارتوں کا شوق اس نے یروشلم میں پورا کیا اور مقدس شہر کو مشرق کا ایک اہم عروس البلاد بنا دیا۔ دفاعی پہلو ہمیشہ اس کے پیش نظر رہتا تھا چنانچہ شہر کے کمزور ترین مقام پر جہاں نحمیاہ نے شہر پناہ تعمیر کی تھی، ہیرودیس نے ایک بہت بڑے قلعے کی بنیادیں رکھیں۔ 35 ق م میں یہ منصوبہ شروع ہوا۔ چونکہ وہ ابھی تک انٹونی کا وفادار تھا چنانچہ اس نے قلعہ کا نام اپنے سرپرست کے نام کی نسبت سے انٹونیہ رکھا۔ یہ ایک ڈھلوانی چٹان پر بنایا گیا جس کی بلندی 75 فٹ تھی۔ تیز ڈھلوانوں پر رگڑے ہوئے پتھر نصب کئے گئے۔ رگڑائی نے انہیں اس طرح چکنا بنا دیا تھا کہ ان پر چڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ ایک دفاعی حکمت عملی تھی۔ چوکور قلعہ ان چکنی ڈھلوانوں سے ساٹھ فٹ اوپر تھا۔ قلعہ کے چاروں کونوں پر ایک ایک مینار ایستادہ تھا۔ عمارت کے اندر بہت بڑی فوج رکھنے کی گنجائش تھی۔ انٹونیہ ایک عسکری عمارت کے لوازمات رکھنے کے باوجود پرشکوہ محل تھا۔ اس کے اردگرد ایک گہری خندق کھودی گئی۔ یہ خندق قلعہ کو جنوب میں پھیلنے والے نئے شہر بے زیتا سے الگ کرتی تھی۔ یہاں اس نے پانی کا ایک دوہرا تالاب بنوایا جو شمعون عادل کے بنائے گئے تالاب بیت حصدا کے قریب آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ہیرودیس نے 23 ق م تک یروشلم کی شکل وصورت بدلنے کی کوئی سنجیدہ کوشش شروع نہ کی اس سے پہلے 25

اور 24 ق م میں فلسطین میں قحط پڑا تو اس نے لوگوں میں غلہ اور اشیائے خورونوش تقسیم کرنے کا فوری اور موثر انتظام کیا۔ اس اقدام سے لوگوں کے دل جیت لئے۔ اب وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرسکتا تھا۔ قحط سے تباہ حال بہت سے لوگ جن میں یروشلم کے شہری بھی شامل تھے، ہیرودیس کے تعمیراتی کاموں میں روزگار حاصل کرنیکے خواہش مند تھے۔ ان باتوں نے بادشاہ کا کام آسان کردیا۔ اس نے مغربی پہاڑی پر بالائی شہر میں اپنے لئے ایک محل کی تعمیر سے یہ کام شروع کیا۔ تین مینار بنا کر اس کی قلعہ بندی کردی گئی۔ ان تینوں میناروں کے نام اس نے اپنے بھائی فازائیل، بیوی ماریہ اور دوست ہپی کس کے ناموں پر رکھے۔ ان سب کی بنیادیں بہت ٹھوس اور تقریباً پندرہ میٹر اونچی
تھیں۔ ہپی کس کے مینار کی بنیاد بھی یروشلم کی شہر پناہ میں موجود ہے اور اسے مینار داؤد کٹاوین کی نسبت سے دیا گیا۔ دونوں عمارتوں کو ایک خوبصورت باغ کے ذریعے آپس میں ملایا گیا تھا۔ باغ میں پانی کی ندیاں اور حوض بنائے گئے جن کے کناروں پر کانسی کے فوارے اور مجسمے نصب تھے۔ ہیرودیس نے بالائی شہر کی گلیوں میں جنگلوں کا انتظام بھی کیا جس سے آمدو رفت آسان ہوگئی۔ بالائی شہر میں ایک تھیٹر اور رتھوں کی دوڑ کا میدان بھی بنایا گیا۔ ان دونوں عمارتوں کے ٹھیک ٹھیک مقام کا تعین آج نہیں کیا جاسکتا۔ ہر پانچ سال کے بعد شہنشاہ روم (آکستش) کے اعزاز میں کھیلوں کا اہتمام کیا جاتا۔ اس موقع پر دور دراز سے نمایاں اتھلیٹوں کی ایک بھاری تعداد یروشلم میں جمع ہوجاتی۔

MAP (نقشہ)

ہیرودیس کے عہد میں یروشلم ایک ممتاز اور پروقار شہر بن گیا۔ جس کی آبادی ایک لاکھ بیس ہزار نفوس کے قریب تھی۔ اس نے شہر کی دیواریں بھی از سرنو تعمیر کیں۔ ماہرین ان دیواروں کی حقیقی لمبائی اور اونچائی کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ جوزیفس کا کہنا ہے کہ پہلی دیوار قدیم شہر داؤد کے مقام پر بننے والے زیرین اور بالائی شہر کا احاطہ کرتی تھی۔ دوسری دیوار ایک اجافی دفاعی لائن بنتے ہوئے نئے تجارتی علاقے کے گرد گھومتی ہوئی انٹونیہ سے حسمونیوں کی بنائی ہوئی پرانی شمالی دیوار تک پہنچتی تھی۔ (1) زیرین شہر میں کچھ کم تر درجے کے محلات بھی تھے جو میسوپوٹیمیا شاہی خاندان کی ملکیت تھے۔ اس شاہی خاندان نے یہودیت قبول کرلی تھی۔ شہر کی دیواروں سے باہر انہوں نے کچھ بڑے بڑے مقبرے بھی بنا رکھے تھے۔ انہیں آج کل بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا ہے۔ شہر کی دیواروں کے گرد وادیوں اور پہاڑوں میں خوبصورت چٹانی قبریں بھی بن رہی تھیں۔ مرنے والوں کو یہاں لا کر دفن کیا جاتا تھا تاکہ شہر ناپاک نہ ہو۔ ہیرودیس کے دور کی قبریں آج بھی قدرون وادی میں موجود ستونوں، کتبوں اور چٹانی لحدوں پر مشتمل ہیں۔ انہیں زائرین ابی سلعوم کی لاٹ اور

یہوسفط کا مقبرہ کہتے ہیں۔

19 ق م کے قریب ہیرودیس نے معبد کو پھر سے تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔لوگ فطری طور پر اس فیصلے سے پریشان تھے۔وہ سوچتے تھے کیا بادشاہ موجودہ عمارات کو مسمار کردے گا اور کیا اس کے پاس اس کام کے لئے کافی خزانہ ہے؟ کیا وہ توریت کے احکامات کو تسلیم کرتا ہے۔ ہیرودیس کی عمارات عموماً جدت پیش کرتی تھیں۔لیکن معبد کا نقشہ تو الہامی ہے۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور

حضرت داؤدؑ کو بتایا گیا تھا۔کیا بادشاہ اس کے مطابق سب کچھ کر سکے گا؟ ہیرودیس نے ان خدشات کو بڑی ذہانت سے دور کر دیا۔اس نے معبد کی تعمیر کا کام اس وقت تک شروع نہ کیا جب تک تمام سامان اکٹھا نہ کر لیا۔پھر اس نے بڑی احتیاط سے پرانی عمارت کی بنیادوں کا سراغ لگایا۔کاہنوں سے اصل نقشہ کی معلومات جمع کیں اور لوگوں کو یقین دلایا کہ غیر یہودی اور عام لوگ مقدس اور ممنوعہ حصوں میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہیرودیس نے ایک ہزار کاہنوں کو معماروں کے فن کی تربیت دلوائی۔اسی طرح دیگر دستکاریوں کی تربیت کاہنوں اور راسخ العقیدہ یہودیوں کو دلوائی گئی تاکہ معبد کی تعمیر میں دنیا دار لوگوں کی ضرورت نہ پڑے۔مخصوص تربیت یافتہ کاہنوں کو ہیکل اور دیور (خانہ اقدس) کی تعمیر کا کام سونپا گیا۔ ہیرودیس خود اس عمارت میں کبھی داخل نہ ہوا جسے اس کا شاہکار قرار دیا جاتا تھا۔تعمیر کا کام اس انداز میں زیر عمل لایا گیا کہ قربانیاں پیش کرنے کا کام ایک دن کے لئے بھی نہ رکا جب کہ معبد کی عمارتوں کی تعمیر 18 ماہ میں مکمل ہوئی۔عبادت کے تسلسل کی وجہ سے ہیرودیس کے بنائے ہوئے معبد کو دوسرا معبد ہی کہا گیا ورنہ حقیقت میں یہ تیسرا معبد تھا۔

ہیرودیس معبد کی عمارت کے سائز یا شکل وصورت میں تو کوئی تبدیلی نہ کر سکا لیکن اس نے نئی عمارت نہایت خوشنما بنوائی، دیواروں پہ سفید سنگ مرمر لگایا جن پر سرخی مائل اور نیلی لکیریں کندہ کی گئیں۔ان لکیروں کی شبیہ سمندر کی لہروں جیسی تھی۔ (2) ہیکل کے دروازوں پر سونے کے ورق خوبصورت نقوش کے ساتھ چسپاں کئے گئے۔ یہ ورق انگور کی قد آدم بیل کا منظر پیش کرتے تھے۔(3) دروازوں پر انتہائی قیمتی پردے آویزاں کئے گئے۔جن پر ارغوانی نیلے اور اودے رنگ کے کشیدہ کاری سے چاند، سورج اور ستارے بنائے گئے تھے۔

اگرچہ معبد کی عمارتیں ماضی کی طرح بہت چھوٹی تھیں لیکن ہیرودیس نے وسعت دینے کا شوق معبد کا چبوترہ وسیع کر کے پورا کر لیا۔ یہ اتنا بڑا پراجیکٹ تھا کہ اس کی تکمیل میں اسی برس لگ گئے ظاہر ہے ہیرودیس اتنا طویل عرصہ زندہ نہ رہ سکا اور اپنے شروع کئے گئے کام کو مکمل صورت میں نہ دیکھ سکا۔لیکن اس کام میں مجموعی طور پر اٹھارہ ہزار محنت کشوں نے حصہ لیا۔ جب یہ چبوترہ مکمل ہوا تو اس کا رقبہ تقریباً 135 ایکڑ اور اپنے اصل رقبہ سے کئی گنا بڑا تھا۔ چونکہ یہ پلازا کوہ صیہون کے کنارے سے باہر تک پھیل گیا تھا چنانچہ اسے دیوہیکل ستونوں، ٹیکوں اور پشتوں کا سہارا دیا گیا۔ جوزیفس کا کہنا ہے کہ نئی معاون دیواریں اتنی عظیم تھیں کہ لوگوں نے ان کے بارے میں کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔(4) جن پتھروں سے یہ دیواریں

بنائی گئیں انمیں سے کچھ کا وزن دو سے پانچ ٹن کے درمیان تھا۔ چونکہ ہیرودیس معبد کے چبوترے کو مشرق کی طرف وسعت نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ پرانی مشرقی دیوار جو شہر کی دیوار بھی تھی اپنی جگہ پر ہی رہی۔ اسے اب صیہون پر معبد کے پہلے معمار حضرت سلیمان کی بنائی گئی بنیاد سے وابستہ کر دیا گیا۔ مغربی معاون دیوار نئی تعمیرات میں سب سے طویل تھی اس کی پیمائش انٹونیہ سے جنوبی حد تک 530 گز کے قریب تھی۔ مغربی دیوار کے نیچے بازار تھا۔ اس کی دکانوں میں تمام کاروبار کا ہن کرتے تھے۔ یہ بازار زائرین اور سیاحوں میں بہت مقبول رہا۔ دکانیں ٹھیک دیوار کے ستھ بنی ہوئی تھیں اور تین تین پتھر اونچی تھیں۔ شہر کی انتظامیہ کی عمارتیں اور سرکاری دفاتر بھی مغربی دیوار کے سائے میں تھے۔ معبد کے چبوترے پر معاون دیواریں تین اطراف میں یونانی انداز کے ستونوں والے چھجوں پر ایستادہ تھیں بالکل اسی طرح جیسے آج کل حرم الشریف کے سامنے کا حصّہ ستونوں پر کھڑا ہے۔ چبوترے کا پورا جنوبی حصہ بڑے بڑے ستونوں پر استور تھا جیسے رومن فورم میں بیسی لیکا ہوتا تھا۔ جو بارش اور دھوپ دونون سے لوگوں کو تحفظ دیتا تھا۔ شاہی غلام گردش جیسے ایک چھجے کا پھیلاؤ سالسبری کیتھیڈرل جتنا یعنی سوفٹ لمبا اور اپنے اونچے ترین مقام پر ایک سوفٹ بلند تھا۔ جنوبی معاون دیوار کے آگے چمکتے ہوئے سفید سنگ مرمر سے مزین یہ غلام گردش جیسا چھجہ

MAP (نقشہ)

مغربی دیوار۔۔۔دیوار گریہ۔۔۔ بادشاہ ہیرودیس نے معبد کے لیے یہ معاون دیوار تعمیر کی تھی۔ اٹھارویں صدی میں مسلمانوں نے اس کی مرمت کی تو ہیرودیس کے زمانے کے بڑے پتھر استعمال میں نہ لا سکے۔

انتہائی دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ دور سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ پہاڑ برف سے
ڈھکا ہوا ہے۔(5) تباہ ہو جانے کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک ربی کہا کرتے تھے کہ جس نے ہیرودیس کا معبد نہیں دیکھا اس نے دنیا کی خوبصورت ترین عمارت نہیں دیکھی۔(6)

زائرین معبد کے صحن میں داخل ہونے کے لئے دو میں سے ایک راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ وہ شاہی غلام گردش کو جانے والی سیڑھیوں کو استعمال کرتے یا پھر دو پل عبور کرتے جو مغربی معاون دیوار کے ساتھ موجود گلی کے اوپر بنائے گئے تھے۔ چبوترے پر پہنچ کر زائرین کو صحنوں کے ایک پیچیدہ نظام سے واسطہ پڑتا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا صحن سامنے آتا جو

تقدیس کے حوالے سے پہلے سے اونچے درجے میں ہوتا۔ یوں مرحلہ وار صحن دیور تک پہنچتے۔ سب سے پہلے زائر غیر یہودیوں کے صحن یا آنگن میں پہنچتا۔ معبد کا یہ حصہ سب کے لئے کھلا رہتا تھا۔ اس کے بعد اسرائیلیوں کا صحن آتا جس میں صرف مرد یہودی مذہبی تقاضوں کے مطابق پاکیزگی اختیار کر کے جا سکتے تھے۔ ان دونوں صحنوں کو ایک خوبصورت جنگلہ ایک دوسرے سے الگ کرتا تھا۔ جنگلے پر انتباہی تحریریں موجود تھیں کہ غیر متعلقہ افراد کو داخل ہونے پر موت کی سزا دی جائے گی۔ رکاوٹ کے آگے عورتوں کا صحن تھا۔ اس میں ایک باپردہ اونچی گیلری تھی۔ جہاں سے عورتیں قربان گاہ میں جھانک کر ذبیحہ کا عمل دیکھ سکتی تھیں۔ عورتوں کے صحن کے آگے لادیوں کا صحن تھا۔ اور پھر آخر میں کاہنوں کا صحن جس میں مذبح یا قربان گاہ تھی۔

داخلی عمارت یعنی مقدس ترین مقام تک یہ تدریجی رسائی عبادت گزاروں اور زائرین کو باور کراتی تھی کہ وہ ایک مختلف قسم کے مقام کا معراج حاصل کر رہے ہیں۔ اس دوران انہیں پاکیزگی اور طہارت کے مذہبی مراحل سے گزرنا پڑتا تھا جو انہیں احساس دلاتے کہ وہ روزمرہ دنیاوی زندگی سے ایک فاصلے پر آ گئے ہیں اب انہیں ایک ایسے حلقے میں داخل ہونا ہے جو ان کے مقدس خدا کا مخصوص علاقہ ہے۔ یہاں وہ جتنا عرصہ قیام کریں گے انہیں اسی پاکیزگی میں رہنا ہوگا جو کاہنوں پر فرض ہے۔ اگر کوئی زائر اپنے شہر یا گاؤں کے مقامی کاہن کی مدد سے طہارت کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر نہیں آتا تھا تو اسے اوپر معبد کی طرف جانے سے پہلے سات دن تک یروشلم میں رہنا پڑتا تھا۔ ایسے زائرین کو اس عرصہ کے دوران جنسی اختلاط سے دور رہنا پڑتا۔ انہیں تیسرے اور ساتویں دن مذہبی رسم کے مطابق اپنے جسم پر راکھ اور پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد باقاعدہ غسل کرنا پڑتا۔ یہ سات دنوں کا جبری وقفہ روحانی تیاری اور خود احتسابی کے لئے ہوتا تھا۔ زائرین اس کے ذریعے ایک داخلی سفر سے آشنا ہوتے جو انہیں بعد ازاں ماورائی حقیقت کی طرف معراج کے لئے تیار کرتا تھا اور جو ان کی زندگی کی بالکل مختلف جہت ہوتی تھی۔

بالآخر جب وہ اپنے قربانی کے جانور کے ساتھ معبد کے چبوترے پر پہنچ جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ کائنات کے ایک حساس ترین مقام پر آ گئے ہیں۔ اس احساس کی تمام تر حقیقت دراصل الگ تھلگ مقام کی مرہون منت ہوا کرتی تھی۔ یہاں زائرین کو پوری کائنات سمٹی ہوئی محسوس ہوتی۔ جوزیفس جو معبد میں ایک کاھن کی حیثیت سے خدمات سر انجام دے چکا تھا۔ اپنی تحریر میں اس کے کائناتی تصور کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ غیر یہودیوں کا صحن ابھی تک یم سے وابستہ تھا۔ یم وہی ابتدائی سمندر تھا جو برائی اور خلفشار کی علامت بن کر تخلیق کائنات کے وقت بپھر گیا تھا اور خدا کی منظّم اور مرتب دنیا کی تشکیل کے راستے

میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ برائی اور خلفشار کی علامت کے طور پر یہ اب بھی موجود تھا۔ زائر کو اس مستقل دشمن کے خلاف جدو جہد یاد دلانے کے لئے یہ صحن سب سے پہلے سامنے آتا تھا۔ اس کے برعکس ہیکل تخلیق کی گئی کائنات کا استعارہ تھا۔ اس کے پردے چار عناصر کی علامت اور آسمانوں کا منظر تھے۔ عظیم شمع دان پر رکھے چراغ سات سیاروں کی نمائندگی کرتے تھے۔

نذرانے کی میز پر رکھی بارہ روٹیاں سال کے بارہ مہینے تھے۔ قربان گاہ اور اس کے تیرہ مسالے۔ بحروبر کی وہ تمام اشیا تھیں جو خدا کی نعمتیں تھیں اور خدا کے لئے تھیں۔(7) اسکندریہ کا فیلو 41 سے 30 ق م کے دوران یروشلم میں زائر کی حیثیت سے آچکا تھا۔(8) وہ بتاتا ہے کہ ہیکل کا فرنیچر بھی ابتدائی آسمانی منظر پیش کرتا تھا اور ان تصورات کی تجسیم کی گئی تھی جو انسانی بصارت سے ماورا تھے۔(9) معبد کے پہاڑ کی تراش خراش کچھ اس انداز میں کی گئی تھی کہ معبد کا راستہ خدا سے رسائی کا راستہ محسوس ہوتا تھا۔ زائر معبد تک پہنچتے ہوئے عام انسانی دنیا سے نکل کر اس منظّم دنیا تک پہنچتا تھا جس کے راستے میں انتشار وافتراق کا مرحلہ، ابتدائی سمندر اور پھر تخلیق کا مرحلہ آتا تھا لیکن ان سب مراحل کو مختلف انداز سے دیکھنا پڑتا تھا۔ دنیا اب زائر کو خدا سے وابستہ دکھائی دیتی وہ زندگی میں ہی زمین پر رہ کر آسمان کا سفر کرتا۔ بالکل اسی طرح کاہن اعظم ہیکل میں سے گزرتا ہوا حقیقت مطلق تک پہنچا تھا۔ یہ سب کچھ تمثیلی انداز میں تھا جس میں حقیقت مطلق خانہ اقدس تھی۔ اسے ہیکل سے جدا کرنے والے پردے نظر آنے والی دنیا کی علامت تھے۔ خانہ اقدس (دیور) اس لئے خالی تھا کیونکہ حقیقت مطلق انسانی فہم ادراک سے بالاتر ہوتی ہے۔ جوزیفس بتاتا ہے کہ۔۔۔۔۔ ''یہاں کچھ بھی نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ یہ ناقابل رسائی، ناقابل خلاف ورزی اور ناقابل دید قوت کی علامت تھا۔''(10)

مقدس خدا کا جدا اور الگ ہونا اس طرح بھی باور کرایا جاتا تھا کہ معبد کے قلب کے پاس صرف کاہن ہی جا سکتا تھا۔ جوزیفس بتاتا ہے کہ کاہن اعظم کی پوشاک بھی کائناتی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کا چوغہ زمین اور آسمان دونوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کے بالائی پارچات چار عناصر کو ظاہر کرتے تھے۔ کاہن اعظم کا لباس انتہائی موزوں تھا کیونکہ وہ ہیکل میں فرائض سرانجام دیتا تھا اور یہ فرائض نہ صرف پوری انسانیت کی طرف سے بلکہ مظاہر فطرت کی طرف سے ادا کئے جاتے تھے جن میں ہوا، آگ، پانی، مٹی شامل تھے۔(11) لیکن جب وہ یوم کفارہ کو دیور میں داخل ہوتا تو صرف سفید رنگ کے سوتی لباس میں ہوتا۔ یہ لباس فرشتوں کا تھا جو آسمان اور زمین کے درمیان رابطے کے لئے آسمانی مخلوق تھے۔ مقدس مقام خالی ہونے کے باوجود ایک زبردست اور اعلیٰ ترین قوت کی موجودگی کا احساس بخشتا تھا۔ اس ماورائی قوت کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن تھا۔ تیاری کی مذہبی رسوم، پہاڑ پہ چڑھنا، صحنوں کے تقدیسی درجے اور معبد کی عمارتیں سب مل کر عبادت گزاروں میں یہ احساس پیدا کرنے میں مدد کرتے تھے کہ وہ ایک ایسی جہت میں داخل اور ملفوف ہو گئے ہیں جو اگرچہ عام زندگی کے ساتھ ہی پائی جاتی ہے لیکن اس سے بالکل مختلف اور ممتاز ہے۔ تقدس کے درجے ان چبوتروں کی طرح تھے جو میسوپوٹیمیا کے زگورتوں میں پائے جاتے تھے۔ یہ تدریجی صحن معبد کے پہاڑ کی ہموار سطح کو ایک علامتی مقدس پہاڑ بناتے تھے جو ''چوٹی'' پر موجود دیور کی آسمانی سلطنت کا راستہ مہیا کرتا تھا۔ معبد کے خدوخال عبادت گزار کو ایک ایسا منظر پیش کرتے تھے۔ جو اسے گہرے روحانی سکون و آسودگی سے مالا مال کر دیتا تھا۔ اب دنیاوی زندگی اس کے سامنے ایک نئے مفہوم کے ساتھ ابھرتی۔ پوری زندگی۔۔۔ جس میں یم کی تباہی و بربادی کی قوتیں بھی شامل تھیں۔۔۔ دیور کی نہاں تقدیس کے آگے سربسجود تھی۔

MAP (نقشہ)

(بادشاہ ہیرودیس کا معبد)

MAP (نقشہ)

معبد کا داخلی نقشہ

(مقبرہ)

1۔ قلعہ انٹونیہ سے

32۔ بالائی منزلیں تک

===========================

ہیرودیس کے دور میں پورے فلسطین اور دیگر علاقوں سے یروشلم کو آنے والے زائرین کی تعداد ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگئی۔ عید فسح اور سکوتھ کے موقع پر ضیافت میں تین سے پانچ لاکھ کے قریب لوگ جمعہ ہوتے تھے۔(12) مذہبی پہلو پر زور دیئے جانے کے باوجود یہ تہوار سنجیدہ اور یاس انگیز نہیں ہوتے تھے۔ ان مواقع پر زائرین اپنے بیوی بچوں کو تفریح کا سامان مہیا کرتے۔ یروشلم کے طویل سفر میں رات کے وقت زائرین مل بیٹھ کر کھانا کھاتے، شراب پیتے، ہنسی مذاق کرتے اور مقبول گیت گاتے۔ جب وہ یروشلم میں پہنچتے تو تہوار کی رونقیں جشن کا سماں پیدا کر دیتیں۔ زائرین نجی گھروں میں ٹھہرائے جاتے۔ جب ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا تو پھر شہر کے صلوات (یہودی عبادت خانے) میں ٹھیرایا جاتا۔ لیکن کچھ زائرین شہر کے باہر پہاڑیوں اور وادیوں میں خیمہ بستیاں بنا کر رہنا پسند کرتے۔ زائرین اپنے ساتھ خصوصی

عشر کی ایک رقم لاتے جو یروشلم میں خرچ کرنا ہوتی تھی۔اس رقم میں سے مذہب کے نام پر کچھ خرچ نہیں کیا جاتا تھا۔اس سے لوگ گوشت، شراب اور خورونوش کی مختلف ششیاء خریدتے۔اس خوشگوار فضا میں نئے دوست بنائے جاتے۔یہودی یک جہتی اور اخوت کو فروغ ملتا۔ملی اتحاد کا جذبہ اور خدا سے تعلق کا احساس طاقتور ہو جاتا۔(13)

مذکورہ مذہبی تہوار بذات خود خوشی و شادمانی کے تہوار بن چکے تھے۔سکوتھ کے آٹھ دنوں میں مکمل چھٹی کا ماحول ہوتا۔لوگ گھروں، میدانوں اور پہاڑوں میں شاخوں کی جھونپڑیوں میں رہتے۔عید فسح بالخصوص ایک مقبول تہوار تھا۔اس روز ہر خاندان ایک مینڈھا معبد میں قربان کرتا اور پھر شام کو ضیافت کی صورت میں سب مل کر اس کا گوشت کھاتے۔یہ تہوار مصریوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کی نجات کی یاد میں منایا جاتا۔ایک اور تہوار ضیافت آب کشی تھا۔یہ علامتی انداز میں زمینی اور آسمانی دنیاؤں کو متحد کرتا تھا۔اسرائیلیوں کے علم کائنات کے مطابق زمین ایک کیپسول تھی جس کے گرد پانی موجزن تھا۔ بالائی پانی نر اور زیریں پانی مادہ اور خطرناک تھا۔دونوں باہمی اتصال کے لئے نوحہ کناں رہتے تھے۔چونکہ یروشلم دنیا کا ''مرکز'' تھا چنانچہ یہی مقام ایسا تھا جہاں کائنات کے سبھی درجے آپس میں مل سکتے تھے۔سال میں ایک دفعہ نیچے کی دنیا کی رکاوٹیں علامتی انداز میں کھول دی جاتی تھیں جس کے نتیجے میں زیریں اور بالائی پانی آپس میں مدغم ہو جاتے۔لوگ اس موقعہ پر خوشی و شادمانی کا اظہار کرتے۔ربی کہا کرتے تھے کہ جس نے یہ تہوار نہیں دیکھا وہ نہیں جانتا کہ زندگی میں خوشی کیا ہوتی ہے۔(14) یہ ابتدائی زمانے کے خلفشار کی قوتوں کی نشاندہی کرتا تھا جن پر قابو پانا ضروری تھا تاکہ دنیا میں زرخیزی، تخلیق اور ثمر باری کا دور اگلے سال کے لئے یقینی بن جائے۔

ہیرودیس کے زمانے میں یروشلم کا معبد یہودی روحانیت کا محور و مرکز رہا۔تاہم اسی دور میں کچھ یہودی خدا سے رابطے کے لئے دیگر راستے تلاش کرتے رہے۔کچھ لوگوں نے حقیقت مطلق تک پہنچنے کے لئے معبد اور مذہبی طریقہ کار کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔خصوصاً یروشلم سے باہر رہنے والے یہودی نئی راہیں تلاش کرنے لگے۔ایسے یہودیوں نے صلوات (عبادت خانوں) اور اجتماعات کے دیگر مقامات پر اکٹھا ہونا شروع کر دیا جہاں وہ توریت کا مطالعہ کرتے اور یروشلم کا سفر کرنے کی بجائے اس شہر سے دور رہ کر روحانی دنیا میں پہنچ جاتے۔(15) فلسطین ہی میں کچھ یہودیوں نے اپنے مذہبی اجتماعات میں خدا کی موجودگی کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔فریسیوں کا فرقہ ابھی تک پورے جوش ایمانی کے ساتھ یروشلم کے معبد سے وابستہ تھا۔ہیرودیس کے عہد میں ہی شامائی مکتبہ فکر کے لوگ فریسیوں پر زور دیتے تھے کہ وہ ''کافر دنیا'' سے خود کو ماضی کے مقابلے میں زیادہ سختی سے دور رکھیں۔ان کا کہنا تھا کہ کافروں کے ساتھ کھانا پینا، یونانی بولنا یا کافروں سے تحفے تحائف قبول کرنا مذہبی بد دیانتی ہے۔اس تحریک کا جزوی طور پر مقصد معبد کی پاکیزگی تھا۔کیونکہ معبد کا انحصار ایک عرصہ سے کافر حکمرانوں کی اعانت پر تھا۔لیکن شامائی فکر رکھنے والوں کو یہودی برادری میں اب زیادہ قبول نہیں کیا جا رہا تھا۔

شامائیوں کے حریف ھلیل مکتبہ فکر کے پیروکار بھی اگرچہ تطہیر اور خود کو الگ تھلگ رکھنے کے حامی تھے لیکن وہ زیادہ

زور رحم ومروت پر دیتے تھے اور اسی کو اہم سمجھتے تھے۔حسمونی دور میں رحم ومروت کا نصب العین تو بالکل بھلا دیا گیا تھا۔ انطیوکس اپی فینس کی طرف سے بے حرمتی کے حادثہ کے بعد یروشلم اور معبد کی پاکیزگی اور اس کی عظمت کی عقیدت کو مقدم سمجھا جانے لگا تھا۔اس کے برعکس صیہونی عقائد میں موجود سماجی انصاف کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ہلیل کے فریسی رحم و مروت، خیرات اور سماجی انصاف کے کاموں کو توریت کے اہم ترین احکامات سمجھتے تھے۔وہ انہیں اتنا ہی موثر اور نا گزیر سمجھتے تھے جتنا معبد میں جا کر قربانی پیش کرنا۔(16) کچھ فریسیوں نے ایسی تنظیمیں بنالی تھیں جن کے ارکان عہد کرتے تھے کہ وہ سختی کے ساتھ اسی مذہبی طہارت کی حالت میں رہا کریں گے جو معبد میں موجودگی کے دوران ضروری ہوتی ہے۔اس طرح وہ معبد کے باہر اپنے گھروں میں رہتے ہوئے وہیں خدا کی موجودگی کو محسوس کر سکتے تھے اور کاہنوں کے صحن میں عظیم قربان گاہ کی طرح گھروں میں اپنے میزوں کو پاک اور مقدس بنا سکتے تھے۔یہ فریسی جب اکٹھے ہو کر کھانا کھاتے تو ان کا یہ اجتماعی کھانا اسی طرح مقدس موقع بن جاتا جس طرح معبد میں کاہن قربانی کا گوشت اکٹھے بیٹھ کر کھاتے تھے۔(17) اس نئی سوچ نے ہر گھر کو ایک معبد اور یروشلم کی تقدیس کو معمولی بنا دیا۔

ہیرودیس کے دور اقتدار کے آخری دنوں میں قمران فرقہ کے لوگ اپنے آپ کو سچے اسرائیلی کہتے تھے۔انہوں نے ایک نیا روحانی مرکز تخلیق کر لیا۔وہ اپنے آپ کو یروشلم کے ''آلودہ معبد'' سے وابستہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔وہ اپنی خود ساختہ جلاوطنی میں اپنے کھانے کے کمروں کو مقادس مقام بنا کر ان میں اجتماع کرتے۔وہ ان کاہنوں کی طرح رہتے جو معبد کی خدمات پر مسلسل مامور تھے۔کھانا کھانے سے پہلے وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے،سوتی لباس پہنتے یہ تمام ترعمل وہ اسی طرح کرتے جس طرح کاہن معبد میں کھانے میں شریک ہونے کے لئے کیا کرتے تھے۔اپنی اجتماعی عبادت کو یہ لوگ قربانی کا متبادل سمجھتے تھے۔لیکن یہ ایک عارضی انتظام تھا۔اس فرقہ کے لوگ ایک ایسے دن کے منتظر تھے جب دو مسیحاؤں نے تاریکی کی قوتوں کے خلاف ایک آخری جنگ کرنا تھی۔اس کے نتیجہ میں یروشلم نے آزاد ہونا تھا۔وہ دعویٰ کرتے تھے کہ پھر یہ مقدس شہر حقیقی طور پر مقدس ہو جائے گا اور خدا از سر نو معبد کو تعمیر کرے گا۔قمرانی فرقہ کے لوگ خود کو ایونم یعنی غریب کہتے تھے۔وہ خود کو صیہون کے سچے اور حقیقی باشندے قرار دیتے تھے کیونکہ صیہون کو ہمیشہ سے غریبوں اور محروموں کی جنت قرار دیا جاتا تھا۔ وہ
''نئے یروشلم'' کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسی اصطلاحیں اور آیات استعمال کرتے جو رسمی طور پر خدا کے لئے وقف تھیں۔

اوصیہون میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا

کیونکہ تم ہی برکت دیتے ہو

اپنی پوری طاقت اور روح سے تمہیں پیار کرتا ہوں

تمہاری یاد ہمیں برکت دیتی ہے (18)

توریت میں یہودیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی پوری طاقت سے صرف یہواہ سے پیار کریں۔ برکت کا ذریعہ صرف وہی ہے اور صرف اس کی یاد ہی ہمیشہ کے لئے برکت دینے کا ذریعہ ہے۔ قمرانی مناجاتوں میں اس طرح کے جملوں کا استعمال حادثاتی نہیں تھا۔ قمرانی انتہائی کٹر اور متعصب توحید پرست تھے۔ لیکن خدا چونکہ خود براہ راست عام لوگوں پر ظہور نہیں کرتا اور یروشلم صدیوں سے خدا کی موجودگی اور رسائی کا ایک ذریعہ بنا ہوا تھا چنانچہ خود یروشلم کو اعلیٰ تر مقام حاصل ہو چکا تھا۔ قمرانی فرقہ بھی صیہون کو امن، برکت اور نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا کیونکہ صیہون خدا کی موجودگی کے سبب خدا کا ہی ایک حصہ تھا۔ ہیرودیس کے ماتحت اس شہر کی المناک صورتحال کے باوجود یہ انتہائی مقدس مقام اور مذہبی عظمت رکھتا تھا۔

لیکن قمرانی فرقہ یہودیت کی عسکری صورت کا ایک اظہار تھا اور فلسطین میں بتدریج فروغ پا رہا تھا۔ تمام تر یونانی اور رومی دنیا میں لوگ وطن پرستی کے جذبات سے معمور ہو رہے تھے۔ معبد اور مندر بحال ہو رہے تھے۔ پرانے مذاہب زندہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ ہر طرف اپنی دنیا کے لئے مزاحمتی تحریک جنم لے چکی تھی۔ اسی رجحان نے قمرانی فرقہ کو سیموئیل کی جنگجویانہ پالیسی اپنانے پر آمادہ کیا تھا۔ جس نے معبد کی تعمیر، مقدس شہر کی تشکیل اور منظّم زندگی کی تخلیق کے لئے بنیادیں فراہم کی تھیں۔ اسی طرح عام یہودی بھی اپنے بڑے بڑے تہواروں کو قوم اور وطن کے تقدیس کی نظر سے دیکھتے اور مناتے تھے۔ عید گزراں یا عید فسح قومی نجات کی یاد میں منائی جاتی تھی۔ دو ہفتوں کا فصلی تہوار مناتے ہوئے قوم کو صحرا میں گزارے ہوئے چالیس برس یاد دلائے جاتے تھے۔ یہ تہوار معبد کے لئے خود کو وقف کرنیکی سالگرہ بھی ہوتا تھا۔ جب یہ لوگ اپنے قومی معبد میں اپنے خدا کے سامنے اتنی بڑی تعداد میں اکٹھے ہوتے تو جذبات عروج پر پہنچ جاتے۔ لیکن ہیرودیس اتنا طاقتور بادشاہ تھا کہ یہ لوگ اپنے جذبات کا اظہار کھلے بندوں نہ کر سکتے تھے۔ 4 ق مسیح میں جب یہ خبر عام ہوئی کہ ہیرودیس بستر مرگ پر ہے تو راسخ العقیدہ یہودیوں نے کچھ ہلچل دکھائی۔

یہ موقع بہت اہم تھا۔ ہیرودیس نے کچھ ہی دن پہلے معبد کے بڑے دروازے پر جو پیڑ اور رومن شہنشاہیت کی علامت عقاب کا طلائی مجسمہ نصب کروایا تھا۔ جب یہ افواہ پھیل گئی کہ ہیرودیس سچ مچ مرنے والا ہے تو دو بزرگ یہودیوں، یہوداہ اور میتھیاس نے اپنے شاگردوں کو کہا کہ ''عقاب'' کا مجسمہ اتار پھینکنے کا یہ شاندار موقعہ ہے۔ یہ اقدام بہر طور خطرناک تھا لیکن اپنے اباواجداد کی مقدس کتاب توریت کے لئے مرنا انتہائی عظیم و بابرکت کام تھا۔ چنانچہ پرجوش نوجوان یہودی شاہی چھجے پر چڑھ گئے۔ اپنے آپ کو رسوں سے باندھا اور عقاب پر کلھاڑے چلا کر
اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ لیکن یہ اقدام قبل از وقت ثابت ہوا۔ ہیرودیس نے یہ خبر غیض وغضب کے ساتھ سنی۔ انتقام کی آگ بھڑکی تو وہ اپنی ''موت کو ملتوی'' کر کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً مجرموں اور ان کے استاد بزرگوں کو موت کی سزا

دینے کا حکم دیا۔ حکم پر چند لمحوں میں عمل درآمد کر دیا گیا۔ چنانچہ جب چار پانچ روز کے بعد وہ واقعی مر گیا تو یہودیوں نے اپنے حلقوں میں یہ تاثر پھیلایا کہ بادشاہ کی موت مقدس شہیدوں کو دی گئی سزا کا نتیجہ اور مکافات عمل ہے۔(19) لیکن عقاب کا مجسمہ گرانا ایک محدود احتجاج تھا۔ ابھی تک کوئی بڑا اقدام یا بڑی تحریک سامنے نہیں آئی تھی۔ کسی گوشے سے ہیرودیس کو قتل کرنے یا رومنوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کا کوئی عزم یا کوئی نعرہ سننے میں نہیں آ رہا تھا۔ ہیرودیس کی زندگی میں عقاب کا انہدام بھی محض معبد کو نجاست سے پاک کرنا تھا۔ دراصل یہ صورتِ حال مسلسل موجود تھی۔ جو حکمران معبد کے معاملات میں مداخلت نہ کرتا، یہودی اسے برداشت کرنے پر تیار رہتے تھے۔ لیکن جوں ہی معبد کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو یروشلم ہنگامہ آرائی، خون ریزی اور خوفناک ردعمل کی لپیٹ میں آ جاتا۔

ہیرودیس نے 29 ق م میں اپنی چہیتی بیوی ماریہ کو قتل کر دیا تھا۔ اس قتل سے تھوڑی دیر پہلے ماریہ کے تینوں بیٹوں کے بھی سر قلم کر دیئے گئے کیونکہ ہیرودیس کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ چاروں اس کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ اپنی زندگی میں ہیرودیس نے اپنے بقیہ تین بیٹوں ارخلاوس، فلپ اور اینٹی پاس کو سخت نگرانی میں رکھا۔ ان میں سے کسی کو کوئی عہدہ یا اختیار نہ دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اس کا جانشین بن سکے۔ وہ انہیں کوئی منصب دے کر طالع آزما حواریوں کے چنگل میں بھی نہیں پھنسانا چاہتا تھا تا کہ کوئی مہم جو انہیں استعمال کر کے سلطنت کا شیرازہ نہ بکھیر دے۔ جب ہیرودیس مرا تو اس کی دو وصیتیں تھیں۔ اس کی وصیت کے مطابق سلطنت کی قسمت کا فیصلہ آگستس، شہنشاہ روم نے کرنا تھا۔ آگستس نے اس کے تینوں بیٹوں کو روم میں طلب کر لیا۔ لیکن ان کی روانگی عید فسح / عید گزراں کے موقع پر ہو رہی تھی۔ بہت بڑی تعداد میں زائرین یروشلم میں آ رہے تھے۔ توریت کی سربلندی کے لئے پیش کی جانے والی شہادتوں کا واقعہ ابھی تازہ تھا۔ لوگوں کے جذبات عروج پر تھے۔ مقامی یہودیوں نے شہدا کے سوگ میں مظاہرہ منظّم کیا۔ اس کے نتیجے میں شہر کی گلیاں گریہ زاری اور آہ و بکا سے گونجنے لگیں۔ زائرین اچانک اشتعال میں آ گئے۔ غم و غصے سے لبریز ہجوم انتقام کے نعرے بلند کرنے لگا۔ ارخلاوس نے جب دیکھا کہ صورت حال اس کے قابو سے باہر ہو رہی ہے تو اس نے اپنے سپاہی معبد کی طرف روانہ کئے تا کہ قائدین کی سرکوبی کی جا سکے۔ قربان گاہ میں ابھی قربانی کا پہلا مینڈھا ہی ذبح کیا جا سکا تھا کہ سپاہی معبد پہ حملہ آور ہو گئے۔ تین ہزار افراد کو قتل کر دیا گیا۔ ایک دفعہ پھر معبد کی بے حرمتی ہوئی لیکن اس دفعہ کافروں کی کسی علامت یا مجسمے کی وجہ سے نہیں بلکہ یہودی سپاہیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی خون ریزی سے ہوئی تھی۔ پانچ ہفتے بعد جب ارخلاوس روم میں تھا، یروشلم میں یوم خمیس کے موقعہ پر زائرین نے ایک اور شورش برپا کر دی۔ شام کے رومی گورنر سابین کو ایک لیجن کے ساتھ یہودیہ کے طرف روانہ ہونا پڑا۔ رومیوں کے ایک لیجن میں تین سے چھ ہزار تک سپاہی ہوتے تھے۔ جب یہ لیجن یروشلم پہنچا تو ہزاروں مقامی اور زائر یہودیوں نے گلیوں میں رکاوٹیں کھڑی کر کے رومن سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔ سابین کے پاس عوامی مزاحمت کو ختم کرنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے معبد کے پہاڑ پر بنے چھجوں کو آگ لگا دی۔ بعد میں رومن سپا

ہیوں نے دو ہزار باغیوں کو شہر کی دیواروں کے ساتھ مصلوب کر دیا۔(20)

فلسطین کے دیگر علاقوں میں ابھی اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔اس صورتحال نے روم کی سینٹ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہودیوں کے بادشاہ کی حیثیت سے ہیرودیس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ارخلاوس کو واپس یروشلم بھیج دیا گیا۔وہ ریاست یہودیہ کا حاکم بنایا گیا۔

MAP (نقشہ)

رومی فلسطین

==========

فلپ اور اینٹی پاس گلیلی ، بیئر اور بقیہ شمالی علاقوں کے ذیلی حاکم یعنی چوتھائی صوبے کے حاکم تھے۔یہ دونوں اچھے منتظم ثابت ہوئے اور کئی برس تک اپنے اقتدار برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔لیکن ارخلاوس نے کچھ ایسی سفاک پالیسیاں اپنائیں کہ یہودی اور سامریہ کے لوگ دنوں میں ہی بے چین ہو گئے۔رومی حکمرانوں نے 6 عیسوی میں ارخلاوس کو معزول کر دیا۔اس کی جگہ رومن پریفیکٹس (نمائندوں) کو علاقے کا حاکم بنا دیا۔انہوں نے قیصریہ کے نئے شہر کو اپنا دارالحکومت بنا لیا جو یروشلم جیسے ہنگامہ پرور شہر سے ایک فاصلہ پر محفوظ تھا۔رومنوں کی نگرانی میں آنے کے بعد ابتدائی دنوں میں گلیلی میں بے چینی پائی جاتی تھی۔لیکن یہ سمجھنا غلط فہمی ہو گی کہ پورے یہودی فلسطین میں روم کے خلاف کسی طرح کی شدت پائی جاتی تھی۔ایسی صورت حال کہیں بھی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ہیرودیس کی موت کے بعد کچھ یہودیوں نے آکستس کے پاس اپنا ایک وفد بھیجا اور اس سے درخواست کی کہ فلسطین میں کوئی رومی گورنر تعینات کیا جائے۔فریسی تو بالخصوص کسی یہودی بادشاہت کے حق میں نہیں تھے۔فلسطین پر رومنوں کا تسلط کوئی اچھی بات نہیں تھی لیکن مقامی یہودیوں کا خیال تھا کہ دیگر غیر ملکی حکمرانوں کے برعکس رومن اچھے حکمران ہیں۔چند ایک ناخوشگوار واقعات کے سوا رومی حکام نے کبھی بھی یہودیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہیں کیا تھا بلکہ ہمیشہ کاہن اعظم کے ساتھ تعاون میں گرم جوشی دکھائی تھی۔خود کاہن بھی چاہتے تھے کہ امن وامان برقرار رہے۔نئے رومن حکام نے شورش پسند عناصر پر کڑی نظر رکھی۔متعدد افراد کو انہوں نے اپنی صفوں میں شامل کر لیا۔اس لئے نہیں کہ وہ لوگ چاپلوس اور کاسہ لیس تھے بلکہ اس لئے کہ ہیرودیس کی موت کے بعد پھوٹنے والے ہنگاموں میں جس طرح لوگ بے مقصد مارے گئے، ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہو۔اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جو لگ کاہن اعظم کا منصب سنبھالیں وہ اصل اور لائق افراد ہوں۔18 ق م میں کائفا نے کاہن اعظم کا منصب سنبھالا۔وہ رومن دور کا سب

سے قابل کاہن اعظم ثابت ہوا۔

لیکن کائفا بھی اس وقت مشتعل ہجوم کو قابو میں نہ رکھ سکا جب 26ء میں نئے رومی حاکم پیلاطس نے معبد کی بے حرمتی کی۔ پیلاطس نے اشتعال انگیز انداز میں اپنے سپاہی رات کے وقت یروشلم میں داخل کر دیئے۔ان کے ہاتھوں میں جھنڈے اور سیزر کی شبیہ تھی۔ یہ سب انطونیہ میں ہیکل سے پتھر پھینکنے کے فاصلہ پر نصب کر دیئے گئے۔اس کراہت آمیز اقدام کی رات گزرنے پر جب یہودی بیدار ہوئے تو وہ اشتعال میں آ گئے۔انہیں خدشہ محسوس ہوا کہ اب ایک بار پھر وہی سب کچھ ہوگا جو انطیوکس اپی فینس کے دور میں ہوا تھا۔ایک مشتعل ہجوم قیصریہ کی طرف چل پڑا۔اس نے پیلاطس کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا۔حسب سابق یہودیہ کے لوگ اتحاد سے بے بہرہ تھے۔ چنانچہ وہ ایک مشترکہ محاذ نہ بنا سکے۔لیکن معبد کو درپیش خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ بظاہر متحد تھے۔ یہ اتحاد چونکہ سطحی تھا، چنانچہ کوئی ہنگامہ نہ ہو سکا۔شاید اس کے پیچھے 4 ق م میں ملنے والا سخت سبق تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر انہوں نے پر امن مزاحمت پر اکتفا کیا۔پانچ دن تک وہ پیلاطس کے گھر کے باہر دھرنا دیئے بیٹھے رہے۔بالاخر پیلاطس نے انہیں قیصریہ کے ایمفی تھیٹر (گول گھر جہاں شہریوں کے اجتماعات ہوتے تھے) میں صورت حال کی ''وضاحت'' کے لئے بلا لیا۔جوں ہی تمام لوگ ایمٹی تھیٹر میں اکھٹے ہوئے، پیلاطس نے اپنے سپاہیوں کو ہاتھ ہلا کر کاروائی کرنے کا اشارہ دے دیا۔وہ چاروں طرف سے تلواریں سونت کر ہجوم پر پل پڑے۔اگر پیلاطس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ یہودیوں کو سر جھکانے پر مجبور کرے گا تو یہ غلط سوچ تھی۔قتل ہوتے ہوتے ہوئے۔یہودیوں نے سر تسلیم خم نہ کیا۔ تڑپتی ہوئی لاشوں کے درمیان زندہ لوگ چیخ رہے تھے کہ وہ مرنا قبول کر لیں گے عقائد کی بے حرمتی قبول نہیں کریں گے۔(21) پیلاطس ان کا جوش و جذبہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے سپاہیوں کو رک جانے کا حکم دیا اور پھر انطونیہ سے رومن پرچم اور سیزر کا مجسمہ ہٹا دیا گیا۔اگرچہ امن قائم ہو گیا اور شر انگیز اقدام واپس لے لیا گیا لیکن اب یہودیوں کو محسوس ہو گیا کہ معبد کی سلامتی خطرے میں ہے۔

چار سال بعد معبد ایک بار پھر خطرے کی زد میں آ گیا۔ایک چھوٹا سا جلوس جس کی قیادت ایک خر سوار کر رہا تھا۔ وادی قدرون سے کوہ زیتون کے نیچے آیا اور نعرے لگاتا ہوا یروشلم میں داخل ہوا۔جلوس کے شرکاء نعرے لگا رہے تھے۔۔۔ ''ہوشعنا''۔۔۔''داؤد کے بیٹے ہمیں بچاؤ۔۔۔'' کچھ لوگوں نے کھجوروں کی شاخیں توڑ کر ہاتھوں میں اٹھا لیں اور انہیں لہرانے لگے۔شہر میں شور مچ گیا کہ گلیلی کے شہر ناصرت سے ایک نوجوان نبی آیا ہے جو خود کو یسوع کہتا ہے۔جب یسوع شہر کے قریب آیا تو کہا جاتا ہے کہ وہ رو پڑا۔''یروشلم اسے قبول نہیں کرے گا اور پھر بہت جلد یروشلم کو خوفناک سزا ملے گی۔۔۔ مقدس شہر کو دشمن گھیر لیں گے۔اسے زمین بوس کر دیا جائے گا اور شہر کے لوگ قتل کر دیئے جائیں گے۔۔۔کوئی ایک پتھر ایستادہ نہیں رہے گا۔۔۔''اپنی پیشین گوئی کی صداقت ثابت کرنے کے لئے یسوع شہر میں داخل ہوا اور سیدھا ہیکل (معبد)

کو چل دیا۔ معبد میں پہنچ کر اس نے چھوٹے سے کوڑے سے لوگوں کو غیر یہودیوں کے صحن سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔

۔۔۔۔۔اور یسوع ہیکل میں داخل ہوا اور ان کو جو ہیکل میں خرید و
فروخت کر رہے تھے۔ باہر نکالنے لگا اور صرافوں کے تختوں اور کبوتر
فروشوں کی چوکیوں کو الٹ دیا۔۔۔اور اس نے کسی کو ہیکل میں سے
ہو کر کوئی برتن لے جانے نہ دیا۔۔۔اور اپنی تعلیم میں ان سے کہا۔
کیا یہ نہیں لکھا ہے کہ میرا گھر سب قوموں کے لئے دعا کا گھر
کہلائے گا؟ مگر تم نے اسے ڈاکوؤں کی کھوہ بنا دیا ہے۔(22)

جب یسوع، (حضرت عیسیٰ) یروشلم میں آئے تو ان دنوں لوگ عید فسح کی تیاریوں میں تھے۔ ایک ہفتہ بعد تہوار تھا۔ حضرت عیسیٰ نے معبد کے صحنوں میں بہت وقت گزارا اور آنے والے لوگوں کو وعظ کرتے رہے۔ انہوں نے پیشین گوئی کہ ہیرودیس کا شاندار معبد بہت جلد مسمار کر دیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا۔۔۔''تم یہ بڑی بڑی عمارتیں دیکھ رہے ہو۔ یہاں کسی پتھر پہ پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے۔''(23) حضرت عیسیٰ کی زندگی اور تعلیمات پر مشتمل ابتدائی چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کا مصنف مرقس رہا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو کسی نہ کسی بہانے ہلاک کر دیا جائے۔ عید فسح کے پُر ہجوم اور جذباتی موقع پر معبد میں ہنگامہ آرائی کسی بڑے طوفان کو جنم دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہودی یہ خطرہ مول لینے پر قطعی طور پر تیار نہ تھے۔

معبد میں حضرت عیسیٰ کے اس ''اشتعال انگیز'' وعظ و تبلیغ کا کیا مقصد تھا؟ ہم اس کے بارے میں محض قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں کیونکہ کوئی بھی انجیل ہمیں پوری طرح معلومات فراہم نہیں کرتی۔ حضرت عیسیٰ کو گلیلی کے چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہات میں پیروکاروں کی ایک معقول تعداد میسر آ چکی تھی۔ وہاں انہوں نے لوگوں کو شفا بخشی تھی اور جھاڑ پھونک کا کام کیا تھا۔ لوگ انہیں نبی کہتے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ حضرت عیسیٰ نے ''مسیحا'' ہونیکا کبھی دعوی کیا تھا۔ ہمارے ذرائع بہت مشکوک ہیں۔ لیکن ایک بات مسلمہ ہے کہ انہوں نے رومنوں کو فلسطین سے نکال باہر کرنے کے لیے کوئی فوج نہ بنائی۔ کیونکہ ان سے پہلے یا بعد میں جن لوگوں نے مسیحا ہونے کا دعوی کیا انہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کو علاقے سے نکالنے کے لیے عسکری ذرائع استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ زکریا نے پیشین گوئی کی تھی کہ ''مسیحا'' ایک منکسر مزاج حکمران ہوگا اور ان کے درمیان ایک گدھے پر سوار ہو کر آئے گا۔ یروشلم میں حضرت عیسیٰ کا گدھے پر سوار ہو کر ایک جلوس کی صورت میں آنا شائد اس بات کا اشارہ تھا کہ خدا کی سلطنت، یروشلم پر ہیرودیس جیسے کسی لشکر بردار بادشاہ کی نہیں غریبوں کی حکومت ہوگی۔

حضرت عیسیٰ نے بھی پیشین گوئیاں کیں اور کہا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ارض موعودہ میں واپس آئیں گے اور ان کے بارہ شاگردان پر حکومت کریں گے۔(24) عام یہودی سمجھتے تھے کہ حتمی فتح کے بعد یہواہ، یروشلم میں ایک نیا معبد تعمیر کرے گا۔ وہاں تمام قومیں اس کی عبادت کریں گی۔ جب حضرت عیسیٰ نے معبد میں سے صرافوں (منی چینجرز) اور کبوتر فروشوں کو باہر نکالا تو یہ مقدس مقام کے ناجائز تجارتی استعمال پر احتجاج نہیں تھا۔ اس زمانے میں ہر معبد اور مندر میں اس طرح کے کاروبار کی اجازت ہوتی تھی۔ اور یہ مذہبی امور کا ایک ضروری حصہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت عیسیٰ پیغمبرانہ انداز میں صورت حال کا ناگزیر انجام دکھا رہے تھے مثلاً ان کا یہ کہنا کہ ہیرودیس کے خوبصورت معبد کی جگہ مقدس معبد قائم ہوگا جو انسانی ہاتھ تیار نہیں کریں گے۔ یہ تمثیلی انداز میں شر کی جگہ خیر کے قیام کی خوشخبری تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے مذمت میں کوئی خطرناک بات موجود نہیں تھی لیکن عید فسح کی ضیافت کے موقعہ پر حکام کو یہ یاد کرادیا گیا تھا کہ یہ مذمت آگے چل کر رومن اقتدار کے خلاف سنگین خطرہ بن سکتی ہے۔

کاہن اعظم کائفا بھی حضرت عیسیٰ کے اشاروں کو یہودیہ کے کسی بھی اور شخص کی طرح اچھی طرح سمجھ رہا ہوگا لیکن وہ جانتا تھا کہ پیلاطس کی طرف

سے بے حرمتی کے اقدام پر ردعمل کے نتیجہ میں قوم تباہی کے دھانے پر پہنچ گئی تھی۔ اس واقعہ کو رونما ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا چنانچہ وہ معبد کے بارے میں اب کسی کو اشتعال انگیز گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ تہوار کے پہلے دن اس نے حضرت عیسیٰ کو تو گرفتار کرلیا لیکن ان کے شاگردوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ یہ اقدام اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو کوئی بڑا سیاسی خطرہ نہیں سمجھتا تھا، حضرت عیسیٰ کے خلاف مقدمہ کی کاروائی کے دوران الزام عائد کیا گیا کہ وہ معبد کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شواہد اس الزام کو ثابت نہ کرسکے چنانچہ الزام واپس لے لیا گیا۔ کائفا نے اس ناکامی کے بعد ان پر ''توہین یہواہ'' کا الزام عائد کردیا۔ چونکہ یہودیوں کو خود کوئی بڑی سزا دینے کا اختیار نہیں تھا چنانچہ ملزم کو پیلاطس کے پاس بھجوا دیا گیا۔ پیلاطس نے حضرت عیسیٰ کو کوڑے لگائے مصلوب کرنے کی سزا سنائی اور حکم دیا کہ وہ اپنی صلیب اٹھا کر یروشلم کی گلیوں میں گزرتے ہوئے شہر سے باہر گلگتا نامی پہاڑی پر لے جائیں۔ گلگتا کو لاطینی میں کھوپڑی کا مقام کہتے ہیں۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو دو ڈاکوؤں کے ساتھ

مصلوب کیا گیا۔ مصلوب ہونے والے افراد طویل عرصہ تک جان کنی کی اذیت میں رہتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت جلد اور آسانی سے انتقال کر گئے۔ چونکہ اگلے روز سبت کا دن تھا چنانچہ حضرت عیسیٰ کے حواری چاہتے تھے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے انہیں دفن کردیں۔ اربیہ کا یوسف نامی شخص یہودیوں کی حکمراں کونسل کا ایک رکن تھا۔ اس نے پیلاطس سے درخواست کی کہ ''یسوع'' کی لاش اس کے مقبرے میں بھجوادی جائے۔ یہ مقبرہ

MA P (نقشہ)

کوہ زیتون کی زیریں ڈھلوان پر گتسمنے باغ جہاں یسوع مسیح نے گرفتاری سے پہلے دل سوزی کے ساتھ آخری دعا کی تھی۔
گتسمنے باغ عیسائیوں کے متبرک ترین مقامات میں سے ایک ہے۔

گلگتا پہاڑ کے قریب ہی ایک چٹان کو تراش کر غار کی شکل میں پہلے سے یوسف نے اپنے لئے تیار کروا رکھا تھا۔ فلسطین کے لوگ اسی طرح کی غار نما قبروں میں اپنے مردے دفن کیا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو جلدی سے اس قبر میں رکھکر غار کے منہ پر پتھر رکھ دیا گیا۔ ان کے حواریوں کا ارادہ تھا کہ یوم سبت کے بعد وہ واپس آئیں گے اور نعش کو پورے مذہبی طریقے سے مسیح کر کے دفن کریں گے۔

یسوع کو صلیب دیئے جانے کے بعد معاملہ ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن حالات نے نئی کروٹ لے لی۔ بہت جلد افواہ پھیل گئی کہ یسوع مرنے کے بعد پھر زندہ ہو گیا تھا۔ کہا گیا کہ جب کچھ عورتیں اتوار کی صبح کو مقبرے پر گئیں تو قبر خالی تھی۔ حضرت عیسیٰ کے کچھ شاگردوں اور عزیزوں نے کہا کہ انہوں نے یسوع کو زندوں کی طرح چلتے پھرتے باتیں کرتے اور کھاتے پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ بہت سے لوگ اس عقیدے کے مالک تھے کہ ''یہواہ کے دن'' راست باز لوگ جی اٹھیں گے۔ لیکن کیا یسوع اس ناگزیر موقع سے پہلے ہی جی اٹھا ہے؟ تو پھر وہ یقیناً مسیحا ہو گا۔۔۔ جس نے نجات سے پہلے ظاہر ہونا تھا۔ اور پھر دو ہفتوں کے تہوار کے دوران جب یسوع کے شاگرد یروشلم کے ایک کمرے میں اجتماعی نماز میں مصروف تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ ان پر یہواہ کی روح نازل ہوگئی ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان پر یہواہ کی روح نازل ہوگئی ہے۔ نبیوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ جب خدا کی موجودگی ماضی کے مقابلے میں بہت جلد محسوس ہو تو نیا دور شروع ہو جائے گا۔ یسوع کے فرقے کے لوگوں نے اس موجودگی کا ثبوت پیش کرنا شروع کر دیا۔ وہ بیماروں کو شفا بخشنے کے معجزے دکھاتے۔ عجیب وغریب زبان میں گفتگو کرتے، پیشین گوئیاں کرتے اور رویا دیکھتے۔ یہ خیال کہ ایک ایسا شخص جو مصلوب ہو کر شرمناک موت سے دوچار ہوا، مسیحا تھا، ایک حیرت انگیز بات تھی لیکن یہ دعویٰ مقبولیت حاصل کر گیا اور بہت سے یہودی اس نئے فرقے میں شامل ہو گئے۔ بالآخر یہودیوں کی حکمران کونسل کے ایک فریسی رکن گملی ایل کی تحریک پر کونسل نے نئے فرقے کو تسلیم کر لیا۔ (25) حضرت عیسیٰ کے شاگرد اپنے آپ کو کسی نئے مذہب کے پیروکار نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہودیوں کے دیگر عقائد کے مطابق اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے اور ہر روز ایک گروہ کی صورت میں معبد میں جا کر عبادت کرتے تھے۔ قمرانی فرقہ کے یہودیوں کی طرح یہ بھی خود کو ایوئیئم یعنی غریب کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی املاک غریبوں میں تقسیم کر دیں اور ایک اجتماعی زندگی گزارنے لگے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے پرندوں اور پھولوں کی طرح خدا

پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔(26) ان لوگوں کی راستبازی نے دوسرے یہودیوں کو بھی متاثر کیا۔ان کا دعویٰ تھا کہ:

''بہت جلد یسوع واپس آئے گا۔اس کا جلال سب پر ظاہر ہوگا اور
پھر سب جان جائیں گے کہ خدا کی بادشاہت آن پہنچی ہے۔''

یہ فرقہ بہت جلد قرب وجوار کے شہروں اور قصبوں میں پھیل گیا۔یروشلم،لدہ،یافہ،قیصریہ،گلیلی اور دمشق میں کلیسیا (چرچ) یعنی اجتماع کے گھر بن گئے۔یروشلم کی کلیسیائی قیادت ابتدائی دنوں میں یسوع کے تین نمایاں شاگردوں پطرس، یوحنا اور جیمز کے پاس تھی جنہیں ''بزرگ ارکان'' کہا جاتا تھا۔(27) خاص طور پر اہم رکن یسوع کا بھائی جیمز تھا۔اسے ''زادک''،یعنی راست باز آدمی کہتے تھے۔وہ یسوع کی زندگی میں اس کا پیروکار نہیں تھا۔لیکن مصلوب ہونے کے بعد یسوع کو سب سے پہلے جس نے رویا میں زندہ دیکھا وہ جیمز ہی تھا۔چنانچہ وہ کلیسیا کا سب سے موثر رکن بن گیا اور پھر 50ء میں وہی کلیسیا کا قائد تھا۔جیمز کو یروشلم میں سب سے زیادہ توقیر حاصل تھی۔اس نے عجیب انداز میں ایک زاہد خشک سی زندگی گزاری۔مذہبی پاکیزگی کے معاملے میں وہ انتہائی احتیاط پسند تھا۔کہا جاتا ہے کہ اسے کاہنوں کی عبا پہننے اور کاہنوں کے صحن میں عبادت کرنے کی اجازت تھی۔فریسیوں کے ساتھ اس کے مراسم نہایت عمدہ تھے جب کہ قمرانی بھی اسے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔جیمز زادک نے ثابت کیا کہ یسوع کا فرقہ یروشلم میں یہودی مذہبی زندگی سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ توریت کو ترک کرنے کی بجائے جیمز اور یروشلم کا کلیسیا یہودیوں کے سبھی مذہبی قوانین کی پابندی کرتا۔کسی ایک قانون کو نظر انداز نہ کیا گیا۔یسوع کے پیروکاروں سے توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ توریت کے احکامات سے بڑھ کر سچے یہودی ثابت ہوں گے۔مثلاً توریت اگر کہتی کہ۔۔۔وہ قتل نہ کریں۔تو انہیں قتل تو دور کی بات ہے محض غصہ میں بھی نہیں آنا چاہئے اگر توریت زنا سے منع کرتی ہے تو انہیں کسی عورت پر نظر بھی نہیں ڈالنی چاہئے۔(28) انکا فرض تھا کہ وہ مثالی یہودی کی زندگی گزاریں۔روزانہ معبد میں عبادت کریں اور یسوع کی واپسی کا انتظار کریں۔

36ء میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یسوع کے فرقے یعنی مسیحی تحریک کے کچھ ارکان معبد میں مرکزی یہودی مکتبہ فکر کے لوگوں سے الجھ پڑے تھے۔ان کا قائد ستفنس تھا۔اسے مسحور کن خطابت کا ملکہ حاصل تھا۔اس کی تبلیغ سے شہر میں لوگ نالاں تھے۔(29) یسوع کی طرح اسے بھی کاہنوں اور یہودیوں کی عدالت عالیہ سنہیدرن کے سامنے پیش کیا گیا اور اس پر معبد اور توریت کی ہرزہ سرائی کا الزام لگایا گیا۔لوقا ایک انجیل اور رسولوں کے اعمال نامی کتاب کا مصنف ہے لیکن جو گفتگو وہ ستفنس سے روایت کرتا ہے وہ یقیناً تاریخی نہیں۔ بلکہ ایک ایسا رجحان ہے جو بعد میں یروشلم سے باہر کے کلیسیاؤں میں دکھائی دینے لگا اور تصادم کی جڑیں بھی اسی سے پھوٹیں۔لوقا نے متعدد بار ستفنس کو یہ کہتے ہوئے دکھایا ہے کہ۔۔۔۔خدا

نے خود کو اپنے بندوں پر یروشلم سے باہر کئی مقامات پر ظاہر کیا ہے۔ میسو پوٹیمیا، فاران، مدیان اور سینا میں ایسا ہو چکا ہے۔ خود حضرت سلیمان بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ خدا انسانوں کی بنائی ہوئی عمارت میں کیسے رہ سکتا ہے۔(30) ستفنس نے کاہنوں اور حکمران کونسل کے یہودیوں کو اتنا برہم کیا کہ وہ اسے فوراً شہر سے باہر لے گئے اور سنگسار کر دیا۔ لوقا کا کہنا ہے کہ ستفنس کو سنگسار کرنیکے بعد ان لوگوں نے اپنے غیض وغضب کا رخ کلیسیا کے بقیہ ارکان کی طرف موڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے ''بزرگان'' کو براہ راست اپنا نشانہ نہ بنایا لیکن فلسطین کے عام مسیحی پیروکاروں پر سختی شروع کر دی۔(31) یروشلم کے یونانی بولنے والے مسیحی فرقے کے لوگوں کو شہر سے فرار ہونا پڑا۔ انہوں نے پہلے دیہی علاقوں میں پناہ لی اور پھر فونیقیا، قبرص اور انطاکیہ کے ابتدائی کلیسیاؤں میں چلے گئے۔

انطاکیہ میں ہی سب سے پہلے اس فرقہ کو کرسچن کہا گیا۔ کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ یسوع، کرسٹوس خرستس یعنی خدا کا بپتسمہ یافتہ اور مسیحا تھا۔(32) 40ء میں انطاکیہ کے مسیحیوں میں ایک اور سر برآوردہ یہودی شامل ہو گیا جو پہلے ان کا کٹڑ دشمن تھا۔ وہ مسیحیوں کو اذیت دینے کے لئے جب یروشلم سے دمشق کو روانہ ہوا تو راستے میں اس نے رویا میں یسوع کو دیکھا اور پھر وہ یہودیت چھوڑ کر مسیحیت میں داخل ہو گیا۔ ترسس کا پال بہت جلد انطاکیہ کے مسیحیوں کا قائد بن گیا۔ مسیحیت کے بارے میں اس کا تصور یروشلم کے بزرگ ارکان سے بالکل مختلف تھا۔ پچھلے باب میں ہم نے دیکھا تھا کہ اس دور میں یونانی دنیا کے بہت سے لوگ اپنے آبائی مذاہب کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ ہم پال کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی نئی بات کا متلاشی تھا۔ اس نے گملی ایل سے توریت پڑھی تھی اور فریسیوں کے فرقہ میں شامل ہو گیا تھا لیکن اس کو توریت ایک بوجھ محسوس ہوئی جو اس کی ذاتی آزادی کو تباہ کرتی تھی۔ یہ اسے نجات، امن اور خدا سے تعلق مہیا نہ کر سکی۔(33) دمشق جاتے ہوئے اس نے رویا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یسوع کی تعلیمات توریت کی بہترین متبادل ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی موت اور حیات نو نے نجات کی تاریخ میں ایک نیا باب وا کیا تھا۔ یہودی اور غیر یہودی ایک ہی انداز میں بپتسمہ کی رسم ادا کر کے نئے اسرائیل میں داخل ہو سکتے تھے۔ بپتسمہ انہیں روحانی طور پر یسوع سے مربوط کر دیتا تھا۔ چنانچہ اب مسیحیوں کے لئے کھانے پینے کے قوانین کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ انہیں غیر یہودیوں سے الگ تھلگ رہنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ان پر ختنہ کی بھی پابندی نہیں تھی کیونکہ یہ سب عہد نامہ عتیق کے نشانات تھے جس کی جگہ نیا عہد نامہ نازل ہو چکا تھا۔ وہ سب جو یسوع کی روحانی بادشاہت میں رہتے تھے، اب خدا کے بیٹے اور ابراہیم کی اولاد تھے چاہے ان کا تعلق کسی بھی رنگ ونسل سے ہو۔

پال نے مسیحی عقائد کی جو تفسیر کی اس نے غیر یہودی لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اس نئے مکتبہ فکر سے مربوط کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ ان عقائد کو عقل وشعور کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی اس لئے کہ حضرت عیسیٰ کی موت وحیات کے واقعات سے اس تفسیر کی کوئی مطابقت تھی۔ دراصل حضرت عیسیٰ کے بارے میں پال کا نکتہ نظر رومی ویونانی دنیا میں بدلتے

ہوئے مذہبی رجحانات سے مطابقت رکھتا تھا۔امریکی سکالر جوناتھن زی سمتھ وضاحت کرتا ہے کہ اس دور میں روحانی سمتیں بدل رہی تھیں۔معبدوں کے پرانے مذاہب کی جگہ کائنات نئے انسانی تصورات میں ڈھل رہی تھی۔

" انسانوں کوتحفظ دینے کے لئے شہروں کی فصیلوں کی بجائے ایک
انسانی گروہ،ایک مذہبی وابستگی یاایک خفیہ معاشرتی حصار بن رہا تھا
انتشار کی واپسی یا عدم تخلیق کے خطرہ کودشمن سمجھنےکی بجائے اب
دوسرے لوگوں یا عفریتوں کوشر یا موت کا خطرہ سمجھا جانے لگے تھا۔
اسی طرح مقدس مقامات کی بجائے خدا سے رابطہ کے ذرائع مقدس
انسان بن رہے تھے(34)

سمتھ ان تبدیلیوں کی جڑیں مصری جادوگر تھیسالس کی داستان میں دیکھتا ہے وہ چوتھی اور پانچوں صدی عیسوی میں شام میں مقدس انسان کے مذہب کی پیش بینی کررہا تھا۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ رجحان پہلے ہی سے فلسطینی یہودیت میں موجود تھا۔فریسی اور قمرانی فرقے اپنی مذہبی وابستگی کوایک نیا معبد سمجھتے تھے۔اب مسیحی نئی تبدیلی لاتے ہوئے مقدس انسان کو معبد کا مقام دے رہے تھے۔زیارتوں اور طہارتوں کی پرانی مذہبی رسوم کی بجائے مسیحیوں کے ہاں خدا کا راستہ مذہب کی تبدیلی (خدا سے رجوع) باضابطہ شرکت اور یسوع سے وابستگی تھی کیونکہ یسوع انسان ہونے کی باوجود مرنے کے بعد جی اٹھنے پر خدائی درجہ حاصل کر چکا تھا۔(35) پال نے عیسائیوں کوتعلیم دی کہ حضرت عیسیٰ نجات کا ذریعہ ہیں۔وہ انہیں گناہ اور موت کی شیطانی قوتوں سے تحفظ دلائیں گے۔

یہ دعوی بہت سے یہودیوں، مسیحی فرقے کے بزرگ ارکان اوران کے پیروکاروں نے توہین شریعت، بے حرمتی اور کفر قرار دے دیا۔ان کے لئے یہ بات حیرت اور صدمے سے کم نہیں تھی کہ محض ایک انسان میں روح القدس اتر سکتی ہے؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا اپنا ظہور کہیں بھی اور کسی بھی چیز میں کرسکتا ہے۔اس کے لئے وہ کسی شہر،معبد، پہاڑ یا انسان کا انتخاب کرسکتا ہے۔(36) چنانچہ مسیحی فرقے کوکسی خاص مقام میں اپنی جڑیں گہری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔اسے یہودیوں کی طرح مخصوص معبد اور مقدس شہر کو بنیاد بنانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔لوگوں کوایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو انہیں کہیں بھی نجات اور روحانی آسودگی مہیا کرسکے۔چنانچہ دمشق کے سفر کے دوران پال کی ڈرامائی مذہبی تبدیلے بہت سے یہودیوں کے لئے ایک بامعنی اقدام تھا۔مسیحی فرقہ اب باقاعدہ عیسائی مذہب بن رہا تھا۔

اب یروشلم میں عیسائیوں کا ہیرو جیمز زادک نہیں بلکہ پال سیاح تھا۔اس کے پیروکار کسی شہر سے بندھے ہوئے

نہیں تھے۔ بلکہ سفر وحضر میں روحانی معاملات
میں خود کفیل تھے۔ لیکن ابھی تک لوگوں کے لئے یروشلم سے دور ہونا تکلیف دہ تھا۔ پال اور بنیادی کلیسیا کے درمیان ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جیمز کو پتہ چلا کہ انطاکیہ کے عیسائی کوشر یعنی حلال گوشت نہیں کھاتے اور بے دینوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ مصالحت کی کوششوں کے بعد طے ہوا کہ پال کو بے دینوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا مشن سونپ دیا جائے۔ بنی اسرائیل کے انبیاء ہمیشہ
سے ایسے دور کی پیش بینی کرتے رہے تھے جب بے دین یہواہ کے سامنے سر جھکایا کریں گے اور اس کے لئے یروشلم کا رخ کریں گے۔ اور یہ دور ایک مسیحا کا ہوگا۔ پال بزرگ ارکان کو یہ دکھانے کے قابل ہو گیا تھا کہ ان کلیسیاؤں میں غیر یہودیوں یعنی بے دینوں نے آنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اسی جوش وجذبے سے سرشار ہوتے ہیں جس کا مظاہرہ یہودی مسیحی کرتے ہیں۔ چنانچہ جیمز کو چاہئے کہ وہ ختنے اور توریت کے مکمل اتباع کے غیر حقیقی مطالبات چھوڑ دے۔ پال نے اپنے تبلیغی مشن میں خود مختاری کے جواب میں پیش کش کی کہ اس کے ذریعے عیسائیت قبول کرنے والے لوگ یروشلم کے غریبوں کی مدد کریں گے۔ اپنے مشن کے دوران پال نے یروشلم کے کلیسیا کو جمع ہونے والی رقوم کی ادائیگی ہمیشہ ترجیحی بنیادوں پر کی۔ یہ تسلسل کی ایک اہم علامت تھی۔ اس کے ذریعے عیسائیت قبول کرنے والے یہودیت کے لئے اپنے روحانی تشکر کا اظہار کر رہے تھے اور قدیم پیشین گوئیاں پوری ہو رہی تھیں۔ (37) بے دین واقعی یروشلم کے لئے تحفے لا رہے تھے چنانچہ حتمی نجات اب دور کی بات نہیں تھی۔

لیکن جب پال 58ء میں عید خیام کے موقعہ پر رقم ادا کرنے کے لئے یروشلم پہنچا تو معبد میں اس کی موجودگی ہنگامے اور تصادم کا سبب بن گئی۔ پروہتوں نے اسے نقص امن کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ اپنے نئے پیروکاروں کو جو ماضی میں بے دین تھے، اسرائیلیوں کے صحن میں لے آیا۔ (38) یہ بات قرین قیاس محسوس نہیں ہوتی کہ پال نے اس انداز میں قانون شکنی کی ہو کیونکہ وہ لوگوں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ پرانی پابندیاں ختم ہو چکی ہیں اور بے دین بھی خدا کی بادشاہت میں غیر قوم نہیں سمجھے جاتے لیکن وہ معبد کی پابندیوں کو پامال نہ کر سکتا تھا۔ دراصل پال کی معبد میں موجودگی کو کٹر یہودیوں نے ایک خطرہ سمجھا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ پال کے عقائد ان سے مختلف ہیں۔ قمرانی فرقہ کی طرح پال کے ساتھی بھی سمجھتے تھے کہ اب خدا زمین پر دین داروں کی برادری میں رہتا ہے۔ (39) پال کے ساتھیوں نے خدا کی ارضی رہائش یعنی معبد کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی بادشاہت میں داخل سمجھتے تھے۔ (40) یہی وجہ ہے کہ جب 58ء میں پال معبد میں آیا تو یہودیوں نے اسے بھی یسوع اور ستفنس کی طرح معبد کے لئے خطرہ سمجھا، چنانچہ ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ لوقا، رسولوں کے اعمال میں لکھتا ہے کہ پال کو قیدی کی حیثیت سے روم بھجوا دیا گیا کیونکہ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ رومن ہے چنانچہ وہ حق رکھتا ہے اس کا

مقدمہ قیصر روم کے سامنے پیش کیا جائے۔ انطیوکس اپی فینس کے دور کے یہودی مصلحین کی طرح پال بھی محض یروشلم کا بیٹا بننے کی بجائے بین الاقوامی شہری بننا چاہتا تھا۔ پال کے ساتھ روم میں کیا ہوا؟ تاریخ ہمیں کچھ نہیں بتاتی۔ ایک داستان کے مطابق وہ شہنشاہ نیرو کی اذیت رسانی کے دوران 64ء میں مارا گیا۔ لیکن اس کی موت کی ایک عرصہ بعد بھی ''غیر قوموں'' میں اس کے بنائے گئے کلیسیا انہی عقائد پر کاربند رہے جو پال نے پیش کئے تھے۔

پیلاطس کے دور سے یہودی معبد کے دفاع کے لئے زیادہ مستعد ہو چکے تھے۔ انہیں اب اس کا تقدس ہر وقت خطرے میں نظر آتا تھا۔ 41ء میں شہنشاہ گائیس کیلیگولا نے حکم دیا کہ اس کا ایک مجسمہ یروشلم کے مقدس مقام پر نصب کیا جائے۔ جب پیٹرونیئس، شام کا رومی حکمران، شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کے لئے بطلیموس کی بندرگاہ پر پہنچا تو اسے سراپا احتجاج ہزاروں یہودیوں کا سامنا کرنا پڑا جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہر کے باہر میدان میں کھڑے تھے۔ مذاکرات کے دوران یہودیوں نے معمولی سی لچک دکھانے سے بھی انکار کر دیا۔ کیلیگولا نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے مزاحمت جاری رکھی تو شہر کی تمام آبادی کو قید کر لیا جائے گا۔ روم کو صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس دوران یہودیوں نے ایک بار پھر عدم تشدد کا راستہ اپناتے ہوئے پرامن مزاحمت کو ترجیح دی۔ انہوں نے کاشتکاری معطل کر دی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب رومنوں کو سالانہ باج گزاری میں کچھ نہیں ملے گا۔ کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ خدا ضرور مداخلت کرے گا اور واقعی خدا نے مداخلت کی اور انہیں بچا لیا۔ شہنشاہ روم کوئی انتقامی کارروائی کرنے سے پہلے ہی قتل ہو گیا۔ (41)

یہودیوں کو خوش کرنے کے لئے کیلیگولا کے جانشین شہنشاہ کلاڈیئس نے ہیرودیس کے پوتے اگرپا کو فلسطین کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ اس کے مختصر دور حکومت میں یروشلم خوب پھلا پھولا۔ اگرپا نے شہر کے بالائی اور زیریں بازار وادی الوعد میں وسیع کر دیئے اور شہر کے شمالی حصہ کے گرد دیوار بنانے کا منصوبہ بنایا۔ 44ء میں اچانک اسے موت نے آلیا۔ اس کی موت یہودیوں کے لئے ایک شدید دھچکا تھی۔ اگرپا کا بیٹا ابھی کمسن تھا اور حکومت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا چنانچہ شہنشاہ کلاڈیئس نے یہودیہ میں ایک نئے رومی گورنر کو بھیج دیا۔ لیکن نئے گورنر کو مکمل اختیارات حاصل نہیں تھے۔ اس دوران اگرپا کے بیٹے اگرپا دوم کو روایتی بادشاہ بنا کر پورے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ کمسن بادشاہ کے دور میں فلسطین میں بے چینی کی لہریں دیکھنے میں آئیں۔ تھیوڈس نامی ایک نبی چار سو افراد کو لے کر صحرا میں چلا گیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ خدا وہاں ظاہر ہوگا اور یہودیوں کو روم سے نجات دلائے گا۔ ایک اور نبی رومی گورنر فیلکس (52-59ء) کے دور میں اٹھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ رومنوں کو یروشلم سے باہر نکال دے گا۔ لیکن کوئی بھی نبی عوام کی اکثریت کو اپنی طرف نہ کھینچ سکا۔ چنانچہ رومیوں نے انہیں کسی مشکل کے بغیر کچل دیا۔ لیکن لوگوں کے جذبات کا اظہار تہواروں کے اجتماعات میں ہوتا رہا۔ رومی حاکم کومانس (48---52ء) کے دور میں عید گزراں (پیساک) کے ایک موقع پر حفاظتی دستے کا ایک سپاہی چھجے پر نمودار ہوا اور نیچے زائرین کو دیکھ کر نازیبا اشارے کرنے لگا۔ زائرین مشتعل ہو گئے۔ ہزاروں مشتعل یہودیوں کو معبد کے صحن میں موت سے

ہم کنار کر دیا گیا۔لیکن اس طرح کے واقعات کے باوجود یروشلم ترقی کرتا رہا۔انہی برسوں میں انتہا پسندوں نے مقدس شہر کو کشت وخون کے ذریعے رومیوں سے پاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔لیکن پھر روم کے ساتھ تصفیہ ہو گیا۔59ء میں بادشاہ اگرپا دوم کو اجازت دے دی گئی کہ وہ قدیم حسمونی محل میں رہائش اختیار کرلے۔ ہیرودیس کا محل رومی حاکم کے زیر استعمال تھا۔ ہیرودیس کے دور میں شروع کیا گیا معبد بلآخر مکمل ہو گیا۔اٹھارہ ہزار مزدوروں کو شہر کی گلیاں بنانے کے لئے ملازم رکھا گیا۔ یروشلم کو معقول حد تک خودمختاری دے دی گئی۔اگرپا اور کاھن اعظم دونوں مل کر یروشلم پر حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ قیصریہ میں موجود رومی حاکم کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے رہے۔

60ء میں رومیوں نے نا اہل قسم کے لوگوں کو یہودیہ کے گورنر کی حیثیت سے تعینات کرنا شروع کر دیا۔ایلی بی نس (62--60ء) مبینہ طور پر یہودی قزاقوں سے رشوت لیتا تھا۔کیسئس فلورس (66--64ء) نے بھی اس بدعنوانی کو جاری رکھا۔ جب قیصریہ میں یہودیوں اور شامی باشندوں کے درمیان فسادات بھڑک اٹھے تو فلورس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے سرکاری خزانے کے لئے معبد کے خزانے سے رقم طلب کرنے کا مہلک قدم اٹھا لیا۔ پلک جھپکنے میں یروشلم ہنگاموں کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہودی شہر کی گلیوں میں رومی سپاہیوں سے الجھ پڑے۔ جب صورت حال قابو سے باہر ہو گئی تو فلورس نے اپنا فیصلہ واپس لیلیا اور شام میں رومی گورنر کیسئس گیلس
سے مدد کی درخواست کی۔کیلس نومبر کے وسط میں لڑائی کی پوری تیاری کے ساتھ فلسطین میں پہنچا۔اس نے کوہ سکوپس پر لشکر گاہ بنائی اور پھر بے شیتا کے شمال میں پیش قدمی کی۔ پھر یہودیوں کی بے قاعدہ اور ہنگامی فوج سے تصادم کے بعد نہ جانے کیوں اماوس کے طرف پسپائی اختیار کرلی۔اس جنگ میں یہودیوں نے پانچ ہزار سے زائد رومی سپاہیوں کو تہ تیغ کیا۔

اس بحران کے دوران بھی یہودی اپنی داخلی کشمکش میں الجھے رہے باغیوں کو ہمہ گیر حمایت حاصل نہیں تھی۔ دیہی علاقوں کے سردار اور شہروں کے اشراف بھی روم کے خلاف جنگ کے حامی نہ تھے۔صدوقی اس معاملے میں زیادہ حقیقت پسند تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہودی روم کی طاقت کی شکست نہیں دے سکتے چنانچہ انہوں نے ''یہودی آزادی'' کے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے تھے۔فریسیوں کی اکثریت بھی سیاست کے برعکس مذہب پر زیادہ توجہ دیتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ روم کے خلاف یہودی بغاوت دوسرے علاقوں میں مقیم یہودیوں کو سنگین خطرے سے دوچار کردے گی۔ بادشاہ اگرپا نے باغیوں کو پرامن بنانے کی کوشش کی۔اس نے انہیں قائل کرنے کے لئے یاد دلایا کہ وہ کالوں، جرمنوں یا یونانیوں سے زیادہ طاقتور نہیں ہیں۔ان سب کو رومی طاقت کے سامنے سر جھکانا پڑا ہے۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عقل ودانش سے کام لینا چاہیے۔خود مورخ جوزیفس رومیوں کا حامی تھا۔اس کا کہنا ہے کہ یہودی محض خودکشی کا راستہ اپنائے ہوئے تھے۔لیکن ایک نیا انقلابی گروہ زیلٹس کے نام سے اعتدال پسندوں کی مخالفت میں منظر عام پر آ گیا۔اس انتہا پسند متعصب گروہ کا خیال تھا کہ رومی سلطنت کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ یہودیوں کے سامنے سنہری موقع ہے وہ رومیوں سے اپنی آزادی چھین لیں،

کیا میقابیوں نے غیر ملکی اقتدار کا جوا اتار کر آزاد یہودی

بادشاہت قائم نہیں کی تھی؟ یہ گروہ امن پسند یہودیوں کی سازشی اور صیہون کے باغی قرار دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان یہودیوں کو معبد میں عبادت کے لئے داخل ہونے سے روک دیا جائے گا۔ لیکن فلسطین کی یہودی آبادی کی اکثریت ان زیلٹس کے خلاف تھی۔ خود زیلٹس کی اپنی صفوں میں اتحاد موجود نہیں تھا۔ کچھ انتہا پسند بحر مردار کے قیب واقع قلعہ مصاوا کی طرف چلے گئے اور پھر انہوں نے شہر مقدس کے لئے مزید کسی جدو جہد میں حصہ نہ لیا۔ سیسٹس کیلس کی شکست کے بعد جب صاف نظر آ رہا تھا کہ اب روم کے ساتھ ایک بڑی جنگ ناگزیر ہے تب بھی شیلٹس یروشلم میں باہم دست وگریباں تھے۔

غالباً اسی مرحلہ پر یہودی مسیحی فرقے نے یروشلم سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ یہودی انتظامیہ اور مسیحی کلیسیا کے درمیان کشیدگی کے آثار واضح ہو چکے تھے۔ بزرگ رکن جیمز زادک کو 62ء میں پھانسی دے دی گئی۔ جیمز کو کاہن اعظم کی طرف سے ''قانون شکنی'' کے ازلزام میں موت کی سزا دی گئی تھی۔ فریسی فرقہ کے اسی کاہنوں نے جیمز کو دی جانے والی سزا پر روم سے احتجاج کیا اور جیمز کی سزا کے دن اجتماعی خودکشی کر لی۔ یروشلم کے کلیسیا کی قیادت اب حضرت عیسیٰ کے چچازاد شمعون کے پاس آ گئی۔ وہ مسیحی برادری کو لے کر اردن کے پار پیلا میں چلا گیا۔ حضرت عیسیٰ یروشلم کی تباہی کی پیشین گوئی کر چکے تھے اور عیسائیوں کو نظر آ رہا تھا کہ شہر کا انجام زیادہ دور نہیں۔ لیکن دوسرے یہودیوں نے کامیابی کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گیلس کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے روم سے آنے والی فوج کی مزاحمت کے لئے یہودیوں نے تیزی سے شمال میں تیسری دیوار تعمیر کی جس کا منصوبہ اگرپا دوم بنا چکا تھا۔

یہودیوں کی بدقسمتی ان کے سر پر منڈلانے لگی۔ رومیوں نے یہودیوں کی بغاوت کچلنے کے لئے اپنا قابل ترین جرنیل یروشلم کو روانہ کیا۔ 67ء میں رومی جرنیل ویسپاسئین فلسطین میں پہنچا۔ اس نے منظّم انداز میں یکے بعد دیگرے ان تمام مزاحمتی مراکز کا صفایا کیا جو گلیلی میں موجود تھے۔ 70ء میں سینٹ نے ویسپاسئین کو شہنشاہ بنا دیا چنانچہ وہ واپس روم چلا گیا اور اپنے پیچھے یہودیوں سے جنگ کے لئے اپنے بیٹے طیطس کو چھوڑ گیا۔ طیطس نے اسی سال فروری میں یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ مئی میں اس نے نئی دیوار توڑ دی۔ ایک ہفتہ بعد کے گرد بنی دوسری دیوار بھی توڑ دی گئی۔ اب جنگ معبد کے ارد گرد ہو رہی تھی۔ جولائی کے

آخری دنوں میں رومیوں نے انتونیہ پر قبضہ کر لیا اور معبد کے صحنوں میں پتھر گرانے شروع کر دیے۔ معبد میں آخری قربانی 6 اگست کو دی گئی۔ لیکن یہودیوں نے ابھی تک ہتھیار نہیں پھینکے تھے۔ بہت سے زیلٹس کا خیال تھا کہ چونکہ خدا خود اس شہر میں رہتا ہے اس لئے یہ کبھی تسخیر نہیں ہو سکے گا۔ ایک نبی تو آخری لمحوں میں بھی مصر تھا کہ خدا کسی معجزے کے ساتھ مداخلت کرے گا اور اپنے معبد اور لوگوں کو بچا لے گا۔ (42)

28 اگست کو جب رومی سپاہی بالآخر معبد کے داخلی صحنوں میں پہنچے تو چھ ہزار یہودی زیلٹس خون کا آخری قطرہ

بہانے کے لئے ان کے منتظر تھے۔یونانی مورخ ڈایوکاسیئس (وفات:230) کہتا ہے کہ یہودیوں نے غیر معمولی جرأت و بہادری کے ساتھ مزاحمت کی۔ان میں سے ہر ایک معبد کے دفاع میں مرنا ایک سعادت سمجھتا تھا۔(43) آخری لمحے تک انہوں نے معبد کی پاکیزگی اور تقدس کو مقدم رکھا۔ ہر ایک اپنی متعین جگہ پر رہ کر لڑتا رہا۔موت کو سامنے دیکھ کر بھی کسی ایک زیلٹ نے ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی۔عام یہودی اگلے صحنوں میں لڑتے رہے جب کہ شرفا اندرونی صحنوں میں جانے کے مجاز ہونے کی وجہ سے وہاں ڈٹ گئے۔ کاہنوں نے مقدس ترین مقامات کے لئے جان دی۔۔۔۔۔۔اور پھر سب نے دیکھا کہ معبد شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔خوف اور صدمے کے ساتھ لوگ چیخ اٹھے۔(44) کچھ لوگوں نے خود کو رومن تلواروں کی زد میں دے دیا جب کہ بقیہ شعلوں میں کود گئے۔

معبد سرنگوں ہو جانے پر دل برداشتہ یہودیوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔اب نہ تو کسی کو بالائی شہر کے دفاع میں دلچسپی تھی اور نہ دیگر قلعوں سے مزاحمتی جدوجہد جاری رکھنے کی ضرورت۔کچھ لوگوں نے صحرا کی راہ لی کہ شاید یہ نیا خروج کسی نئی قومی نجات کا پیشخیمہ ثابت ہو۔لیکن بقیہ لوگ بے بسی کے ساتھ معبد کا انہدام دیکھتے رہے۔طیطس کے فوجی افسران نے انتہائی مہارت کے ساتھ معبد کی بچی کھچی عمارتوں کو زمین بوس کیا۔کہا جاتا ہے کہ خانہ اقدس کی مغربی دیوار ایستادہ رہی۔اس مقام کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہاں خدا آرام کیا کرتا ہے۔یہودیوں کو اس دیوار کے قائم رہنے پر کچھ تسکین ضرور ملی۔(48) لیکن یہ تسکین قیامت خیز المیہ کا مداوا نہیں تھی۔صدیوں تک معبد یہودی دنیا کے دل میں قائم رہا۔ یہودی مذہب کا مرکز تھا۔لیکن ایک بار پھر تباہ کر دیا گیا۔اور اس دفعہ پھر کبھی تعمیر نہ ہونے کے لئے تباہ ہوا۔

===========

حوالہ جات

1۔ جوزیفس، دی جیوش وار 5:146

2۔ سکوتھ 51-B

3۔ جوزیفس، دی جیوش وار 5:210

4۔ جوزیفس، اینسیکیٹز آف دی جیوز 15:396

5۔ جوزیفس، جیوش وار 5:224-25

6۔ B-BATRIA ------- 3B

7۔ جوزیفس، جیوش وار 5:211-17

8. PHILO, The Special Law 1:66.

9. PHILO, QUESTIONS On The EXODUS 2:95.

10۔ جوزیفس، جیوش وار 5:19

11. PHILO, the Special Law 1:96-97

12. E. P. SANDERS, JUDAISM: PRACTICE & Belief, 63 BC to 66 A. D (LONDON 7 PHILADELPHIA, 1992) P. 128

13۔ جوزیفس (اینسیکیٹز 4:205) فیلو (سپیشل لاء 1:70)

14. RAPHAEL PATAI, Man & Temple in Ancient Jewish Myth & Ritual (London 1967) Chapter -3

15۔ یہودی عبادت خانہ صومعہ (SYNAGOGUE)، کنیسہ یا صلوات کا مبدا و منبع تاریکی میں ہے اور اس کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس کا آغاز بیرون فلسطین ہوا لیکن یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کب ہوا۔ صومعہ قدیم دنیا میں ایک منفرد مذہبی ادارہ تھا۔ لیکن تب یہ مذہبی عمارت کی بجائے فلسفیوں کا مکتب محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ یہاں قربانی کی بجائے دعائیں اور مناجات پڑھی جاتی تھیں۔ پہلی صدی قبل مسیح کے دوران یروشلم میں بہت سے صومعے تعمیر ہو چکے تھے۔

16. Avot- 1: 12-13, Sifra - 109B.

B. Batria-9A, Avot do Rabba Nathan-7:17 A; B, B. Tanhuma Noah- 16A,

17. Sanders, Judaism: Practice and Belief, p. 441.

18. II QPS 22, The Dead Sea Scrolls in English (London-1987). p. 212.

19۔ جوزیفس، جیوش وار 1:650-52

20۔ جوزیفس، اینٹیکٹیز 17:206-18

21۔ ایضاً 8:3

22۔ انجیل مرقس 11:15-18، یسعیاہ 56:7، یرمیاہ 7:11

23۔ انجیل مرقس 13:1-2

24۔ انجیل لوقا 22:28-30

25۔ اعمال (نیا عہد نامہ) 5:34-40

26۔ اعمال 2:44-47، انجیل متی 5:25-34

متی، یہودی مسیحیوں کے افکار کا حامی تھا۔ چنانچہ ان کے خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بنا۔ یہودی مسیحی فرقہ اسی کی انجیل کو قابل قبول سمجھتا تھا۔

27۔ گلتیوں (نیا عہد نامہ) 2:6

28۔ انجیل متی، 5: 17-42

29۔ اعمال (نیا عہد نامہ) 6:1

30۔ اعمال 7:1-49

31۔ اعمال 8:1

32۔ اعمال 11:26

33۔ رومیوں 7:14، گلتیوں 3: 10-22

34. JONATHAN Z. SMITH, The Temple and The Mazgician, (LEIDEN-1978).

35۔ فلپیوں (نیا عہد نامہ) 1-2:5

36. MIRCEA ELIADE, PATTERNS IN COMPANRATIVE RELIGION. pp. 26-28

37۔ گلتیوں 2:10، رومیوں 15:25-27

38۔ اعمال 21:26-40

39۔ افسیوں 2:14-21

40۔ عبرانیوں 5:17، 12:22-23

41۔ جوزیفس (ANTIQUITIES) 18: 261-72

42۔ جوزیفس (JEWISH WAR) 6:98

43۔ ڈایوکاسیئس (HISTORY) 66:6

44۔ جوزیفس (جیوش وار) 6:98

45۔ LAMENTATIONS RABBAH 1:50

=============

آٹھواں باب

ایلیا کاپی ٹولینا

کوہ صیہون پر معبد اب ملبے کا ڈھیر تھا۔ خانہ اقدس کی مغربی دیوار کے علاوہ صرف چبوترے کو سہارا دینے والی بڑی بڑی معاون دیواریں ہی رومی حملے میں بچ پائی تھیں۔ معبد کو زمین بوس کرنے کے بعد طیطس کے سپاہیوں نے بالائی شہر کی خوبصورت عمارتوں کا رخ کیا اور پھر ہیرودیس کا پرشکوہ محل بھی زمین چاٹ رہا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ بتاتے ہیں کہ رومن سپاہیوں نے یقیناً بڑی بے رحمی اور ''توجہ'' کے ساتھ سب عمارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ ایک ایک مکان منہدم کیا گیا۔ ملبے کے ڈھیر اس طرح ابھرے کہ پھر کبھی ہٹائے نہ جا سکے۔ وادی اینٹوں، پتھروں اور عمارتوں میں استعمال ہونے والی لکڑیوں کے ٹکڑوں سے اٹ گئی۔ برسات کے دنوں میں پہاڑیوں سے آنے والے گارے کی تہیں ان پر جم گئیں۔ شہر کی تمام دیواریں گر چکی تھیں۔ بالائی شہر کے مغرب میں دیوار کا ایک حصہ بچ گیا جو اجڑے ہوئے شہر کو کسی ماتم گسار کی طرح حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ اسی کے سائے میں رومن فوج کے دسویں لیجن کے سپاہیوں نے اپنے خیمے نصب کر رکھے تھے۔ اس مقام پر ہیرودیس کا محل ہوا کرتا تھا۔ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں کبھی ایک پر رونق شہر آباد تھا۔ رومن شہنشاہ مسلسل اس طرح کے اقدامات کرتے رہے کہ فلسطینی پھر کسی بغاوت کے بارے میں سوچ بھی نہ سکیں۔ 70ء کے بعد کئی سال تک ایسے سکے ڈھالے گئے جن پر ایک یہودی عورت بندھے ہاتھوں کے ساتھ کھجور کے درخت کے نیچے یاس انگیز حالت میں بیٹھی دکھائی گئی تھی۔ شہنشاہ ویسپاسئین (79-70ء) طیطس (81-79ء) دومیشیان (96-81ء) اور ٹراجن (117-98ء)، سب نے یروشلم (کے کھنڈرات) اور فلسطین میں تعینات دسویں لیجن کو حکم دے رکھا تھا کہ بادشاہ داؤد کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہر شخص کو تلاش کر کے قتل کر دیا جائے، لیکن رومن لیجن نے زیادہ سختی نہ دکھائی۔ فلسطین اب رومن سلطنت کا

ایک مکمل صوبہ تھا۔ البتہ بادشاہ اگرپا دوم کو امن برقرار رکھنے کی کوششوں اور روم سے تعاون کرنے کے صلہ میں اپنا خطاب برقرار رکھنے اور گلیلی پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن یہ اجازت صرف اس کو دی گئی اور طے کر دیا گیا کہ اگرپا کی موت کے بعد گلیلی بھی رومی صوبہ میں شامل کر دیا جائے گا۔ فلسطین میں یہودیوں کی تمام زمینیں ضبط کر لی گئیں اور قانونی اعتبار سے اب وہ شہنشاہ کی املاک میں شامل تھیں لیکن عملی طور پر زیادہ تر زمینیں سابقہ مالکان ہی کے قبضہ میں تھیں۔ یہ زمیندار چونکہ

بغاوت کے مخالفین میں سے تھے چنانچہ مقامی رومن حکام نے بھی ان سے نرمی برتی۔

اگرچہ رومنوں نے یہودیوں کے ساتھ زیادہ سختی نہ برتی اور شعوری طور پر نرم پالیسیاں اپنائیں لیکن یروشلم کی تباہی اور رومنوں کی فتح بہرطور یہودیوں کے لیے ذلت و رسوائی کا ذریعہ تھی۔ وہ کسی بھی طرح یہ سب کچھ بھول نہیں سکتے تھے۔ کئی باتیں ایسی تھیں جو انہیں مسلسل اپنی ذلت کا احساس دلاتی رہتی تھیں۔ مثلاً معبد کے نام پر تمام یہودی مردوں سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جو روم میں کیپی ٹولین پہاڑی پر بنائے گئے جوپیٹر کے معبد کے لیے وقف تھا۔ 81ء میں روم میں ہی فتح کی ایک شاندار محراب تعمیر کی گئی جو طیطس کی فتح کی یاد دلاتی تھی۔ اس میں وہ تمام مقدس اشیاء رکھی گئیں جو یروشلم کے معبد سے لائی گئی تھیں۔ ایک صدی بعد بھی پورے تفاخر کے ساتھ دارالحکومت میں ان مقدس اشیاء کی نمائش جاری تھی۔ یہودی ربی الیعاضر کو کہنا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے روم میں یروشلم کے معبد سے لایا گیا پردہ دیکھا تھا جس پر قربانی کے خون کے دھبے ابھی تک موجود تھے۔ کاہن اعظم کا سرپوش بھی دیکھا جس پر "مقدس یہواہ" کے الفاظ کشیدہ تھے۔ (1) یروشلم میں دسویں لیجن کے سپاہی اب آزادی کے ساتھ شاہی عقاب کے پھریرے لہراتے اور کھنڈروں میں اپنے دیوتاؤں کو قربانیاں پیش کرتے تھے۔ انہوں نے بیت حسدا کے تالاب کے قریب جانوس دیوتا کا مندر بھی بنا رکھا تھا۔ (1) یہ دیوتا بیماریوں سے بچانے اور بیماروں کو شفا بخشنے کی قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

یہودی دنیا کا مرکز "یروشلم" اب رومی فوج کی ایک لشکر گاہ تھا۔ دسویں لیجن نے وہاں اپنے طویل قیام کے آثار نہیں چھوڑے۔ غالباً سپاہیوں کی رہائش کے لیے

لکڑی کے گھر یا پھر خیمے استعمال کئے جاتے تھے۔ کچھ سپاہی اور افسران ہیرودیس کے محل کی ان تین عظیم برجیوں، ہپی کس، فیزایل اور ماریامنی میں رہتے تھے جن کو مسمار نہ کرنے کی طیطس نے خصوصی طور پر اجازت دی تھی۔ رومی سپاہیوں کے علاوہ شامی اور یونانی شہریوں کو بھی اس کھنڈر شہر میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ کچھ یہودی بھی موجود تھے جو رومی سپاہیوں کے خیموں کے جنوب میں موجود پہاڑی پر آباد تھے۔ ان چند مکانات کو رومیوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جوزیفس نے غلطی سے اس پہاڑی کو کوہ صیہون لکھ دیا ہے۔ جوزیفس کی تحریر کے وقت لوگ بھول چکے تھے کہ اصل شہر داؤد اوفیل پہاڑی پر آباد کیا گیا تھا۔ کہ (حضرت) داؤد شہر کے بہتر حصے یونی بالائی علاقے میں رہتے تھے کیونکہ جوزیفس کے زمانے میں

بادشاہ اور اشرافیہ کی رہائش اسی جگہ تھی۔ اس مغربی پہاڑی ءکو آج بھی کوہ صیہون کہا جاتا ہے۔ ہم آئندہ اس پہاڑی کو کوہ زیہون لکھیں گے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔

جب یروشلم کے علاقے میں عافیت بحال ہوگئی تو کچھ اور یہودی آ کر کوہ زیہون پر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ اب کوہ صیہون (کے معبد کے مقام) پر عبادت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ ناپاک ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے زیہون کی جنوبی پہاڑی پر سات کنشت (عبادت خانے) تعمیر کر لیے۔ ہماری معلومات کے ذرائع عیسائی مورخین قیصریہ کا یوزیبئس (264-340ء) اور قبرص کا اپی فیئس (315-403ء) ہیں جو مقامی روایات سے آگاہ تھے اور یروشلم کی تباہی کی تفصیلات بتاتے ہیں۔ ان کا

کہنا ہے کہ تباہی کے بعد مسیحی فرقے کے لوگ پیلا سے واپس آ گئے اور کوہ زیہون پر یہودیوں کے پڑوس میں آباد ہو گئے۔ انکی قیادت شمعون (سائمن) کے پاس تھی۔ یہ لوگ انہدام سے بچ رہنے والے مکانوں میں سے ایک مکان میں اکٹھے ہوتے۔ انجیل میں اسے ''بالا خانہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہیں (حضرت) عیسیٰ کے حواریوں نے انہیں دوبارہ زندہ حالت میں دیکھا تھا اور ان کے مطابق یہیں وہ روح القدس سے معمور ہوئے تھے۔ اپی فیئس بتاتا ہے کہ پیلا سے واپسی پر مسیحی فرقہ کے لوگ زیہون کے علاقہ میں ''بالا خانہ'' کے اردگرد آباد ہوئے۔ یہ حصہ رومنوں کی دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا۔ اب ان مکانوں کو راہبوں کی خانقاہیں کہا جانے لگا۔ (3) یوزیبئس اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ یروشلم چرچ، یعنی مسیحی فرقہ کے لوگ ابھی تک یہودیوں کے زیر اثر تھے۔ ان پر ''یہودی بشپ'' حکمران تھے۔ چنانچہ ان مسیحیوں کے بہت سے عقائد اپنے پڑوسی (زیہون کے باسی) یہودیوں کے عقائد پر مشتمل تھے۔ (4) پال کے پیروکاروں کے برعکس وہ یسوع کو خدائی کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو حضرت عیسیٰ کو ان کے بچپن سے جانتے تھے۔ چنانچہ وہ انہیں خدا تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ انہیں ایک انسان کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ''مسیحا'' کے درجہ پر یقیناً فائز تھے۔ غالباً وہ ان مقامات کا احترام ضرور کرتے تھے جن کی نسبت حضرت عیسیٰ سے تھی۔ مثلاً گلگتا کی پہاڑی اور وہ چٹان جس میں بنائی گئی قبر میں وہ دوبارہ زندہ ہو گئے تھے۔ بہت سے یہودی اپنے مقدس بزرگوں کی قبروں پر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ مسیحی فرقہ کے لیے یسوع مسیح کی حیات نو کی یاد منانا ایک فطری بات تھی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے گلگتا کھوپڑی کے مقام، سے پراسرار باتیں منسوب کر دیں۔ ایک یہودی روایت کے مطابق کوہ موریاہ، معبد سلیمانی کے مقام پر حضرت آدم کی تدفین ہوئی تھی۔ دوسری صدی عیسوی میں مسیحی فرقہ والوں نے کہنا شروع کر دیا کہ انہیں (حضرت آدم کو) گلگتا میں دفن کیا گیا تھا۔ اسی لیے وہ اسے ''آدم کی کھوپڑی'' کا مقام کہتے ہیں۔ (5) عیسائیوں نے یروشلم کے متعلق اپنی اساطیر مرتب کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے عقیدہ پیش کیا کہ یسوع مسیح نئے آدم تھے جنہوں نے بنی نوع انسان کو ایک نیا آغاز بخشا ہے۔ یروشلم کے اس المناک دور میں بہت سے یہودی مسیحی فرقے میں شامل ہو گئے۔ غالباً ایک مصلوب مسیحا کے پھر سے جی اٹھنے کے تصور

نے ان کی مذہبی نشاۃ ثانیہ کی امید توانا کر دی تھی۔

بقیہ یہودی رہبانیت کی طرف مائل ہو گئے۔ ربانوی تحریروں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ یہودی گوشت اور شراب پر پابندی چاہتے تھے کیونکہ اب وہ معبد میں خدا کو ان چیزوں کا نذرانہ نہیں پیش کر سکتے تھے۔ زندگی اب پہلے کی طرح تو گزاری نہیں جا سکتی تھی چنانچہ یہودیوں کو اب سوگ اور پرہیزگاری کی مذہبی رسموں کو اپنی تبدیل شدہ حیثیت کا عکاس بنانا تھا۔ معبد کی تباہی ایک گہرا صدمہ تھا۔ تباہی کے تیس سال بعد کتاب بارک کا مصنف کہتا ہے کہ ''تمام دنیا کو سوگ منانا چاہیے۔ اب معبد ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب زمین کو فصلیں پیدا کرنے کی ضرورت نہیں، انگوروں سے شراب کشید کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آسمانوں کی شبنم افشانی اور سورج کو اپنی تابانی ختم کر دینی چاہیے۔''

صیہون کی روشنی تاریکی میں بدل چکی ہے

اب دن کے اجالوں کی کیا ضرورت ہے؟(6)

معبد دنیا کی تفہیم کا ایک ذریعہ اور ایمان کا مرکز تھا۔ اس کے معدوم ہو جانے پر یہودیوں کے لیے زندگی کی نہ تو کوئی قدر و قیمت تھی اور نہ اہمیت۔ چنانچہ ان تاریک دنوں میں بہت سے یہودی اپنا ایمان گنوا بیٹھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کہ یہودیوں نے اپنی زندگیوں میں سے معبد کو نکال دیا۔ وہ یہودی جو دوسرے ذرائع سے خدا کی موجودگی کو محسوس کر لیتے تھے۔ ان کی عقیدت بھی یروشلم اور اس کے مقدس مقام کو اپنے مذہب میں مرکزی حیثیت دیتی تھی۔ یہودیوں کو اپنے تباہ کن نقصان سے نکلنے کے لیے تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

یروشلم کے محاصرہ کے دوران فریسی ربی یوہانن بن ذکائی کو ایک تابوت میں چھپا کر شہر سے باہر سمگل کر دیا گیا۔ فریسیوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی انقلابی انتہا پسندوں زیلٹس کا شدید مخالف تھا۔ 73ء میں رومنوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے زیلٹس کا اجتماعی خودکشی کا اقدام یوہانن کے نزدیک یہودی

تعلیمات کے منافی تھا۔ اس کی اعتدال پسندی کے نتیجے میں وہ اور اس کے ساتھ معبد کی تباہی کے بعد یہودیوں کی قیادت سنبھالے رکھنے کے حقدار ٹھہرے۔ ربی یوحانن نے شہنشاہ ویسپاسیئن سے رابطہ کیا اور درخواست کی کہ ایک مدرسہ قائم

کرنے کی اجازت دی جائے جہاں یہودیوں کو پڑھنے اور عبادت کرنے کے مواقع مل سکیں۔ اس کا اصرار تھا کہ یہ ایک روحانی مرکز ہو گا جو کسی بھی طرح انقلابی خیالات کو فروغ دینے کا ذریعہ نہیں بنے گا۔ چنانچہ اسے ساحلی علاقے میں ایک درس گاہ یوناہ کے نام سے بنانے کی اجازت دے دی گئی۔ یہاں یوہانن اور اس کے ساتھی ربیوں نے جو معبد میں کاہنوں کے فرائض سرانجام دے چکے تھے، ایک نئی یہودیت کی تشکیل کا کام شروع کر دیا۔ جب 586 ق م میں یہودیوں کو معبد سے محروم اور جلاوطن ہونا پڑا تھا تو انہوں نے توریت کے مطالعہ میں پناہ لے لی تھی۔ اب یوناہ اور اسی قسم کی درسگاہوں میں جو

فلسطین اور بابل میں قائم ہو چکی تھیں، ربیوں نے جو ''تنائیم'' کہلاتے تھے ان زبانی قوانین کو باقاعدہ ضابطہ کی شکل دینا شروع کر دی جو صدیوں کے دوران بنی اسرائیل کے انبیاء نے وضع کئے تھے۔ بالاخر یہ مجموعہ قوانین مرتب ہو گیا اور اسے مشنہ کہا گیا۔ علامتی انداز میں یہ ایک نیا یروشلم تھا جس کے مطالعہ کے دوران یہودی خدا کی موجودگی محسوس کر سکتے تھے اور خود کو خدا سے مربوط سمجھتے تھے۔ یہ کیفیت مشنہ کا مطالعہ کرنے والے پر کسی بھی جگہ طاری ہو سکتی تھی۔ ربیوں نے یہودیوں کو یقین دلا دیا کہ جہاں بھی یہودیوں کا ایک گروہ مل کر توریت کی تلاوت یا مطالعہ کرے گا وہاں ''شکینہ'' (زمین پر خدا کی موجودگی) ناگزیر ہے۔(7) بہت سے قوانین کا تعلق معبد میں ادا کی جانے والی مذہبی رسوم سے تھا۔ چنانچہ آج تک جب بھی یہودی مشنہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ معدوم معبد کی تعمیر نو کے تصور میں کھو جاتے ہیں جو انہیں خدا سے رابطہ اور آخری فتح سے سرفراز کرے گا۔ جب تنائیم نے اپنا کام مکمل کر لیا تو ان ربیوں کو اموارئیم کا نام دے دیا گیا۔ نام کے ساتھ ساتھ ان کا کام بھی بدل گیا۔ اب وہ مشنہ کے مفسر تھے۔ قوانین شریعت پر بحث مباحثہ تالمود کے ذریعے فیصل کیا جاتا۔ دراصل مشنہ کے بعد مزید تعبیری و توضیحی کام گیمارا کے تحت اکٹھا کیا گیا اور
مشنہ میں گیمارا کو شامل کر کے اسے تالمود کا نام دے دیا گیا۔ توضیح و تفسیر کی کتابیں علامتی معبد کی دیواریں تھیں جو خدا کی موجودگی کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ مطالعہ کے دوران راسخ العقیدہ یہودی پوری طرح خدا کی موجودگی کو محسوس کر لیتا تھا۔

ربیوں نے اجتہاد کیا اور لوگوں کو یقین دلایا کہ معبد میں خدا کی خوشنودی کے لیے پیش کی جانے والی قربانیوں کا متبادل رحم و مروت ہے۔ جانوروں کو قربان کرنے کی بجائے انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم کا رویہ خدا کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔

''ایک دفعہ ربی یوحانن بن ذکائی یروشلم سے باہر نکل رہا تھا۔ ربی
یشوع اس کے پیچھے تھا۔ اس نے معبد کے کھنڈرات کو حسرت سے
دیکھتے ہوئے یوحانن سے کہا۔۔۔ کیا المیہ ہے۔۔۔ اسرائیل کے
گناہوں کا کفارہ جس جگہ ادا کیا جاتا تھا وہ کھنڈر بن چکی ہے۔
میرے بیٹے۔۔۔'' ربی یوحانن نے کہا۔۔۔ ''غم نہ کرو۔۔۔ ہم کفارہ
ادا کر سکتے ہیں۔۔۔ لوگوں سے رحم و مروت کا برتاؤ کر کے۔۔۔ میں
تو قربانی کی جگہ رحم کو افضل سمجھتا ہوں۔''(8)

جذبہ ترحم کا عملی اظہار اگرچہ ایک عرصہ سے صیہون کے مذہب کا ضروری حصہ رہا تھا۔ لیکن اب انسانی ہمدردی کا

عمل اسرائیلیوں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ یہ ایک انقلابی تصور تھا کیونکہ قدیم دنیا میں کسی قسم کی قربانی کے بغیر مذہب ادھورا سمجھا جاتا تھا۔ اب چونکہ معبد نہیں تھا چنانچہ ربی اپنے پیروکاروں کو سمجھاتے تھے کہ خدا کی موجودگی اپنے اردگرد محسوس کرو۔ وہ توریت کی تعلیم دیتے ہوئے بتاتے کہ۔۔۔ جو اپنے پڑوسی سے اپنی طرح محبت کرے گا وہ خدا کی رحمت و برکت کا حقدار ہوگا۔ پڑوسی سے محبت کرنا، توریت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک تھا۔(9) کسی انسان کو دکھ دینا خدا کے انکار کے مترادف تھا کیونکہ اس نے عورتوں اور مردوں کو اپنی شباہت پہ تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ انسان کا قتل یہودی قوانین میں محض ایک جرم نہیں خدا کی بے حرمتی تھا۔(10) خدا نے ابتدائے آفرینش میں صرف ایک انسان تخلیق کیا تھا۔ اس طرح بنی نوع انسان کو سکھا دیا گیا تھا کہ جس کسی نے ایک انسان کو قتل کیا اس کو اسی طرح سزا ملے گی جیسا کہ اس نے پوری دنیا کو تباہ کیا ہے۔(11) اسی طرح ایک فرد کو بچانا پوری دنیا کو بچانے کا مقدس عمل تھا۔ کسی فرد کی تضحیک کرنا، چاہے وہ غلام ہو یا کافر، خدا کے تصور کو مسخ کرنے کے مترادف تھا۔(12) یہودیوں کو باور کرایا جاتا تھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کا طرز عمل اعلیٰ تر ہونا ضروری ہے۔ اب خدا کسی مقدس مقام پہ ظاہر نہیں ہوگا یہودیوں کو اس کی موجودگی اپنے اردگرد انسانوں میں تلاش کرنا ہوگی۔ فریسی ہمیشہ سے ہی انسانی ہمدردی کی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے۔ معبد کے خاتمہ نے انہیں تقدیس کے انسانی تصور کو فروغ دینے

کے قابل کر دیا تھا۔ چنانچہ اب انسانی عظمت، احترام اور تقدیس مذہب کی بنیاد بن رہے تھے۔

ربیوں نے ابھی ہمت نہیں ہاری تھی، وہ مسلسل اس امید میں تھے کہ ان کا معبد پھر تعمیر ہوگا۔ جب پچھلی مرتبہ معبد تباہ ہوا تھا تو تمام تر مشکلات کے باوجود تعمیر نو ممکن ہوگئی تھی۔ لیکن اب وہ سمجھتے تھے کہ تعمیر نو کا کام خدا کے سپرد کر دینا ہی دانشمندی ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہودی یروشلم کو بھول جائیں۔ ربیوں نے ایسے قوانین جمع کئے جو فلسطین سے یوہدیوں کی نقل مکانی کی حوصلہ شکنی کرتے اور مطالبی کرتے تھے کہ صبح وشام کی قربانی کی جگہ روزانہ اٹھارہ مناجاتیں دن میں تین بار تلاوت کی جائیں۔ یہودی جہاں بھی ہوں، ان مناجاتوں کی تلاوت ضرور کریں۔ اگر وہ سفر کر رہے ہوں تو عبادت کے وقت سواری سے اتر جائیں۔ اپنا رخ یروشلم کی طرف کر لیں یا کم از کم اپنے دلوں کا رخ تباہ شدہ خانہ اقدس کی طرف کر لیا کریں۔(13) یہ مناجاتیں ظاہر کرتی ہیں کہ تباہی و بربادی کے باوجود یروشلم اب تک خدا کا مسکن تھا۔

''اے مالک، اے خدا، تیرا عظیم رحم و کرم ہو اسرائیل پر جو تیری قوم ہے، یروشلم پر جو تیرا شہر ہے، صیہون پر جو تیری عظمت وجلال کا مستقل مقام ہے۔ اور معبد پر اور معبد کے ساکنوں پر اور داؤد کے گھرانے کی بادشاہت پر جو تیری برکت سے معمور ہے۔ اے خدا، اے مالک تو یروشلم کے معماروں پر اپنی رحمتیں نازل کر۔۔۔''(14)

کچھ ربیوں کا خیال تھا کہ شیکنہ ابھی تک خانہ اقدس کی مغربی دیوار کے ساتھ آویزاں ہے۔ اور اسی کی بدولت یہ دیوار تباہی سے بچ گئی ہے۔(15) بقیہ ربیوں کا خیال تھا کہ شیکنہ متذبذب انداز میں بتدریج سرکتی ہوئی یروشلم سے باہر جا چکی ہے۔

یہ تین سال تک مسلسل کوہ زیتون پر رہی اور دن میں تین بار چلاتی تھی ۔(16) یہودیوں کو یاد تھا کہ حزقی ایل نے ایک رویا میں یہواہ کے جلال کو یروشلم میں کوہ زیتون کے اوپر واپس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ یہودی اب بھی کوہ زیتون پر جمع ہو جاتے اور خدا کی واپسی کی راہ دیکھتے۔ یہ انتظار ان کے ایمان کا حصہ تھا۔ جسے وہ کبھی خود سے الگ نہ کر سکے۔

بقیہ یہودی تیزی سے اپنی روحانی تسکین کے لئے تصوف کی طرف چلے گئے یہ روحانیت کی ایک ایسی شکل تھی جس پر ربی اعتماد نہیں کرتے تھے۔لیکن صوفیا کو خدا کے آسمانی تخت کی طرف اپنی روحانی پروازوں، رویا اور ربانوی یہودیت میں کوئی عدم مطابقت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اپنی رویا کو درسگاہوں کے ممتاز ربیوں سے منسوب کرتے تھے۔ معبد کے خاتمہ کے بعد یہواہ کے تخت کا تصور ایک نئی اور مکمل طور پر نئی صورت کا تقاضا کرتا تھا۔اب کشف الہام اور رویا میں خدا کے ارضی مسکن یعنی معبد اور ارضی تخت یعنی تابوت یہواہ کی بجائے آسمانی تخت کی ضرورت تھی۔آسمانی تخت کی زمینی نقل تو معدوم ہو چکی تھی لیکن حقیقی تخت آسمانوں پر موجود تھا۔ یہ نا قابل شکست تھا اور یہودی اپنی روحانی پروازوں میں اس تک پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ باروک ۔2 کا مصنف جو معبد کی تباہی کے تیس سال بعد حالات رقم کر رہا تھا، اصرار کرتا ہے کہ آسمانی یروشلم ازلی و ابدی ہے۔ یہ وقت کی ابتدا سے بھی پہلے خدا کے ساتھ تھا۔۔۔۔۔''جب میں نے جنت تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا تو میں اسے پہلے سے تیار کر چکا تھا'' یہ ہمیشہ سے خدا کی ہتھیلیوں پر نقش تھا اور ایک دن یہ آسمانی حقیقت زمین پر پھر اترے گی۔(17) یہ ایک بار پھر اپنی طبعی حالت میں نمودار ہوگا اور پرانے مقدس مقام پر ہی ظاہر ہوگا۔ پھر خدا اپنی قوم کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں رہائش رکھ لے گا۔تقریباً انہی دنوں جب باروک کا مصنف مصروف تحریر تھا۔خنوک ۔4 کے مصنف نے بھی آسمانی یروشلم کی تجسیم کی رویا دیکھی۔''ارضی صیہون تباہی سے دوچار ہو چکا ہے لیکن آسمانی صیہون ابھی تک زندہ و تابندہ ہے اور خدا کے ساتھ ہے۔ایک دن یہ شہر جو آج کل نظر نہیں آتا، پھر سے نمودار ہوگا۔(18) ''یہ نیا یروشلم جنت ارضی ہوگا'' جو لوگ اس میں رہ رہے ہوں گے وہ خدا سے مکمل یگانگت کا لطف اٹھائیں گے۔ گناہ ختم ہو جائیں گے اور موت حتمی فتح کے نتیجہ میں ہمیشہ کیلئے مر جائے گی۔(19) جدائی کی اذیت، نقصان، رنج والم اور بربادی جو 70ء میں یہودی دنیا کا مقدر بن گئے تھے، وہ تحلیل کر دیئے جائیں گے اور جنت کی ابدی خوشیاں اور راحتیں غالب آجائیں گی۔

عیسائی بھی تخت کی رویا دیکھ رہے تھے۔شہنشاہ دومیشیان کے دور میں جب عیسائیوں (مسیحی یہودیوں) کو رومن حکام اذیتیں دے رہے تھے ایک خانہ بدوش واعظ ''یوحنا'' نے آسمانی معبد کی رویا دیکھی۔اس معبد میں عیسائی شہدا نئے کاھن تھے۔انہوں نے سفید براق لبادے پہن رکھے تھے اور تخت کے اردگرد مقدس خدمات سرانجام دے رہے تھے۔اس نے سکوتھ کے تہوار کی آسمانی رسوم کا مشاہدہ کیا لیکن ان رسوم اور پرانی رسوم میں واضح قسم کا فرق تھا۔ دوسرے معبد میں خانہ اقدس ہمیشہ خالی رہا تھا۔تخت یہواہ گم ہو چکا تھا چنانچہ جب بابلیوں کی تخت و تاراج کے بعد یروشلم کا معبد دوبارہ تعمیر ہوا تو خانہ اقدس خالی رہتا تھا۔ یوحنا نے انہی رویا میں دیکھا کہ خانہ اقدس میں تخت پر خدا کے ساتھ حضرت عیسیٰ بیٹھے ہیں۔

عیسائیوں کی نظر میں یہ پرانے صیہونی مذہب کی تکمیل تھی۔لیکن یہ عیسائی ابھی تک اپنے ہم عصر یہودیوں کے ان عقائید اور امیدوں میں شریک تھے کہ حتمی فتح کا دن آنے والا ہے اور اس دن آسمانی یروشلم زمین پر اتر آئے گا۔اپنی آخری رویا میں یوحنا نے دیکھا کہ مقدس شہر آسمان سے زمین پر اتر رہا ہے اس سے خدا کے جلال کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ (20) اس نئے یروشلم میں کوئی معبد نہیں تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ نے معبد کی جگہ لے لی تھی۔خدائی بندہ اب خدا کے جلال کا مظہر تھا۔لیکن یروشلم اب بھی اتنی طاقتور علامت تھا کہ یوحنا عارف جیسے مسیحی بھی خدا کے آخری ظہور میں یروشلم کے بغیر مکمل نجات کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔آسمانی شہر نے زمین پر اس لئے اترنا تھا کہ اس کے بغیر خدا کی بادشاہت مکمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔آخر کار ارضی جنت کو بحال ہونا تھا اور زندگی کے دریا کو خدا کے تخت کے عقب سے چھوٹ کر اس طرح دنیا کو سیراب کرنا تھا کہ تمام دنیا کے رنج والم دور ہو جائیں۔(21)

یہودی اور عیسائی اپنے خدا کو ایک جیسے انداز میں دیکھ رہے تھے وہ بالترتیب یروشلم اور حضرت عیسیٰ کو تقدس کی علامتیں قرار دیتے تھے۔عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں اسی طرح سوچنا شروع کر دیا تھا جس طرح آسمانی تخت کے منتظر یہودی صوفیا حتمی نجات کے لئے یروشلم کے بارے میں سوچتے تھے۔مثلاً وہ یروشلم کو ایک مجسم آسمانی حقیقت سمجھتے تھے جو ابتدا سے خدا کے ساتھ ہے اور جب وہ زمین پر اترے گا تو گناہ، موت، انتشار اور مایوسی سے نجات مل جائے گی۔ لیکن اس مشابہت کے باوجود یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک دوسرے کو حریفانہ انداز میں دیکھنا شروع کر دیا۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔کھنڈر یروشلم میں کوہ زیہون پر کوئی کافر عیسائی نہیں رہتا تھا۔وہاں رہنے والے یہودی اور عیسائی اس یروشلم میں دلچسپی رکھتے تھے جو یوحنا عارف نے اپنی رویا میں دیکھا تھا۔انہیں اس کھنڈر یروشلم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ متی، لوقا اور یوحناز کی انجیلیں 80 اور 90 کے عشرے میں لکھی گئیں۔ان کے مطالعہ سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سینٹ پال کا نکتہ نظر رکھنے والے عیسائی یروشلم اور یوہدی لوگوں کو احترام کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لوقا، یہودیوں کے نزدیک کافر تھا۔لیکن سابقہ عقیدے کے لئے سب سے زیادہ مثبت رویہ یہی رکھتا تھا۔اس کی انجیل کا آغاز اور اختتام یروشلم میں ہوتا ہے۔اس کی ابتدا زکریا، یوحنا بپتسمہ دینے والے کے باپ کی رویا سے ہوتی ہے جو اسے ہیکل میں دکھائی دی۔اور انجام یروشلم کو واپس آنے والے حواریوں کے ذکر کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو دوبارہ زندہ ہو جانے کے بعد کوہ زیتون سے آسمان کو صعود کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

اور وہ اس کو سجدہ کر کے بڑی خوشی سے
یروشلم کو لوٹ آئے۔۔۔۔۔اور ہر وقت
ہیکل میں حاضر ہو کر خدا کی حمد کیا کرتے تھے۔(22)

لوقا کے لئے تسلسل بہت اہم ہے کیونکہ زمانہ قدیم میں لوگ تسلسل چاہتے تھے نئی باتیں اور اختراعات ان کے نزدیک مشکوک ہوتی تھیں۔ مذہبی لوگوں کے لئے تو خاص طور پر یہ جاننا ضروری ہوتا تھا کہ کیا ان کا عقیدہ ماضی کے مقدس واقعات سے مربوط ہے؟ چنانچہ لوقا نے سینٹ پال کی طرح یروشلم اور یہودیت سے پوری طرح تعلق توڑنا مناسب نہیں سمجھا ۔حضرت عیسیٰ اپنے شاگردوں کو حکم

دیتے ہیں کہ اپنی تعلیمات کی تبلیغ کا آغاز مقدس شہر سے کریں۔ جو ابھی تک دنیا کا مرکز ہے اور جہاں ہر نبی نے اپنے انجام کو پہنچنا ہے۔ ''رسولوں کے اعمال'' میں لوقا اپنے ہیرو سینٹ پال کو یروشلم کلیسیا کا انتہائی معزز و محترم رکن اور جیمز زادک کا عقیدت مند دکھاتا ہے۔اس ابتدائی تعاون کو لوقا بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس تلخی کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے جس نے پال اور جیمز کے تعلقات کو ایک خاص سمت عطا کی۔لوقا، پال کو اسی طرح دکھاتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ اس سے پہلے یروشلم کا سفر اختیار کرتے ہیں اور خطرات کے باوجود یروشلم میں آجاتے ہیں لیکن لوقا کو صاف صاف نظر آرہا تھا کہ عیسائی یروشلم میں قیام نہیں کر سکتے۔ انہیں انجیل کو لے کر تمام یہودیہ اور سامریہ اور پھر وہاں سے دنیا کے آخری کونے تک لے جانا ہوگا۔(23) لوقا عیسائیت کو اپنا پسندیدہ نام ''راستہ'' دیتا ہے۔بنی نوع انسان کی نجات کا راستہ۔۔۔۔''یسوع کے پیروکار مسلسل سفر میں رہنے والے ہیں۔اس دنیا میں ان کا کوئی مخصوص شہر نہیں ہے۔''

متی اور یوحنا، یروشلم اور یہودی لوگوں کے لئے بہت کم مثبت رویہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں یہودیت سے منحرف ہو کر سینٹ پال کے مسلک ہیں شامل ہوئے تھے۔ان کی تحریریں ایسے اختلافات میں سے کچھ کا اظہار کرتی ہیں جو آج بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان حضرت عیسیٰ اور یروشلم کے بارے میں موجود ہیں۔متی ارض صیہون کے بارے میں کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں۔اس کے نزدیک یہ پہلے بھی مقدس مقام تھا۔وہ اکلوتا انجیل نویس ہے جو یروشلم کو مقدس شہر نے حضرت عیسیٰ کو ٹھکرا دیا اور سلیب پر چڑھا دیا۔حضرت عیسیٰ اس امر کی پیش بینی کرے ہوئے شہر کی تباہی کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔چنانچہ متی کے ہاں یروشلم ایک مجرم شہر ہے۔جب متی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تباہی کی پیشن گوئی کا ذکر کرتا ہے جو 70ء میں پوری ہوئی تو وہ اس کا تعلق اس قیامت سے جوڑتا ہے جو دنیا کے خاتمہ کے وقت برپا ہوگی۔ وہ یروشلم کی تباہی کو ایک ایسے

معاوی واقعہ کی نظر سے دیکھتا ہے جو حضرت عیسیٰ کی پرجلال واپسی کا نقیب ہے۔(24) جب حضرت عیسیٰ شہر سے باہر گلگتا کی پہاڑی پر وفات پاتے ہیں تو ہیکل کو خانہ اقدس سیالگ کرنے والا پردہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔یعنی معبد کا پرانا مذہب منسوخ کر دیا گیا۔یوحنا اس بات پر زیادہ سختی سے زور دیتا ہے۔اس وقت کئی اور لوگوں کی طرح،اس نے اصرار کیا کہ اب خدا کسی معبد میں نہیں ملے گا بلکہ کسی خدائی اوصاف رکھنے والے بندے میں ملے گا۔اپنی انجیل کے آغاز میں وہ دعوی

کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کلام الہٰی ہیں۔ خدا نے کلام کے ذریعے یہ دنیا تخلیق کی یہ آسمانی حقیقت اب زمین پر اتر آئی ہے۔ اس نے گوشت پوست کا روپ دھار کر بنی نوع انسان پر خدا کا جلال ظاہر کیا ہے۔(25) یوحنا کی تحریریں یونانی زبان میں ہیں۔ یونانی زبان میں عبرانی اصطلاح ''شینہ'' کا مترادف نہیں ہے جو یہودی لوگ خدا کی ماورائی حقیقت کو واضح کرنے کیلئے استعمال میں لاتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو مجسم کلام کی صورت میں اور خدا کے جلال کی صورت میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ یوحنا انہیں انسانی صورت میں شیکنہ کی حیثیت سے بھی دیکھتا ہے۔(26)

متی کی طرح یوحنا بھی یہودیوں کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اپنی انجیل میں وہ بار بار انہیں حضرت عیسیٰ کو ٹھکراتے ہوئے دکھاتا ہے۔ یوں دونوں انجیل نویس یہودیوں کے خلاف ایسی دشمنی اور مخاصمت کی بنیادیں استوار کرتے ہیں جنہوں نے عیسائیت کی تاریخ میں بعض انتہائی شرمناک واقعات کو جنم دیا۔ ہم دیکھیں گے کہ بتدریج عیسائیوں کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ وہ اپنے مذہبی پیشرؤں سے چشم پوشی کرتے رہیں اور پھر وہ بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ان کے اپنے عقائد کی بقا یہودیت کی شکست پر ہے۔ چنانچہ یوحنا واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے مشن کا آغاز معبد کے مذہب کو مسترد کر کے کیا۔ وہ انجیل میں دکھاتا ہے کہ حضرت عیسی یروشلم کے معبد میں جاتے ہیں اور صرافوں (منی چینجرز) اور قربانی کے پرندے بیچنے والوں کو صحن سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ اپنے مشن کے آغاز میں کرتے ہیں، اختتام پر نہیں۔ وہ یہودیوں کو کہتے ہیں۔ ''اس مقدس کو مسمار کر دو۔ میں اسے تین دن میں دوبارہ کھڑا کر دوں گا۔'' یہ بات علامتی انداز میں کہ گئی تھی۔ یوحنا بتاتا ہے کہ یہ بات یسوع نے اپنے بند کے مقدس (معبد) کے بارے میں کہی تھی۔(27) ''پس جب وہ مردوں میں سے جی اٹھا تو اس کے شاگردوں کی یاد آیا کہ اس نے یہ سب کہا تھا'' چنانچہ اس کے بعد معبد کی جگہ پھر سے زندہ ہو جانے والا کلام (یسوع) ہی ایسی چیز تھا جس میں لوگوں کو خدا کی موجودگی ملی۔ ابتدا ہی میں حضرت عیسیٰ اور یہودیت کے انتہائی مقدس اداروں کے درمیان کشمکش چھڑ گئی تھی۔ حضرت عیسیٰ نے وضاحت کر دی تھی کہ یروشلم، کوہ گرزیم اور بیت ایل جیسے مقدس مقامات متروک و منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔(28) شیکنہ معبد اور اس کے مضافات سے اٹھا لی گئی ہے۔ لیکن اس الہام کو مسترد کرنے والوں نے خود کو تاریکی کی قوتوں کے ساتھ وابستہ کر لیا۔(29)

یروشلم میں جنم لینے والے بعد کے واقعات میں عیسائیوں کو یقیناً خدا کا ہاتھ نظر آیا ہوگا۔ 118ء میں رومن جرنیل پبلیوس ایلیئس ہیڈریانس، شہنشاہ بن گیا۔ تخت نشین ہونے والے تمام رومن حکمرانوں میں یہ سب سے زیادہ قابل آدمی تھا۔ اس نے رومن سلطنت کو مزید وسیع کرنے کی بجائے اسے مستحکم کرنے پہ توجہ دی۔ ہیڈریان ایک مضبوط اور متحدہ سلطنت کا خواہاں تھا۔ وہ ایک ایسی رومن سلطنت تعمیر کرنا چاہتا تھا جس میں تمام شہری بلاتفریق رنگ و نسل اخوت کا مظاہرہ کریں۔ اپنے نصب العین کو مشتہر کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کا ایک ذریعہ اس نے یہ سوچا کہ تمام تر سلطنت میں شاہی خاندان کے رابطے بڑھائے جائیں۔ ہیڈریان کا اپنا زیادہ تر وقت شاہراہوں پر گزرا۔ وہ سلطنت کے مختلف حصوں کا دورہ کرتا رہا۔

اس کے دوروں میں مصاحبین کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ رہتی۔ اس نے رعایا کو تاثر دیا کہ اس کا کوئی مخصوص دارالحکومت نہیں۔ سلطنت کے تمام حصے اس کے لئے یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور وہ ایک متحرک دارالحکومت کے ساتھ عوام میں موجود رہنا چاہتا ہے۔ وہ جس شہر میں جاتا لوگوں کی درخواستیں وصول کرتا، ان کے مسائل موقع پر حل کرتا اور مقامی لوگوں میں تحائف تقسیم کرتا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگوں میں ایک مہربان، دریا دل اور عوام دوست حکمران کا تاثر قائم کرے اور اس طرح ایک مضبوط حکومت قائم رہے۔ اس نے کوشش کی کہ جس جگہ کا دورہ کرے وہاں اس کی آمد کی شاندار یادگار بنائی جائے تا کہ وہ اپنی عدم موجودگی میں لوگوں کے دل و دماغ میں موجود رہے۔ چنانچہ اس نے ایتھنز، انطاکیہ، کورنتھ اور قیصریہ میں زیوس دیوتا کے معبد بنوائے۔ یہ ایک طرح سے روم کے ساتھ مقامی لوگوں کا ٹھوس رابطہ اور عوام کے لئے شہنشاہ کی جود و سخا کا ایک ذریعہ تھے۔ ہیڈریان 130ء میں یروشلم میں آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ یہودیہ کے عوام کو شہنشاہ کی طرف سے تحفہ میں ایک نیا شہر دیا جائے۔ فیاض اور اولوالعزم شہنشاہ نے یروشلم کے کھنڈرات اور فوج کے ویران کیمپ کی جگہ ایک جدید عروس البلاد شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اس کا نام ایلیا کاپی ٹولینا تجویز کیا گیا۔ تا کہ یہ شہر اس کے نام کے ساتھ ساتھ رومی دیوتا جیوپیٹر کے مندر، کاپی ٹول کی نسبت بھی رکھے۔ غالباً ہیڈریان اس شہر کو کاپی ٹول کے دیوتاؤں کی سرپرستی میں دینا چاہتا تھا۔

ہیڈریان کا منصوبہ دیکھ کر یہودی خوف سے لرز گئے۔ ہیڈریان نے اعلان کیا تھا کہ روم میں کوہ وٹارپیان پر جوپیٹر کے مندر کے طرح کوہ صیہون پر بھی اس کا ایک مندر تعمیر کیا جائے گا۔ ظاہر ہے یہ جگہ یہواہ کے معبد کے لئے مخصوص تھی۔ صیہون کے علاوہ شہر میں کئی اور مقامات پر دیوتاؤں کے مندر و معبد تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی سامنے آیا۔ صدیوں سے صیہون اور یروشلم کے نام پوری دنیا میں یہودیوں کی شناخت بن چکے تھے۔ یہ دونوں نام ان کے خدا سے وابستہ تھے۔ اب ان کو ایک کافر شہنشاہ اور اس کے دیوتاؤں کی نسبت دی جانے والی تھی۔ یہودیوں کا زیروشلم اگرچہ ساٹھ سال سے کھنڈروں مین تبدیل ہو چکا تھا لیکن اس کی نسبت بہرطور یہواہ سے تھی۔ اب انکھنڈروں کو بھی ایک شہنشاہ کے حکم پر صفحہ ہستی سے مٹایا جا رہا تھا۔ اس کا ایک ہو مطلب تھا کہ مقدس شہر اور یہواہ کا معبد اب کبھی تعمیر نہیں ہو سکیں گے۔ وہسب کچھ جو یہودیوں کو اپنی پہچان دیتا تھا پھر کبھی نظر نہں آتے گا۔ ماضی میں یروزلم کے لوگوں نے کئی بار جنگ اور تباہی دیکھی تھی۔ کم از کم دو دفعہ حملہ آور فوجوں نے شہر کو زمین بوس کر دیا۔ متعدد باران کا معبد ناپاک اور دیواروں مسمار ہوئیں لیکن پھر سب کچھ بحال ہوتا رہا۔ اب یہ پہلا موقعہ تھا کہ شہر کی تعمیر کا اقدام سراسر معاندانہ اور ان کی خواہشات کا قاتل ثابت ہور ہا تھا۔ شہر کی تعمیر کا کام یروشلم میں ہمیشہ ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر سرانجام دیا گیا۔ یہ کام انتشار، ہلاکت اور بربادی کو دور کرنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ لیکن اب تعمیر شہر فاتح شہنشاہ کے ہاتھوں میں ایک ہتھیار تھا۔ ایلیا کاپی ٹولینا یہودی یروشلم کی تضحیک بن جائے گا پرانے یروشلم کے خدوخال یہودیوں کی روحانی شناخت اور تسکین تھے۔ اب یہ رومی یروشلم کے در و دیوار میں تحلیل ہو جائیں گے۔

شہر کی تعمیر نو یہودیوں کے نزدیک تخلیق کی نفی تھی۔ ابتدائے آفرینش کا انتشار وافتراق ایک بار پھر غالب آجائے گا۔لیکن بہر صورت تاریخ میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ یروشلم کے شکست خوردہ لوگوں نے اپنے عزیز
ترین مقامات ونشانات کوایک دشمن قوت کے نشانات ،عمارتوں اورگلیوں کے نیچے غائب ہوتے ہوئے دیکھااور محسوس کیا کہ شہر کی اپنی ذات ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئی ہے۔

MAP (نقشہ)

برکوکب کی طرف سے لکھا گیا آرامی زبان میں خط کا عکس۔اس میں یہودیوں کو کھجوروں کی شاخوں ،مہندی کے سفید پھولوں ،ترش پھلوں اور بید کی شاخوں کے لئے درخواست کی گئی ہے تا کہ سکوتھ کا تہوار منایا جائے۔ برکوکب غالباً معبد کے کھنڈرات پر پرانی مذہبی رسوم کا احیا چاہتا تھا۔

لیکن ہیڈریان کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ یروشلم کے عوام کے ردعمل سے باخبر ہی نہیں تھا۔ ورنہ وہ ان نوحہ کناں کھنڈرروں کی جگہ ایک خوشنما جدید شہر تعمیر کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتا۔ ہیڈریان کا خیال تھا کہ شہر کی تعمیر نو کا کام لوگوں کو روزگار فراہم کرے گا اور علاقے میں نئی خوشحالی آئے گی۔ اگر کھنڈرات جوں کے توں موجود رہتے ہیں تو یہ لوگوں کو پرانی دشمنی یاد دلاتے رہیں گے۔ سلطنت میں اخوت و یگانگت کی فضا قائم کرنے کے لئے انکا خاتمہ اور نئے شہر کا وجود اسے ضروری محسوس ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہودی اور رومی مل کر کام کریں گے۔ اپنے ماضی کی تلخیوں کو پیچھے چھوڑ کر علاقے میں امن وخوشحالی کے نئے سفر پر گامزن ہو جائیں گے۔ ہیڈریان کو یہودیت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اسے ایک فرسودہ مذہب سمجھتا تھا۔ یہودیوں کی سرکش فرقہ پسندی شہنشاہ کے خواب (ثقافتی طور پر متحدہ سلطنت) کی تعبیر کے راستے میں ایک رکاوٹ تھی۔ چنانچہ یہ طے کر لیا گیا کہ اگر ضروری ہوا تو انہیں بالجبر جدید دنیا میں شامل کیا جائے گا۔ ہیڈریان پہلا فرماں روا نہیں تھا جس نے ترقی اور جدیدیت کے نام پر ایسی روایات کو ملیامیٹ کیا جو کسی قوم کی شناخت کا ذریعہ تھیں۔ 131ء میں اس نے ایسے احکام جاری کئے جن کے تحت یوہدیوں کو اپنی مخصوص رسوم ترک کرنے اور رومی ویونانی دنیا کے دیگر لوگوں کے رسم ورواج کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھالنے کا پابند بنایا گیا۔ ہیڈریان کے خیال میں ختنہ ایک وحشیانہ عمل تھا چنانچہ ختنہ، ربیوں کی ماموری، توریت کی تعلیمات اور یہودیوں کے اجتماعات کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ یہودیوں کی بقا پر یہ

ایک شدید ضرب تھی۔ جب یہ فرامین جاری ہو گئے تو انتہائی معتدل مزاج ربی بھی محسوس کرنے لگے کہ روم کے ساتھ ایک اور جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔

اس دفعہ یہودی بے خبری میں مارے جانے پر تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی نئی تحریک نہایت خاموشی اور تمام تر باریکیوں کو مدنظر رکھ کر منظّم کی۔ جب تک مکمل تیاری نہ ہو گئی۔ کہیں بھی کسی تصادم کا موقع نہ پیدا ہونے دیا گیا۔ بغاوت کی قیادت ایک تند خو جنگجو شمعون برکوسیبا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دی اور جب معرکہ آرائی شروع ہوئی تو کسی ایک مقام پر باقاعدہ جنگ کی صورت نہ پیدا ہونے دی گئی۔ ایک موقع پر رومیوں کے دسویں لیجن کو یروشلم چھوڑ کر یہودیوں کے مقابلے میں دیہات کا رخ کرنا پڑا۔ کوسیبا کے سپاہیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اپنے چچا العاضر کاہن کی مدد سے برکوسیبا نے تمام بقیہ کافروں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور معبد کے پہاڑ پر ممکنہ حد تک قربانیوں کی رسم بحال کر دی۔ اس دور کا ایک عظیم ربی اور دانشور اکیوا، برکوسیبا کی بہت تعریم کرتا ہے اور اسے مسیحا قرار دے کر برکوکب یعنی ''ستارے کا بیٹا'' جیسے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ برکوسیبا خود کو اس انداز سے دیکھتا اور پیش کرتا تھا یا نہیں۔ غالباً وہ اپنی مہم میں زیادہ مصروف عمل رہا۔ لیکن اس زمانہ میں یروشلم میں جو سکے ڈھالے گئے ان پر ''شمعون شہزادہ'' اور ''العاضر کاہن'' کے لفظ درج تھے۔ اس کا مطلب تو یہی لیا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں اپنے آپ کو فرمان روا مسیحا اور کاھن مسیحا کی نظر سے دیکھتے تھے۔ زربابل کے زمانہ سے مشترکہ مسیحاؤں کا انتظار کیا جاتا رہا تھا جو یروشلم کے نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔ کچھ اور سکوں پر ''یروشلم کی آزادی کے لئے'' جیسی عبارت موجود تھی۔ لیکن یہ سبھی اقدام مایوس کن ثابت ہوئے۔ اگرچہ برکوسیبا اور اس کے سپاہی تین سال تک اپنی بغاوت جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔ لیکن بالاخر ہیڈریان نے اپنا ایک قابل ترین جرنیل، سیکٹس جولئین یہودیہ کو روانہ کیا۔ یہودی فوج محدود تھی اور

اتنی استعداد نہیں رکھتی تھی کہ شہر پناہ اور فصیلوں سے محروم یروشلم کو روم کی بے پناہ قوت کے مقابلے میں زیادہ عرصہ تک دفاع مہیا کر سکے۔ رومن فوجوں نے نہایت منظّم انداز میں گلیلی اور یہودیہ میں یہودیوں کے مراکز کو ایک ایک کر کے تسخیر کر لیا۔ ڈایوکیسئس بتاتا ہے کہ رومنوں نے 55 قلعے فتح کئے اور 985 دیہات کو روند ڈالا۔ اس خون ریزی میں 5 لاکھ اسی ہزار یہودی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ جو لوگ بھوک پیاس، وبائی بیماریوں اور آتش زنی کے نتیجہ میں ہلاک ہوئے، انکا شمار کسی کے پاس نہیں۔ یوں پوری ریاست یہودیہ تباہ برباد کر کے رکھ دی گئی۔ (30) انجام کار 135ء میں برکوسیبا یروشلم سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ اور اپنے آخری قلعہ بیت ار میں مارا گیا۔ لیکن یہودی بھی رومنوں کو بھاری جانی نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے۔ جب ہیڈریان نے سینٹ میں اپنی فتح کی رپورٹ دی تو وہ اپنا روایتی جملہ نہ کہہ سکا کہ۔۔۔ ''میں بھی ٹھیک ہوں اور میری فوج بھی سلامت ہے''۔۔۔ (31) یہودی اب بے چاری اور شکست خوردہ قوم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس دوسری جنگ میں اس نے روم سے ایک سخت جان دشمن ہونے کا خطاب جیت لیا۔

MAP (نقشہ)

ایلیا کاپی تولینا
(135-326ء)

تباہ کن شکست کے باوجود یہودی کچھ مطمئن تھے۔ جنگ کے بعد یہودیوں کا داخلہ یروشلم اور ریاست یہودیہ میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ کوہ زیہون پر مقیم مختصر سے گروہ کو بھی منتشر کر دیا گیا۔ شہر میں اور اس کے ارد گرد کوئی یہودی باقی نہ رہا۔ یہودی گلیلی میں جمع ہو گئے۔ طبریس اور سنوریس ان کے اکثریت رکھنے والے شہر بن گئے۔ انہیں مقدس شہر کی تحلیل اور ایلیا کاپی ٹولینا کی تعمیر کی اذیت ناک خبریں سننا پڑیں۔ شہر کی تعمیر کا فریضہ رومی گورنر رفس طمیئس کے سپرد ہوا۔ سب سے پہلے کھنڈرات کو صاف کیا گیا۔ اور پھر قدیم رومی رسم ادا کی گئی (32) جو نئی بستی بسانے کے موقعہ پر رومی ثقافت کا لازمہ تھی۔ یہودیوں کے نزدیک یہ سب کچھ میکاہ نبی کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ ''صیہون پہ کسی کھیت کی طرح ہل چلا دیا جائے گا'' (33) ہیڈریان کے احکامات کے مطابق یروشلم کے کھنڈروں کی جگہ ایک جدید یونانی شہر تعمیر کر دیا گیا جس میں رومی دیوتاؤں کے مندر، ایک تھیٹر، عوامی غسلخانے اور ایک تالاب موجود تھا۔ یہ تالاب دیوی نمفس سے منسوب تھا جو رومیوں کے عقائد کے مطابق بیماریوں سے شفا بخشتی تھی۔ نئے شہر میں دو فورم (اجتماع عامہ کا مقام جہاں بازار بھی لگتا ہو) بھی بنائے گئے۔ یاک فورم شہر کے مشرق میں اس دروازے کے قریب بنایا گیا جسے اب استفنس کا دروازہ کہتے ہیں۔ جب کہ دوسرا مغربی پہاڑی کے سب سے اونچے مقام پر جسے اب موریستن سکوائر کہا جاتا ہے۔ فوج کے دسویں لیجن کا کیمپ پرانی جگہ یعنی ہیرودیس کے محل کے کھنڈرات میں برقرار رکھا گیا۔ شہر کا یہ حصہ بھی ایک بلند مقام تھا۔ ہیڈریان نے نئے شہر کی دیواریں نہ بنوائیں البتہ ان کی جگہ متعدد محرابیں ایستادہ کر دی گئیں۔ ایک محراب شہر سے جنوب کی طرف 440 گز کے فاصلہ پر تھی اور یہ محراب برکوسیبا کے خلاف فتح کی یادگار تھی۔ دوسری محراب ایلیا میں داخلے کے لئے مرکزی دروازے پر بنائی گئی۔ اس مقام پر اب باب دمشق ہے۔ وہ محرابیں فورموں میں تعمیر کی گئیں۔ مشرقی فورم کی محراب کو آج کل ایکی ھومو آرک کہا جاتا ہے کیونکہ عیسائیوں کا خیال ہے کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں ''پیلاطس حضرت عیسیٰ کو لوگوں کے سامنے لایا اور سزا کا مطالبہ کرنے والے ہجوم سے پوچھا کہ تم اس پر کیا الزام عائد کرتے ہو۔'' (34) مرکزی داخلے کے دروازے کے آگے ایک چوک اور ستون تھا۔ ستون کے ساتھ شہنشاہ کا مجسمہ نصب تھا۔ ایلیا کی دو بڑی گلیاں چوک سے نکل کر یعنی شمالی حصہ سے

شروع ہو کر شہر
میں اترتی تھیں۔انہیں کارڈو کہا جاتا تھا۔ایک کارڈو موجود ویلی سٹریٹ (طارق الواد) کے ساتھ ساتھ چلتی تھی جب کہ دوسری کارڈو جسے کارڈو میکیسی مس کہا جاتا تھا، مغربی پہاڑی کی چوٹی تک جاتی تھی۔ ہیڈریان نے چھوٹی گلیوں کا بھی ایک جال بچھایا جو آج بھی کسی حد تک شہر کی کچھ گلیوں کی شکل میں موجود ہے۔

یہودیوں کے لئے اذیت ناک بات یہ تھی کہ یہواہ کے مقدس شہر میں اجنبی مذہب کی علامتیں اور نشانات ایک متکبرانہ انداز میں ابھر آئے تھے۔درحقیقت ایلیا کاپی تولینا تینرومی معبودوں، جیوپیٹر، جیونو اور منروا سے عقیدت رکھنے والوں کا شہر بنایا گیا تھا۔یہودیوں سے جنگ کے بعد ہیڈریان نے جان بوجھ کر کوہ صیہون پر جیوپیٹر کے مندر کی تعمیر کا اعلان کیا تھا لیکن کبھی کسی سیاح نے ہیرودیس کے چبوترے پر کوئی مندر دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔البتہ وہاں دو مجسموں کی موجودگی کا تذکرہ مورخین کرتے رہے ہیں۔ایک مجسمہ ہیڈریان اور دوسرا اس کے جانشین اینٹو پائس کا تھا۔غالبًا جوپیٹر کا مندر مغربی پہاڑی پر کمرشل فورم کے ساتھ بنایا گیا تھا۔البتہ گلگتا پہاڑی پر مغربی یا بالائی فورم کے ساتھ ایفرودیتی دیوی کا مندر یقینی طور پر موجود تھا۔گلگتا عیسائیوں کے لئے ایک متبرک مقام تھا۔ چنانچہ بعد میں عیسائی مورخین الزام عائد کرتے رہے ہیں کہ ہیڈریان نے جان بوجھ کر اس مقدس مقام کی بے حرمتی کی تھی۔لیکن یہ امکان بعید از قیاس ہے کہ ہیڈریان کو اس مقام کی حرمت کا علم ہو۔سینٹ جیروم (420-342ء) خیال ہے کہ یہ مندر جیوپیٹر سے منسوب تھا۔اور گلگتا پہاڑی کی چوٹی اس چبوترے کے اوپر باہر کی طرف پھیلی ہوئی تھی جس پر الفیرودتی کا مجسمہ نصب تھا۔لیکن سینٹ جیروم یہ نہیں بتاتا کہ جیوپیٹر کے مندر میں کسی دوسری اہم دیوی کا مجسمہ کیوں موجود تھا؟ جونکہ شہر کے اس حصہ میں زمین ناہموار تھی چنانچہ نشیبوں میں معاون دیواریں کھڑی کر کے عمارتیں بنائی جا سکتی تھیں۔ یہ طریقہ کار ہیرودیس نے معبد کے پہاڑ پر ذرا محدود پیمانے پر اپنایا تھا۔ ایلیا اب ایک مکمل کافر اور غیر خدا پرست شہر تھا اور اسے رومن نوآبادیاتی شہروں سے مختلف نہیں کہا جا سکتا تھا۔تیسری صدی عیسوی میں یہ شہر مشرق کی طرف پھیل گیا۔معبد کے پہاڑ کے جنوبی علاقے میں بھی کچھ عمارتیں وجود میں آ گئیں۔جب دسویں لیجن نے 283ء میں شہر چھوڑا تو رومنوں نے ایک نئی فصیل تعمیر کی۔شہر پر یہودیوں کا قبضہ اب ماضی کا قصہ بن چکا تھا۔

لیکن حیرت انگیز طور پر ان برسوں میں یہودیوں کے تعلقات رومنوں کے ساتھ بہتر ہو گئے۔شہنشاہ اینٹونینس پائیس (138-61ء) نے ہیڈریان کے یہود مخالف قوانین میں نرمی کر دی۔ یہودیت پر عمل درآمد کو جائز قرار دے دیا گیا۔برکوکبا (برکوسیبا) کے ساتھ جنگ نے رومنوں پر واضح کر دیا تھا کہ یہودیہ میں ایسے قابل فرد کو بھیجا جانا ضروری ہے جو علاقے کے بارے میں براہ راست معلومات رکھتا ہو۔(35) ربی ایسے رومن حاکموں کو پسند کرتے تھے جن کا رویہ ان کے ساتھ مصالحانہ ہوتا تھا نئے دور میں انہیں گلیلی میں ایک نئی قسم کی قیادت پیدا کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔140ء میں

ربی شمعون جوھل ایل کی اولاد میں سے تھا، اس نے بطریق ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ بطریق، اسقف اعظم سے اوپر کے درجہ کا مذہبی سردار سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بطریق کا مذہبی اور سیاسی منصب قائم کیا، اس نے آہستہ آہستہ اپنی بادشاہت قائم کر لی اور رومن سلطنت کے یہودیوں کا مسلمہ سربراہ بن گیا۔ شمعون کو چونکہ بادشاہ داؤد کی اولاد سمجھا جاتا تھا چنانچہ اسے قدیم اور جدید مذہبی اقدار کو یکجا کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس نے ایک نئی قسم کی موروثی حاکمیت تشکیل دے دی۔ بطریقی منصب نے یہودیوں کو ایک ایسا سیاسی مرکز دیا جس نے یروشلم کے نقصان کی کسی حد تک تلافی کر دی۔ یہودیوں کی سیاسی قوت شمعون کے بیٹے یہوداہ اول (20-200ء) کی قیادت میں ایک بار پھر عروج حاصل کر گئی۔ اسے ''دی پرنس'' کہا گیا۔ پرنس نے واقعی شہزادوں کی طرح شان و شوکت سے زندگی گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شہنشاہ مارکوس آریلئس اینٹونینس (17-206ء) کا ذاتی دوست تھا۔ مارکوس رومی النسل نہیں تھا چناچہ وہ غیر رومنوں سے گریزاں نہیں رہتا تھا اور بالخصوص یہودیت میں دلچسپی رکھتا تھا۔

زیادہ تر ربیوں کی طرح بطریق سمجھتے تھے کہ سیاسی صورت حال کو قبول کر لینا ہی دانشمندی ہے۔ البتہ کچھ ربی انتہا پسند تھے۔ مثلاً شمعون بن یوحائی جو رومن حکام سے بچنے کے لئے فرار ہو گیا اور 165ء میں اپنی موت تک مفرور اور زیر زمین رہا۔ لیکن ربیوں کی اکثریت اس بات کی قائل تھی کہ یروشلم کی تسخیر نو اور معبد کی تعمیر نو کے خواب دیکھنا خطرناک سوچ ہے۔ یہودیوں کو خدا کی طرف سے کسی اقدام کا انتظار کرنا چاہیے۔ ''اگر بچے تمہیں کہیں کہ جاؤ اور معبد تعمیر کرو۔۔۔۔۔ تو ان کی بات پر کان مت دھرو۔۔۔''

شمعون بن الیعاضر کی یہ تنبیہ ربیوں کے پیش نظر تھی۔ ''یہ کام مسیحا کے لئے چھوڑ دو۔''(36) چنانچہ ربیوں نے یہودیوں کی روحانی تسکین کے لئے کچھ اور مقامات بنا لئے تھے۔ فریسیوں کی داخلی بصیرت کو بروئے کار لانے کی حکمت عملی سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے ربیوں نے عام یہودیوں کی باور کرایا کہ ان کے گھر ایک اعتبار سے معبد کا نعم البدل ہیں۔ چنانچہ گھروں کو ''مقدش مائٹ''، یعنی چھوٹے معبد قرار دے دیا گیا۔ گھر میں کھانے کی میز قربان گاہ کا متبادل بن گئی اور کھانا قربانی کی رسم کی ایک نقل۔ اسی طرح سلوات یا کنشت بھی معبد ہی کی ایک قسم تھے۔ ان کی عمارت تقدیس کا عنصر رکھتی تھی۔ یروشلم میں معدوم کر دیئے جانے والے معبد کی طرح یہ بھی پاک و مقدس مقام تھا جس میں صرف مخصوص لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت تھی۔ معبد کی طرح کنشت میں بھی عورتوں کے لئے ایک الگ جگہ تھی۔ وہ کمرہ جہاں قربانی کی رسم ادا کی جاتی تھی بقیہ تمام حصوں سے زیادہ مقدس تھا۔ اس کے بعد بیماہ یعنی مقدس کلام پڑھنے کا منبر اور آخر میں مقدس ترین مقام آرک یعنی توریت کے اوراق رکھنے والا صندوق، مقدسوں کا مقدس، ہوتا تھا۔ کنشت میں داخل ہونے والا فرد مرحلہ وار تقدیس کے درجے طے کر کے یروشلم کے معبد کی طرح خانہ اقدس یعنی مقدسوں کے مقدس تک پہنچتا تھا۔ بیماہ یا منبر ہمیشہ اونچی جگہ پر ہوتا تاکہ یہ علامتی انداز میں مقدس پہاڑ بن سکے۔ جب اجتماع میں کسی رکن کو توریت پڑھنے کے لیے کہا جاتا تو

تو اسے منبر تک پہنچنے کے لیے کچھ بلندی طے کرنا پڑتی جو یروشلم میں مقدس پہاڑ پر چڑھنے کے عمل کی یاد تازہ کرنے کے لیے تھی۔ ربیوں یا بطریقوں کے زیر اثر سبت کے دن کو بھی

MAP (نقشہ)

70ء میں یروشلم کی تباہی کے بعد یہودیوں کا ہر گھر گم گشتہ معبد بن گیا۔ عید گزراں کے موقع پر مصریوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کی نجات کی یاد منانے کے لئے گھروں کی ضیافت کا اہتمام شروع کر دیا گیا۔ گھر کا سربراہ سفید لبادے میں کاھن کی نمائندگی کرتا اور کھانے کی میز کو قربان گاہ سمجھ لیا جاتا ہے۔

ایک نئی اہمیت ملی۔ سبت کے دن آرام کرنا آنے والی دنیا کے لیے ایک روایت بن گیا۔ ہفتہ میں ایک دن یہودی کائنات کی ایک نئی جہت میں داخل ہو جاتے۔ سبت ایک ایسا دنیاوی معبد بن گیا جس میں یہودی اپنے خدا سے وقف کئے گئے وقت میں مل سکتے تھے اور یوں انہیں کسی مخصوص مقدس مقام کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اب یروشلم چونکہ یہودیوں کی دسترس سے باہر اور معبد معدوم ہو چکا تھا۔ چنانچہ ربیوں نے خدا کی موجودگی کے تصور کو نئی تفہیم دی۔ آخر اس بات میں کیا دانش ہے کہ خدا انسانوں کے بنائے ہوئے کسی معبد میں رہتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی اور جگہ موجود نہیں ہوتا تھا؟ چنانچہ یہ بات عام یہودیوں کی سمجھ میں آنے لگی کہ خدا کو کسی ایک جگہ پابند سمجھنا خدا کی توہین ہے۔ ربی لوگوں کے سامنے یروشلم کے معبد کے خانہ اقدس یا دیور کا موازنہ سمندر سے کرتے۔
وہ کہتے کہ دیور میں خدا کی موجودگی اسی طرح ہے جیسے سمندر کسی غار کو بھر دے لیکن اس کے مجموعی پانی میں کوئی فرق نہ پڑے۔ یہی صورت خدا کی موجودگی کی ہے۔ وہ دلیل دیتے کہ خدا دنیا کا گھر ہے نہ کہ دنیا خدا کا گھر۔ (37) خدا کی وسعت زمین میں کیسے سما سکتی ہے؟ لیکن اس کے برعکس خدا میں ساری کائنات سما سکتی ہے۔ کچھ ربی اس بات کو ذرا مختلف انداز میں کرتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ "شکینہ" کو معبد تباہ ہونے پر یروشلم سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ بابل میں جلاوطنی کے دوران انہیں یقین دلا دیا گیا تھا کہ یہواہ یروشلم کو چھوڑ کر ان کے پاس آ چکا ہے۔ (38) اب ربیوں کا اصرار تھا کہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں "شکینہ" نے کبھی بھی بنی اسرائیل کا ساتھ نہیں چھوڑا اور وہ جہاں جہاں گئے یہ ان کے ساتھ رہی

ہے۔ مصر میں، بیابان نوردی میں، کنعان میں، بابل میں اور پھر واپسی پر یروشلم میں (539ق م) وہ بنی اسرائیل کے ساتھ رہی ہے۔(39) اب شہر بدر ہونے پر بھی وہ ان کے ساتھ ہے۔ جب یہودی اکٹھے ہو کر توریت پڑھتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک کنشت سے دوسرے کشت میں فوراً پہنچ جاتی ہے جب وہاں توریت پڑھی جاتی ہے۔(40) یہودیوں کو یقین دلا دیا گیا کہ خدا کی موجودگی سب جگہ ہے چنانچہ ساری دنیا یہودیوں کے لیے معبد بنا دی گئی ہے۔ ماضی میں کوہ صیہون پہ معبد میں خدا کی موجودگی ساری دنیا کے لیے زرخیزی اور امن کا ایک ذریعہ تھی۔ اب یہ کام یہودیوں کے ذریعے سرانجام دیا جاتا ہے۔ ربی دلیل پیش کرتے کہ کیا یہ ہر جگہ خدا کی موجودگی کا ثبوت نہیں ہے کہ بارش ہوتی ہے اور سورج چمکتا ہے۔(41) لیکن یہ سب کچھ یہودی برادری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ البتہ اس کی شرط یہ ہے کہ یہودی برادری متحد رہے اور انسانی ہمدردی کے کام کرتی رہے۔ خدا کی عبادت اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوتی جب تک دس آدمی مل کر ''منیان'' کی صورت اختیار نہ کرلیں۔ اگر یہودی پوری عقیدت کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ، ایک آواز ہو کر اور یکسو ہو کر مناجات پڑھیں گے تو شکینہ انکے ساتھ ہوگی۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو یہ آسمانوں میں چلی جائے گی اور فرشتوں کی ہم آہنگ تمجید سنتی رہے گی۔(42)

جس طرح بابل کے جلاوطنوں نے مقدس سرزمین سے دور رہ کر ''ایک مقدس جغرافیہ'' تشکیل دے لیا تھا اور اپنی نفسیاتی بقا کی صورت پیدا کرلی تھی۔ اسی طرح اب ربی شہر کے ناپاک ہونے اور معبد کے مسمار ہو جانے کے بعد بھی یروشلم کی تقدیس کے گیت گایا کرتے تھے۔ دنیا کے نقشہ میں اب بھی وہ صیہون اور دیور کو مرکزی مقام پہ رکھتے تھے۔

> ''۔۔۔ تقدیس کے دس درجے ہیں۔ اسرائیل کی سرزمین بقیہ علاقوں سے زیادہ مقدس ہے۔ اسرائیل کی سرزمین کے فصیل دار شہر بقیہ سرزمین سے زیادہ مقدس ہیں۔ یروشلم کی دیوروں کے اندر پائی جانے والی زمین ان سے زیادہ مقدس ہے۔ معبد والا پہاڑ یروشلم سے زیادہ مقدس ہے۔ معبد کا پشتہ، پہاڑ سے زیادہ تقدیس رکھتا ہے۔ معبد میں عورتوں کا صحن پشتے سے زیادہ مقدس ہے۔ اسرائیلیوں کا صحن اس سے زیادہ مقدس، کاہنوں کا صحن اس سے زیادہ مقدس، قربان گاہ کی جگہ اس سے زیادہ مقدس، ہیکل اس سے زیادہ مقدس اور دیور اس سے بھی زیادہ مقدس ہے کیونکہ اس میں کاہن اعظم کے سوا کوئی داخل نہیں ہوسکتا اور وہ بھی یوم کفارہ کو ایسا کرنے کا مجاز ہے۔۔۔۔''(43)

ربی آج بھی یروشلم کی تقدیس وحرمت کی بات کرتے ہیں حالانکہ اب وہاں معبد موجود نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یروشلم زمین پر خدا کی موجودگی کی علامت ہے۔خدا کی موجودگی جواز لی وابدی ہے اور آج بھی تصور میں لائی جاسکتی ہے۔مقدس جغرافیہ میں تقدیس کا ہر درجہ پچھلے درجے سے زیادہ مقدس تھا اور عبادت گزار درجہ بدرجہ روحانی رفعت حاصل کرتا تھا۔ان درجوں میں داخل ہونے والے لوگوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی جاتی تھی۔سابقہ جلاوطنی میں یہ ہوا تھا کہ روحانی جغرافیہ ٹھوس صورت نہیں رکھتا تھا بلکہ ایک تصوراتی چیز اور اور کیفیت تھی۔اب ربی کہتے تھے کہ نجات کے تمام واقعات کو صیہون سے تعلق رکھتے ہیں۔ابتدائی پانیوں کی حد بندی کو صیہون پر تخلیق کے دور کردی گئی تھی۔صیہون کی خاک سے آدم کو پیدا کردیا گیا۔قائن اور ہابیل وہاں اپنی قربانی پیش کر چکے ہیں۔سیلاب اعظم کے بعد نوح بھی وہاں قربانی پیش کر چکے ہیں۔ابراہیم کے ختنے کا مقام بھی صیہون ہے۔اسحاق کی بندش اور ملک صدق سے ملاقات بھی ابراہیم نے یہیں کی۔اب آخر کار مسیحا بھی صیہون سے نمودار ہوگا اور نئے دور کے آغاز کے ساتھ دنیا کو نجات دلائے گا۔(44) ربی تاریخی حقائق کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہیں اس بات نے کبھی پریشان نہیں کیا تھا کہ حضرت نوح کی کشتی کو وہ صیہون پہ نہیں کوہ ارارات پہ آکر رکی تھی۔اسی طرح انہوں نے اس نئی تحقیق کو بھی نظر انداز کردیا کہ حضرت ابراہیم سے ملک صدق بادشاہ کی ملاقات یروشلم میں نہیں عین راجل کے مقام پر ہوئی تھی۔یروشلم انکے عقائد کے مطابق دنیا میں خدا کی نجات بخش موجودگی کی علامت تھا۔ اسی بنیاد پر ان کا اصرار تھا کہ تمام تر نجات بخش واقعات وہیں رونما ہوئے تھے اب جبکہ یروشلم ان کے لیے ممنوعہ علاقہ تھا، یہ ان کی روحانی فرعت کا پہلے سے زیادہ موثر علامتی ذریعہ بن گیا۔اہلیا کی صورت حال جیسی بھی تھی ان کے خیال میں عارضی اور مصنوعی تھی۔ معبد اور مقدس شہر ان کے لئے ایک دائمی حقیقت تھا۔یروشلم سے دوری اور معبد سے محرومی کے دنوں میں بھی یہودی مسلسل کئی صدیوں تک تقدیس کے دس درجوں کے تصور میں محو رہے۔یہ ہمیشہ ان کے لیے ایک ایسا ماڈل تھا جو بنی نوع انسان سے خدا کے رابطے کے تصور کو ممکن بناتا تھا اور خود ان کی داخلی دنیا کا ایک نقشہ تھا۔

تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں کچھ یہودی یروشلم میں آمدورفت کو ممکن بنا رہے تھے۔الہامی کتابوں پر ابھی تک پابندی برقرار تھی۔لیکن صلح جو شہنشاہ مارکوس آریلئنس اینٹونینس کے دور میں رومی حکام نے پابندیوں پر سختی سے عملدرآمد نہ کیا۔ابتدا میں ادنیٰ درجے کے یہودیوں نے رومی پابندیوں کی خلاف ورزی شروع کی۔کوم ترہ کے ایک گدھا سوار شمعون نے ربیوں کو بتایا کہ اپنے کام کے دوران اسے کئی مرتبہ معبد کے پہاڑ پر سے گزرنا پڑا تھا۔لیکن اس نے کھنڈرات پر نظر پڑتے ہی سوگ کی رسم کے مطابق اپنے کپڑے نہیں پھاڑے۔(46) پھر ربی میصر کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے پانچ یا چھ شاگردوں کے ساتھ ایلیا میں رہائش رکھ لے۔یہ الگ بات ہے کہ ربی میصر کی مختصر سی جماعت بھی صرف چند سال تک وہاں اپنا وجود برقرار رکھ سکی۔بطریق یہوداہ اول کی 220ء میں موت کے بعد یروشلم میں کوئی یہودی مستقل طور پر نہ رہا۔ لیکن تیسری صدی کے وسط میں انہیں اجازت مل گئی کہ وہ کوہ زیتون پر جا کر معبد سے دور رہتے ہوئے سوگ مناسکیں۔بعد

میں انہیں کوہ صیہون پر جانے کی اجازت بھی مل گئی لیکن تاریخ کے اوراق یہ نہیں بتاتے کہ ٹھیک کس زمانے میں انہیں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی۔ وہ یہودی مہینے ایو کے نویں دن معبد کی تباہی کی برسی کے موقع پر کھنڈرات میں جاتے اور روایتی سوت مناتے۔ قاہرہ میں ملنے والی ایک قدیم دستاویز کے مطابق سوگ کی رسم کے آغاز میں زائرین کوہ زیتون پر ننگے پاؤں کھڑے ہو جاتے اور حسرت و یاس کے ساتھ صیہون کے کھنڈرات پر نظریں جما دیتے۔ پھر اپنے کپڑے پھاڑ دیتے اور نوحہ کناں ہوتے۔ ''۔۔۔ یہ حرم، یہ مامن، یہ مقدس مقام مسمار کر دیا گیا۔۔۔'' پھر زائرین ایلیا میں داخل ہوتے، معبد کے چبوترے پر چڑھتے جو مسلسل موجود تھا۔ وہاں بیٹھ کر معبد، بنی اسرائیل اور بادشاہ داؤد کے خاندان کے لیے گریہ زاری کرتے۔ ظاہر ہے سوگ کی یہ المیہ رسوم ماضی کی پر مسرت زیارت کی رسوم سے قطعی مختلف تھیں۔ تب یہودی یہواہ کی موجودگی کے تصور سے سرشار شاداں و فرحاں قربانیاں پیش کرتے تھے۔ اب ان کے سامنے نہ تو معبد کا روح پرور منظر تھا اور نہ یہواہ کی شیکنہ۔۔۔ ان کے اردگرد صیہون ایک ویرانی کا منظر پیش کرتا تھا۔ ان کی روحیں بھی ویرانی اور کھوکھلے پن سے سسکتی تھیں۔ لیکن سوگ کی رسوم نے انہیں دل شکستگی سے نکل کر صورتحال کو قبول کرنے کا حوصلہ دیا۔ رسوم کا اختتام اظہار تشکر کی عبادت کے ساتھ ہوتا۔ زائرین شہر کے دروازوں کے گرد اکٹھے ہو جاتے پورے شہر کے گرد چکر لگاتے اور اس کی برجیاں گنتے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح سرانجام دیا جاتا جس طرح ان کے آباؤ اجداد پرانے شہر اور معبد کی موجودگی میں کرتے تھے۔(47) انہیں یہ حقیقت بھی پریشان نہ کرتی کہ شہر کے دروازے رومنوں نے بنائے ہیں۔ دراصل یہ ناامیدی سے امید کی طرف بڑھنے کا عمل کا علامتی انداز تھا۔ شہر کے گرد حصار بنانے اور پھر چکر لگانے کا مطلب یہ تھا کہ شہر اب بھی ان کا ہے۔ زائرین مسیحا کی آمد اور حتمی نجات کا انتظار کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں اور مناجات میں توقعات کا یہ جملہ شامل ہوتا تھا ''۔۔۔ اگلے برس یروشلم میں۔۔۔''

برکوسیبا کی جنگ کے بعد عیسائیوں کو بھی ایلیا سے نکال دیا گیا تھا۔ اگرچہ ان کے عقائد و نظریات مختلف تھے لیکن وہ بھی مختون یہودیوں کی طرح زیر عتاب ٹھہرے۔ لیکن ہیڈریان، نے جو شامی اور یونانی آباد کار شہر میں منتقل کیے ان میں سے کچھ عیسائی تھے۔ کیونکہ ایلیا میں ایک کلیسیا کا ذکر سننے میں آتا ہے۔(48) ان غیر یہودی لوگوں نے کوہ زیہون پر ''بالا خانہ'' اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ دراصل یہ مقام شہر ایلیا سے باہر تھا چنانچہ رومنوں نے اسے نظرانداز کر دیا۔ یہ ایک نجی مکان تھا۔ اسے ابھی مذہبی نوعیت نہیں دی گئی تھی کیونکہ رومی سلطنت میں عیسائیت ابھی تک سرکاری طور پر تسلیم شدہ مزہب نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے پیروکاروں کو اپنی سرگرمیوں کی کھلے عام اجازت نہیں تھی۔ رومن حکام عیسائیوں کو تعذیب و تعزیر کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ عیسائیوں کو اپنی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن وہ بالا خانہ کو مادر کلیسیا کہنا پسند کرتے تھے۔ دراصل یہیں سے عیسائیت کی ابتدا ہوئی تھی۔ عیسائیوں کے قبضہ میں ایک تخت بھی تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ تخت جیمز زادک کا ہے۔ وہ جیمز زادک کو ہی یروشلم کا پہلا ''بشپ'' قرار دیتے تھے۔ ایلیا میں عیسائیوں کا کوئی اور مقدس مقام نہیں تھا۔

وہ شہر جو حضرت عیسیٰ کی موجودگی میں تھا وہ ہیڈریان کے ایلیا نے نگل لیا تھا۔ گلگتا، ایفرودیتی کے مندر کے نیچے دفن ہو چکا تھا چنانچہ عیسائی وہاں جا کر عبادت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن یوزیبئس ہمیں بتاتا ہے کہ اس مقام کی نشاندہی سیاحوں کو کر دی جاتی تھی۔ (49) ساردیس کے بشپ میلتیو کو 160ء میں اس کی آمد کے موقعہ گلگتا کا مقام دکھایا گیا تھا۔ اس نے واپس وطن پہنچنے پر عیسائی پیروکاروں کو بتایا تھا کہ ''گلگتا اب شہر کے وسط میں آ چکا ہے۔ (50) حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں یہ مقام فصیل شہر سے باہر تھا لیکن اب یہ پہاڑی ٹیلا ایلیا کے بڑے فورم کے پہلو میں دفن ہو چکا تھا۔

عیسائیوں کی زیادہ تعداد زائرین کی حیثیت سے فلسطین میں نہیں آتی تھی۔ یوزیبئس کا کہنا ہے کہ ''تمام دنیا سے ہجوم یروشلم میں آتے تھے۔'' (51) لیکن وہ صرف چار زائرین کو نام کا ذکر کر سکا ہے۔ ان میں سے ایک ملتیو تھا جسے ایلیا شہر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ''یروشلم کے اوپر بن جانے کی وجہ سے یہ بے وقعت ہے۔'' (52) ملتیو کی فلسطین میں آمد عقیدت کے لیے نہیں معلومات کے لیے تھی۔ اس معلوماتی دورے کے ذریعے وہ ملک کی جغرافیائی صورتحال سے آگاہ ہو کر اپنے بائبل کے مطالعے میں وسعت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ عیسائیوں کو بنیادی طور پر آسمانی یروشلم میں دلچسپی تھی جس کا ذکر یوحنا کی الہامی کتاب میں موجود ہے۔ اس کتاب کا چرچا دوسری صدی عیسوی میں کسی اور عیسائی صحیفے کے مقابلے میں بہت زیادہ رہا ہے۔ انہیں ایک نئے یروشلم کا انتظار تھا جو قیامت سے پہلے آسمان سے اترے گا اور زمین پہ شہر کی صورت اختیار کر لے گا۔ (53) چنانچہ کسی عیسائی کو ایلیا میں کوئی رغبت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یوزیبئس کی تحریریں معذرت خواہانہ تھیں۔ وہ عیسائیوں کو قانونی حیثیت دلوانا چاہتا تھا۔ غالباً اسی لیے وہ مسیحی زائرین کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔ اس طرح وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ عیسائیت کو یعنی اس کے مذہب کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہے۔ دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے دوران یروشلم کو عیسائی زائرین کے کسی بڑے روحانی مرکز کی حیثیت حاصل ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی یوحنا اور متی کی انجیلوں کے مطابق اسے ایک مجرم شہر سمجھتے تھے جس نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مسترد کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ مستقبل میں لوگ یروشلم جیسے کسی مقدس مقام پر اکٹھے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی (حضرت عیسیٰؑ) عبادت خلوص نیت کے ساتھ کریں گے۔ معبدوں اور مقدس پہاڑوں سے عقیدت رکھنا کافروں اور یہودیوں کی خصوصیت تھی اور عیسائی ان دونوں سے لاتعلق ہونے کے خواہش مند تھے۔

یوں یروشلم کو عیسائی نقشے میں کوئی اہم حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ایلیا کے بشپ کی جگہ قیصریہ کا بشپ فلسطین کا مذہبی پیشوا تھا۔ جب ممتاز عیسائی عالم اوریجن 234ء میں فلسطین میں مقیم ہوا تو اس نے اپنی درسگاہ اور کتب خانہ قیصریہ میں قائم کرنا پسند کیا۔ جب اس نے ملک بھر کے دورے کیے تو وہ بھی ملتیو کو طرح بائبل میں مذکور جغرافیائی صورتحال سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً ان جغرافیائی مقامات کو دیکھ کر کسی روحانی کیفیت کی تحصیل کا متمنی نہیں تھا۔ لیکن یہ مقامات بہرحال اس کے لیے محترم تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ صرف کافر لوگ ہی کسی معبد میں خدا کی تلاش کر سکتے ہیں اور صرف وہی سوچ سکتے ہیں کہ خدا

کسی ایک مخصوص مقام میں رہائش رکھتا ہے۔(54) اس کی دلچسپی صرف اس بات میں تھی کہ انجیل میں مذکور مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مثلاً بیت لحم کو دیکھے جہاں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے تھے۔ چرنی کو دیکھے (جو یقیناً محفوظ کر لی گئی تھی) اور ثابت کرے کہ جو کچھ انجیل میں ہے وہ درست ہے۔ لیکن اوریجن ایک فلاطونی طالب علم تھا۔ اس کے خیال میں عیسائیوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود کو مادی دنیا سے آزاد کرلیں اور ایک مکمل روحانی خدا کے طالب ہو جائیں۔ انہیں ارضی مقامات سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ۔۔۔ ''زمینی شہر کی بجائے آسمانی شہر کی جستجو کرنا چاہیے۔''(55)

اگرچہ اب قدیم یروشلم کا مذہب وسیع طور پر موجود نہیں تھا اور لوگوں میں مقدس مقامات کا تصور دھندلا ہو رہا تھا لیکن ایلیا کے مقامی عیسائی شہر کے باہر حضرت عیسیٰؑ سے منسوب مقامات کی زیارت کرنا پسند کرتے تھے۔ یوزیبئس ہمیں بتاتا ہے کہ کوہ زیتون کی چوٹی پر جانا عیسائیوں کا معمول تھا کیونکہ اسی مقام سے حضرت عیسیٰؑ کو آسمانوں پہ اٹھا لیا گیا تھا۔ وادی قدرون میں گتسمنی کے باغ میں بھی لوگ جاتے۔ یہاں گرفتاری سے پہلے حضرت عیسیٰؑ نے بڑی دلسوزی کے ساتھ دعا کی تھی۔ اسی طرح دریائے اردن کے اس مقام کی بھی زیارت کی جاتی تھی۔ جہاں یوحنا نے حضرت عیسیٰؑ کو بپتسمہ دیا تھا۔ (57) مصنوعی غاروں کو خاص طور پر رومی و یونانی دنیا میں مقدس مقامات سمجھا جاتا تھا۔ ایلیا کے عیسائی بھی دو مقامات کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔ ایک مقام بیت لحم میں تھا جسے حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش کہتے ہیں اور دوسرا کوہ زیتون جہاں حضرت عیسیٰؑ دوبارہ زندہ ہو جانے کے بعد یوحنا حواری پر ظاہر ہوئے تھے۔(57) عیسائی ان مقامات کی زیارت کو اس لیے نہیں جاتے تھے کہ وہ ''آدم زاد یسوع'' کو یاد کریں۔ انہیں حضرت عیسیٰؑ کی زمینی زندگی میں بہت کم دلچسپی تھی۔ یہ مقامات اس لیے اہم تھے کہ انہوں نے خداوند کو دیکھا تھا۔ دونوں مقامات پر مجسم کلام دنیا پہ ظاہر ہوا تھا۔

کوہ زیتون کی ایک اور بھی اہمیت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی مقام پر حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کو یروسلم پہ آنے والی تباہی اور آخری دنوں کے بارے میں بتایا تھا۔(58) کوہ زیتون پر یہودیوں کو معبد کی تباہی کو سوگ مناتے ہوئے دیکھ کر عیسائی طنزیہ انداز میں مسکرایا کرتے تھے۔ اوریجن یہودیوں کی ان رسومات کو افسوسناک اور گمراہ کن قرار دیتا ہے۔ وہ یہودیوں کی حالت زار کو اناجیل کی صداقت کا ایک ٹھوس ثبوت سمجھتا ہے۔ پیشین گوئیاں اور ندائے غیبی قدیم زمانے میں بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ یروشلم کی تباہی کے بارے میں حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئی کا حرف بحرف درست ثابت ہونا اوریجن کے کفار مخالفین کا منہ بند کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا تو ان کی تباہی کا دور شروع ہو گیا۔ ان کی تمام ادارے جن پر انہیں انتہائی فخر و ناز تھا ملیا میٹ ہو گئے ان میں معبد، قربان گاہ، کاہنوں کی شان و شوکت، تقریبات، اقتدار و اختیار کچھ بھی نہ رہا۔(59) یہ صورتحال حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں کے لئے تسکین بخش تھی۔ ایلیا، کے عیسائیوں نے کوہ زیتون پر خود بھی ایک جوابی تقریب منعقد کرنا شروع کر دی۔ یوزیبئس کہتا ہے کہ وہ چوٹی پہ جاتے اور شہر کی تسخیر اور تباہی کی باتیں کرتے۔(60) پہاڑ سے وہ اجڑے ہوئے معبد کے چبوترے کو دیکھتے

جس پر فاتح شہنشاہوں کے مجسمے ایستادہ تھے۔ یہ منظر انہیں یہودیت کی ناکامی اور اپنے مذہب کی کامیابی کی نوید دیتا۔ ان کا مذہب ابھی فلسطین میں زیادہ مقبول نہیں ہوا تھا لیکن بقیہ سلطنت میں زبردست کامیابی حاصل کر رہا تھا۔ جب وہ رومن ایلیا کے بارے میں سوچتے کہ یہ اس مجرم شہر کو نابود کر کے تعمیر کیا گیا ہے جس نے یسوع کو تسلیم نہیں کیا تھا تو انہیں اپنے مزہب کی حقانیت کا ایک زندہ ثبوت اپنے سامنے پھیلا ہوا دکھائی دیتا۔ لیکن ابھی تک ایک بات پریشان کن تھی۔ ربیوں کی طرح حضرت عیسیٰ اور سینٹ پال رحم و مروت اور انسانوں سے محبت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ تو اپنی تعلیمات میں یہاں تک کہہ گئے تھے کہ ان کے ماننے والوں کو اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرنا چاہیئے۔ لیکن تیسیری صدی کے عیسائی اس وقت غیر ضروری غرور و نخوت میں مبتلا ہو گئے جب انہیں شہر کے پرانے باسیوں اور اپنے لیش رو یہودیوں کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگا۔ توحید پرست ہمیشہ اس حقیقت کو تسلیم

کرنے پر مجبور ہوئے تھے کہ یروشلم کے پرانے قابضین نے اسے ایک مقدس شہر کا احترام دیا تھا اور ان کے اپنے عہد کا استحکام بھی اسی طرز عمل پر منحصر ہوگا۔ ایلیا کے عیسائیوں نے یہاں اچھے آغاز پہ توجہ نہ دی۔ انہیں اس بات کی پرواہی نہیں تھی کہ جس شہر میں یسوع مصلوب ہوا اور پھر زندہ ہو گیا وہاں انہیں اپنے اعلی ترنسب العین کے سات مثالی زندگی گزارنا چاہیئے۔

یوزیبئس 313ء میں قیصریہ کا بشپ بنا اس کے ساتھ رومن سلطنت میں عیسائیوں کے پرشکوہ دور کا آغاز ہو گیا۔ اوریجن کی طرح یوزیبئس بھی فلاطونی تھا ور معبدوں اور مقدس مقامات سے کوئی عقیدت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی نظر میں عیسائیت اور ابتدائی قسم کے ناقص عقائد کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ فلسطین میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ کسی بھی لحاظ سے (زمین کا) مرکز نہیں ہے۔ (61) ایلیا صرف اور صرف مجرم شہر ہے۔ یہ کسی احترام کے لائق نہیں۔ یہ عیسائیوں کے لئے صرف اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ یہودیت کی موت کی علامت ہے۔ ''اس زمانے میں مح چند افراد ہی کو شہر کا اصل نام یاد تھا۔ یوزیبئس خود اسے ایلیا کے نام سے پکارتا ہے۔ زیادہ تر عیسائیوں کی طرح وہ بھی صرف ایک ہی ''یروشلم'' کو جانتا تھا جو آسمانوں میں تھا، اس دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا تھا۔ 312ء میں قسطنطین نے اپنے شاہی حریف میک زیبئس کو میلویان کے پل پر شکست دے دی اور اپنی فتح کو عیسائیوں کے خدا سے منسوب کیا۔ 313ء یوزیبئس کے منصب برداری کے سال میں قسطنطین نے عیسائیت کو رومن سلطنت کے سرکاری مذاہب میں سے ازیک قرار دے دیا۔ سینٹ پال کی کوششوں سے عیسائیت ایشیائے کوچک، یونان اور روم تک پہنچی تھی۔ اس نئے مذہب کو ماننے والے زیادہ تر غریب طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ رومی شہنشاہوں نے عیسائیوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں لیکن عیسائیوں نے رومی شہنشاہ کو خدا ماننے اور روم کے دیوتاؤں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ اذیتوں کا نشانہ بنتے ہوئے، ہلاکت کے کنارے پر پہنچی ہوئی عیسائیت کسی بیساکھی کے بغیر، سیاسی طاقت سے محروم اور کسی مقدس شہر کے بغیر عروج کی طرف گامزن ہو گئی۔ اور پھر اس

نے انجام کار ایلیا کو بھی مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

=================

حوالہ جات

1. Benjamin Mazar, The mountain of The Lord (New York,1975) p.113.
2. Antoine Duprez, Jesus et les Dieux Guerisseur a La Propose De Jean V (Paris- 1970).
3. F.E. Peters, Jerusalem: The Holy City in The Eyes of Chroniclers, visitors, Pilgrims and prophets From the Days of Abraham to The beginnings of Modern Times (Princeton 1985). p. 125.

۔4 یوزیبئس (EUsebius, ECELESIASTICAL HISTORY) 4:5

5. ORIGEN, SERMON in honour of Mathew 12.B

۔6 باروخ۔10

7. Yalkut. song of songs...1:2
8. AVOT de rabbi Nathan 6.
9. SIFRE on Leviticus 19:8.
10. MEKHILTA on Exodus 21:73
11. SANHEDRIN 4:5
12. BABA METZIA 58B

13. M. BERAKOTH 5:5

14. FOURTEENTH BENEDICTION

15. YALKOT on 1 KINGS - 8

16. PESIKTA de Rabbi Kazhana 103A

17۔ 2۔ باروخ 4 (BARUCH)

18۔ 4۔ خنوخ 7:26 (ENOCH)

19۔ 4۔ خنوخ 8: 2-3, 8:5

20۔ کتاب وحی 2:10 (Revelation)

21۔ کتاب وحی 22:1-2

22۔ لوقا کی انجیل 24: 52-53

23۔ رسولوں کے اعمال 1:8

24۔ متی کی انجیل 24: 1-3

25۔ یوحنا کی انجیل 1:1-5, 14

26۔ یوحنا 7:38-39

یوحنا نے اپنی انجیل میں یسوع مسیح کی طرف سے جملہ لکھا ہے ''میں ہوں۔۔۔'' جو عید (سکوتھ) کے موقعہ پر کہا گیا۔ سکوتھ کے موقع پر یہ مذہبی رسم میں عبادت کے دوران استعمال کیا جاتا تھا۔ یسوع نے یہ اپنے لیے کہا اور یہ اسطلاح شیکنہ کے معنوں میں استعمال کی۔

27۔ یوحنا 2:19-21

28۔ یوحنا 4: 20-24

29۔ یوحنا 8:57۔۔۔۔ اسے نمبر 26 کے تسلسل میں دیکھیں جب یسوع معبد سے جا رہا تھا تو یہ شیکنہ کے رخصت ہونے کے مترادف تھا۔

DAVIES, Gospoal and The Land-12.

30. DIO CASSIUS, History 69:12.

31. IBID --

32. VERGIL, Aeneid 5: 785-86

33۔ میکاہ (عہد نازمہ قدیم) 3:12

34۔ جان ولکن سن کا خیال ہے کہ یہ محراب ہیرودیس کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔

K.J. ASALI, Jerusalem in history-- p. 82

35. J. BERAKOTH 1:4A, Line27: B. KEUBOTH 17.A

36. T. AVODAH ZARAH 1:19

37. GENESIS RABBAH A:18

38. T. B. MEGILLAH 29A

39. MEKHILTA VISHA 14

40. T. B. BERAKOTH 6A, NUMBERS RABBAH 11:2

41. NUMBER RABBAH. 1:3

42. SONG OF SONGS. RABBAH 8:12

43. M. KELIM 1:6-9

44. PIR QE RABBI ELEZER 31.

45. J. BERAKOTH 9:3, 13D.

46. MICHAEL AVI-YONAM, the Jews of Placestine: A Political History from The Bar Kokhba War to the Arab conquest (Ox Ford- 1976), pp. 80-81.

47. ROBERT L. WILKEN, The Land Called Holy: Palestine in Christain History and thoughts (New Haven and London. 1992) p. 106.

48. EUSEBIUS, ECCLESIASTICAL HISTORY 4:

49. EUSEBIUS, ONOMASTIKON 14:19-25

50. MELITO, PASCHAL SERMON

51. EUSEBIUS, The Proof of the Gospel 6: 18-23

52. MELITO, PASCHAL SERMON

53. IRENAEUS, HERESIES 5: 35: 2: JUSTIN,
Dialogue with Trypho The Jews 80-5
ORIGEN, First Principles,4:2:1

54. ORIGEN, Against Celsus, 3:34, 7: 35

55. ORIGEN, First Principles 4:2:1

56. EUSEBIUS, Proof of the Gospel 1:1:2, 3:2:47, 7:2:1

57. ACTS Of John 97.

58. muti 24:3

59. ORIGEN, First Principles 4:1:3

60. EUSEBIUS, Proof of the Gospels, 6:18 :23

61. IBID 3: 2: 10

==================